
ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
اشاعت کے 48 سال
OCTOBER
2020
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
تحریم امان اللہ



انٹرویو

سلسلے وار ناول

سروے

مکمل ناول

ناولٹ





افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......1250روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......8.000روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......10.000روپے

افسانے

خاصے کی چیز

دوشیزہ میگزین

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے ابنِ حسن پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
Phone : 021-35893122 - 35893123
Email : pearlpublications@hotmail.com

پگلی......

مجھے ایک پگلی ملی میں اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئی بڑے پیار اور شفقت سے اس سے باتیں کیں اس کے لیے کھانا نکلوایا اور ایک خوبصورت جوڑا تحفے میں دیا تو وہ شکریہ کے ساتھ لوٹاتے ہوئے بولی۔ 'تم زرق برق لباس' مرغّن غذا' قیمتی یوڈی کولون اور ہیرے جواہرات کی زندگی کو کامیابی سمجھتی ہو؟ تم یہ سب پا کر خود کو سکھی محسوس کرتی ہو؟ سارا سارا دن ہاتھوں میں یہ فون لے کر اِس کا میسیج اُس کو اور اُس کا میسیج اِس کو بھیجتی رہتی ہو؟ تم سمجھتی ہو کہ تم لوگوں کی آنکھوں تارا ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کتنے سچے دوست بنائے جن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ سکو؟ ایسا کیا کیا کہ لوگ تمہارے جانے کے بعد تمہیں اچھے الفاظ میں یاد کریں۔

یاد رکھو ترقی روکھی سوکھی کھانے والی قومیں کرتی ہیں۔

معاشرہ بھی وہاں محفوظ ہوتا ہے جہاں ہر شخص مذہب اور اقدار کی قائم کردہ حدود میں رہتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں جھانکنے والے صرف وقت کا زیاں کرتے ہیں' تم بھی یہی کر رہی ہو......

اور اب میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ پگلی وہ تھی یا میں...... آپ بھی سوچیے۔

منزہ سہام مرزا


ADV. DANIYAL SHAMSI
CIVIL LAW
GUARDIANSHIP
GIFTS
DEEDS
FAMILY LAW
CONTRACTS
CRIMINAL LAW
FREE CONSULTATION
CALL NOW
0340-4895247



دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

عزیز بہنو! اکتوبر کا شمارہ آپ کی نظر' اللہ کا شکر ہے حالات اب بہتری کی طرف رواں دواں ہیں زندگی معمول پر آرہی ہے مگر اس وبا نے جو سبق دیا شاید زندگی بھر کا بھی نچوڑ وہ نہ ہوتا...... لیکن اب الحمدللہ زندگی ایک بار پھر رواں دواں ہے۔ موسم سرما کی بھی آمد آمد ہے یعنی بھاپ اڑاتی کافی اور بھینی بھینی خوشبو والی موم پھلی انجوائے کرنے کا وقت آرہا ہے۔ اللہ ہم سب کو مطمئن اور آسودہ رکھے چلیے پہلے خط کی جانب بڑھتے ہیں۔

✉: ظل ہما' لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے آپ اور آپ کے ادارے سے وابستہ تمام لوگ بخیریت اور اللہ کی امان میں ہوں گے۔ آپ کے رسالے دوشیزہ پر اکثر نظر پڑ جاتی ہے۔ آپ کی کافی اچھی اور معیاری کوشش ہے۔ امی کی طرف تھی جب اچانک ایک صفحے نے توجہ اپنی طرف کھینچ لی جس میں آپ کے ادارے میں ہونے والے مصنفات کے انعامی مقابلے کا ذکر کیا تھا۔ بس پھر کیا تھا فٹافٹ لکھنے والے کیڑے نے دماغ کے اندر کلبلانا شروع کر دیا اور فٹافٹ ہی ایک کہانی لکھ ماری (آہم) اب اللہ سے دعا اور آپ سے التجا ہے کہ فٹافٹ ہی اسے چھاپ کر فٹافٹ ہی ہمیں بھی رائٹرز کی لسٹ میں شامل کرلیں (انشاء اللہ) بہت سی دعائیں آپ اور آپ کے ادارے سے وابستہ لوگوں کے لیے۔

✍: ظل ہما! تمہارے تو سر پر ویسے ہی کامیابی کا تاج سجنا چاہیے لہٰذا لکھنا جاری رکھو۔

✉: نیرّ شفقت لکھتی ہیں۔ محترم پیاری منزہ جی' السلام علیکم! دوشیزہ اس مرتبہ قدرے جلدی مل گیا۔ ویسے تو آدھا مہینہ گزر چکا تھا مگر پھر بھی جلد یعنی 16 تاریخ کو مل گیا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ 10 تاریخ تک دوشیزہ مل جایا کرے قسم سے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں انتظار کر کر کے...... پھر بھی جب دیر سے بھی ملتا ہے تو مانو دل میں جان آجاتی ہے۔ جی ہاں دل میں کیونکہ دوشیزہ سے رشتہ دل کا رشتہ ہے۔ اداریہ زبردست تھا۔ مگر جب تک عوام اپنے حق کے لیے باہر نہیں نکلے گی' یہ نظام کبھی نہیں بدلے گا اور عوام اب ہڈحرام ہوگئی ہے۔ انٹرنیٹ کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ اپنے حق کو پہچانیں۔ انہوں نے تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ دوشیزہ کی محفل حسب معمول تھی۔ بس لکھائی ذرا باریک ہوگئی تھی یا پھر شاید میری عینک کا نمبر بڑھ گیا تھا۔ زادِ راہ نہایت خوبصورت تحریر تھی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ اس شمارے میں سب سے پہلے پارسا کتے پڑھی اور مسمرائز ہوکر رہ گئی۔ انسان کی بے بسی' بے حسی اور مجبوری پر رج کے افسوس ہوا۔ عشق کے امتحان بچکانہ سی کہانی لگی۔ ابرش اور تبریز کے

درمیان جو باتیں ہوئی تھیں۔ ان کی وضاحت کردی جاتی تو کہانی خوب صورت ہوسکتی تھی۔ ڈھول کے لیے تو ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

محبت کی تاریخ میں کب نئی ہے
کسی آبلہ پا کی صحرا نورد ی

فرق متاثر کن تحریر تھی۔ بالکل صحیح کہا نازیہ نے کہ جب تک ساس ماں نہ بنے بہو بیٹی نہیں بن سکتی۔ لیکن دل دونوں کو ہی بڑا کرنا پڑے گا تبھی رشتہ نبھ سکتا ہے۔ کاغذی بندھن اچھی تحریر تھی۔ ماں کی بات مان کر تو کوئی بھی خسارے میں نہیں رہ سکتا سوار سلان بھی فائدے میں رہا۔ ادھورے رنگ، عشق عبادت اور حویلی بس ٹھیک تحاریر تھیں۔ فراق شوہر کے پیچھے پاگل ہوتی لڑکی کی کہانی اچھی تھی مگر طوالت کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ عزت اور محبت کے بارے میں بھی ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

شگفتہ شفیق اور پروفیسر صاحب سے ملاقات نے مزہ دیا انٹرویو کے سلسلے کو اب جاری رہنا چاہیے۔ کچن اس مرتبہ غائب تھا۔ کیا ہمیں بھوکا رکھنے کا ارادہ ہے چلیں کوئی بات نہیں۔ اگلے ماہ ہماری دعوت کر دیجیے گا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ سب دوستوں کو بہت سلام اور دعائیں انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گی۔

ﮬ: نیئر! یہ تمہاری دوشیزہ سے محبت ہے جو اس قدر شدت سے انتظار کرتی ہو۔ بہت اچھا تبصرہ کیا میں ہر ماہ منتظر رہوں گی۔

✉: فرحت صدیقی، فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ، السلام علیکم! سدا خوش رہو سلامت رہو بچوں کی خوشیاں دیکھو آمین، ستمبر کا دوشیزہ ملا بہت شکریہ اداس آنکھوں والی دوشیزہ نے مزید اداس کر دیا۔ نجانے کون سی اداسی ہے دل سے جاتی ہی نہیں۔ 'بس بہت ہوگیا' کاش سمجھ میں آ جائے۔ دوشیزہ کی محفل گلابوں کی مہک کے ساتھ تھی۔ اللہ تعالیٰ غزالہ عزیز کو بہت ساری خوشیوں سے نوازے۔ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے بارے میں پڑھ کر اداسی ختم ہوگئی۔ عشق کے امتحان اور بھی ہیں، پل پل رنگ بدلتی ابرش، انجام اچھا تھا۔ ڈھول کمال کا افسانہ تھا۔ محبت کی انتہا تھی۔ فرق گھر گھر کی کہانی یہ ہو نہیں سکتا کہ محبت کے بدلے میں محبت نہ ملے۔ سوچ کو اجلا کرنا ہوتا ہے۔ بادسموم تو کی اس جادوئی کہانی کے سحر نے ہر قسط کو جکڑ رکھا ہے۔ جناب پروفیسر سحر انصاری سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ موتی کی تیسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سچی محبت کچی مٹی کی خوشبو کی طرح ہوتی ہے جس کی مہک خود اپنا آپ منوالیا کرتی ہے۔ زبردست بہت اچھا لگا۔ والدین اولاد کا کبھی برا نہیں چاہتے۔ یہ بات اولاد کو کم سمجھ آتی ہے۔ زندگی کے ادھورے رنگ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اسے مریم کو اب گلے سے لگالینا چاہیے تھا۔ اپنوں کا رنگ اتنا کچا نہیں ہوتا۔ معاف کر دینا چاہیے تھا شب یلدا کی آخری قسط مون بخاری نے کمال کر دیا بہت خوبصورت انجام تھا۔ جو صرف افسانوں میں ہی ہوتا ہے۔ حقیقت میں بہت کم ہوتا ہے جبران شاہ کی آفاقی محبت اس کے نصیب میں نہ تھی۔ معاشرے کی بے حسی پر رونا آتا ہے۔ میت گھر میں رکھی ہو اور برادری کو میت کے گھر کا کھانا ضروری چاہیے ہوتا ہے۔ کاش غریب لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے ایسا قانون ضرور ہونا چاہیے سادہ پانی کے وہ دن تک میت کے گھر کھانا پر پابندی ہونی چاہیے۔ عزت اور محبت سلمیٰ غزل کا افسانہ بھی خوب رہا۔ انسان کی پہچان بہت مشکل سے ہوتی ہے اور یہ وقت کے ساتھ آتی ہے۔ اس لیے ماں باپ کے فیصلے اولاد کے حق میں بہتر ہوتے ہیں۔ شگفتہ شفیق کی خوبصورت شاعری اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

اس طرح نہیں کرتے پڑھ کر مزہ آیا۔ واہ کیا کہتے عورت خالی جومیٹری بکس ہے عورت صرف محبت کا دوسرا نام ہے جو صرف دینا جانتی ہے لینا نہیں' انڈین برفی تو نہ بن سکی البتہ بقول زمل کے 'یہ چاکلیٹ بن گئی ہے' کیا کرتے وہ دانتوں سے جو چپک رہی تھی۔ اب اجازت دوشیزہ کے سب ساتھیوں کو سلام اور دعائیں۔

ج: فرحت آنٹی! اداسی ہی تو سب سے زیادہ مخلص ہوتی ہے ایک بار دل کا راستہ دیکھ لے پھر کہاں جاتی ہے۔ آپ کو شمارہ اچھا لگا اس کے لیے شکریہ۔

✉: سنبل' کراچی سے لکھتی ہیں۔ بہت پیاری منزہ' السلام علیکم! شکر الحمد اللہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت رب العالمین سے نیک مطلوب ہے' منزہ بڑے عرصے بعد مجھے دوشیزہ کا ٹائٹل پسند آیا ہے ان دونوں بہنوں میں ایک عجیب سا وقار اور جاذبیت ہے' اداریہ تو ہر کراچی کے مکین کی آواز تھا ماشاء اللہ ہمیں تو ایسے وزراء ملے ہیں جو شہر کا جائزہ لے کر سالگرہ پارٹی میں پہنچ جاتے ہیں' نیرنگئی سیاست دوراں ماشاء اللہ دوشیزہ کی محفل آباد ہونے لگی ہے بہت سے بچھڑے پردیسی حاضری دینے لگے ہیں اللہ پاک نظر بد سے محفوظ فرمائے آمین ثم آمین اللہ پاک ساتھ ہی ہماری مغل شہزادی کو بھی صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین ثم آمین' حضرت فاطمتہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مضمون ایمان افروز تھا اور غزالہ کے بیان کرنے کا انداز بھی لاجواب ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ سحر انصاری کا انٹرویو خاصے کی چیز تھا صائمہ روایتی انداز سے ہٹ کر انٹرویو کرتی ہیں جو کہ اچھا لگتا ہے شگفتہ شفیق کا شگفتہ شگفتہ انٹرویو بھی بہت اچھا لگا۔ سخن زار نئے شعراء کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم ہے' بچھڑنا کلائمکس پر آچکا ہے لگتا ہے اگلی قسط آخری ہے۔ عشق کے امتحان ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی اچھی لگی۔ ڈھول میں سلاست وروانی بہت تھی مجھے تحریر یوں تو اپنے اسلوب کی بناء پر اچھی لگی گو کہ مجھے نکاح کے بعد کسی سابقہ محبت کو رونا برا لگتا ہے مگر کیونکہ مینا عبدالرافع کو یہ پہلے ہی باور کروا چکی تھی تو چلیں ٹھیک ہے مگر مجھے اس افسانے میں عبدالرافع کے ساتھ شدید زیادتی لگی کہ وہ آپ کے سابقہ عشق کی حکایات بھی سن رہا ہے اختلافات کے باوجود خاموش رہتا ہے اور اسے ایسا صلہ دیا جائے وہ مذہب جو کہتا ہے کہ دو نامحرموں کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے وہاں آپ اس کے کمرے میں آجاتی ہیں آپ اس پر جائز ہیں وہ آپ پر حق رکھتا ہے اور آپ چاہتی ہیں کہ وہ اس کا استعمال نہ کرے یہ تو شدید زیادتی تھی اور دو مردوں کا ایک دوسرے کے حوالے سے تجزیہ ہونا ہی نہیں چاہیے ہر کوئی اپنی فطرت پر ہوتا ہے نازیہ بتول نے اپنی تحریر میں ایک اچھا سبق دیا ہے محبت فاتح عالم کا۔ بادسموم بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ موتی کی زوبی کچھ زیادہ ہی حساس ہورہی ہے غالباً اپنے سابقہ حالات کی وجہ سے ورنہ شہزاد نے صرف اپنی محبت کا دفاع ہی کیا ہے اور زوبی کو کسی اندھیرے میں نہیں رکھا۔ اس نے اس کے موٹاپے یا صورت کا مذاق تو نہیں اڑایا نہ ہی اس کے جذبات سے کھیلا۔ کاغذی بندھن میں روانی بہت تھی مگر اگر یہ بے وفائی تھی تو بہرحال دونوں طرف سے تھی۔ ادھورے رنگ میں اپنی من مانی کرنے والی لڑکیوں کے لیے اچھا سبق تھا۔ اب آتے ہیں شب یلدا کی طرف آپ نے کہا تھا مون کہ مجھے مایوسی نہیں ہوگی تو معذرت کے ساتھ مجھے شدید مایوسی ہوئی سب سے پہلے قرآن کہتا ہے نیک عورتوں کے لیے نیک مرد یہاں ایک بدکار عورت کے لیے دو دو نیک مرد۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ زنا کو پروموٹ نہیں کررہیں تو اور کیسے کیا جاتا ہے برائی کو پروموٹ۔ کہ کچھ بھی کرلو اور معافی مانگ لو اور آج کی نوجوان نسل تو اسی راہ پر چل رہی ہے زنا خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے اس پر ایسی تحاریر پڑھنے کو ملیں کہ چلو توبہ کرلیں گے جبکہ زنا کی توبہ نہیں سزا ہی ہے ورنہ جہنم پکی اور ہاں

پاکستان میں حدود آرڈیننس زنا کے لیے ہی ہے۔ مگر اس تحریر سے تو لگا کہ لبادہ اللہ کی کوئی بہت مقرب بندی ہے کہ اسے تھال میں رکھ کر اس کی محبت لوٹائی جا رہی ہے طلوع اسلام کے وقت ایک عورت اس عمل سے پریگنیٹ ہوگئی تھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی تو آپ نے فرمایا ولادت کے بعد آنا پھر آئی تو کہا دودھ چھڑوانے کے بعد آنا اور وہ پھر آئی تو اسے رجم کیا گیا اس کے خون کے چھینٹے حضرت عمر بن خطاب کے جسم پر پڑے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ناگواری کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عمر اس سے ناگواری کا اظہار نہ کرو اس عورت نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر دنیا کے ہر گناہ گار کو بانٹ دی جائے تو سب کی بخشش ہو جائے اور اب بھی یہ ناول کمال ہوتا اگر اس میں زنا والا پورشن نہ ہوتا۔ آگے آپ کی مرضی ہے عالی مان نے ہمیشہ کی طرح کمال لکھا۔ بشریٰ کی تحریر بھی اچھی تھی۔ فضہ کا ناول وقت کی عدم دستیابی کے باعث نہیں پڑھ سکی فضہ آپ کا تبصرہ ادھار رہا۔ زرافشاں کی تحریر نے حقیقتاً لرزا کر رکھ دیا رسوم ورواج انسان کو کیسا کیسا خوار کرتے ہیں سلمیٰ غزل کی تحریر بھی ہماری نوجوان نسل کے لیے ایک اچھا سبق ہے۔ یہ تو تھا تبصرہ اب تم سناؤ کیا حال احوال ہیں ان شاء اللہ اچھے ہوں گے کراچی ایک بار پھر گرمی کی لپیٹ میں ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین ثم آمین سنا ہے ابھی کرونا کی ایک بار پھر شدت ہوگئی ہے اللہ پاک رحم فرمائے آمین ثم آمین۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا' فی امان اللہ۔

ج: پیاری سنبل! میں اچھی ہوں اور اب جب تمہارا جواب لکھ رہی ہوں تو گرمی کی شدت کچھ کم ہو چکی ہے اور کرونا کا خوف بھی' ہمیشہ کی طرح بروقت تبصرہ ارسال کیا بلکہ اس بار تو بہت مصروفیت کے باوجود دوشیزہ پورا پڑھ کر تبصرہ کیا اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔

✉: نسیم سکینہ صدف لکھتی ہیں۔ بہت پیاری منزہ جی' سلام محبت' ڈور بیل کی آواز کے ساتھ ہی محبوب کے آنے کی خوشبو پھیل گئی جلدی سے دروازہ کھولا تو ایک نوجوان نے بڑے مہذب انداز میں سلام کیا اور دستخط کرنے کے لیے کاغذ اور پنسل ہاتھ میں پکڑائی تو اتنی دیر میں میرے بیٹے نے کولڈ ڈرنک پیش کر دی اور اس نے جزاک اللہ کہہ کر گلاس واپس کیا تو میں نے پوچھا کہ آج تک کبھی کسی نے رسالہ دیتے ہوئے سائن نہیں کروائے تو آپ نے کیوں کروائے۔ اس نے کہا کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اگر دیانتداری سے اپنا کام نہیں کریں گے تو ہماری روزی حلال نہیں ہوگی۔ اس کی بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی' اب بھی اچھے لوگ اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ السلام علیکم کہتا ہوا وہ واپسی کے لیے مڑا تو میں اپنے محبوب دوشیزہ کو ہاتھ میں پکڑے اندر آئی تو میری ساتھ والی ہمسائی بیسن والی' مسی روٹی' ساتھ میٹھی لسی کا بڑا سا گلاس لیے میری منتظر تھی۔ گرم دوپہر میں یہ سب اور دوشیزہ نے روح تک خوش کر دی۔ سوہنی سی ماڈل کے ساتھ اداریہ 'بس بہت ہوگیا' بہت اچھا فیصلہ ہے' اللہ پاک اس پر عملدرآمد کروائیں سب سے پہلے پیاری سی خولہ عرفان کو ایوارڈ کے لیے نامزد ہونے پر ڈھیروں مبارک باد...... نازیہ بتول کا فرق ہر بہو کے دل کی ترجمانی تھی۔ کاغذی بندھن صفدر علی حیدری' بڑوں کے فیصلے بڑے پائیدار ہوتے ہیں' یہ ثابت کر دکھایا۔ عشق عبادت بشریٰ علی میمن نے تو رلا دیا۔ عالی مان آفاقی کی تبدیلی اچھی کہانی تھی ابھی اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ کارکنان دوشیزہ کو جو کہ پیارے پیارے شہزادے زین اور دانیال ہیں' بہت دعائیں اور پیار اب اجازت۔

ج: نسیم! آپ کے خط میں بیسن کی روٹی اور لسی نے بہت مزہ دیا اس کے ساتھ مکھن اور ہری چٹنی

ہوتی تو کیا بات تھی۔ دانیال، زین آپ کو سلام کہتے ہیں۔

☒: سیدہ عروج فاطمہ' ملتان سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ آپی سدا خوش رہیں آمین۔ ستمبر کے دوشیزہ ڈائجسٹ کا سرورق شاندار ہے۔ خولہ عرفان کو رائٹرز ایوارڈ کی لسٹ میں شمولیت پر دلی مبارکباد۔ واہ جی دوشیزہ کی محفل میں خوب رونق لگی ہوئی ہے۔ حافظہ مون بخاری، سنبل اور خولہ عرفان کے تفصیلی تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ سلسلہ زادراہ پورے ڈائجسٹ کی جان ہے۔ نفیسہ سعید آپی کا افسانہ عشق کے امتحان اور بھی ہیں، پڑھنے کے دوران مجھے ایک لڑکی یاد آ گئی۔ کبھی وہ کہتی تھی میں نے اپنا بزنس شروع کر لیا ہے اور کبھی کہتی تھی میں بیرون ملک جا رہی ہوں۔ ایسا اکثر تب ہوتا ہے جب بچوں کو والدین کی طرف سے بے جا لاڈ پیار ملتا ہے خاص کر اکلوتے بچے اس کیفیت سے گزرتے ہیں وہ فیصلہ نہیں کر پاتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے؟ کون سی فیلڈ بہترین رہے گی؟ ہر کسی کو رہنما نہیں مل پاتا ہے لیکن اختتام میں یہ پڑھ کر اچھا لگا کہ ابرش کو تبریز کے روپ میں ہمدرد انسان مل گیا۔ افسانہ 'فرق' حقیقت سے بہت قریب ہے اسی وجہ سے پسند آیا۔ کچھ گھروں میں بیٹیوں کو بہوؤں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ بہو بیٹی کی طرح خدمت نہیں کر سکتی ہے۔ ہر وقت کے لڑائی جھگڑوں سے ماحول میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہو کو ایک موقع ضرور دیں۔ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے اور دوسروں کی بیٹیوں کا تو زیادہ خیال رکھنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے والدین سے دور رہ رہی ہوتی ہیں۔ طویل تحریروں میں تحریم امان اللہ کا ناولٹ 'ڈھول' زبردست ہے۔ تحریم کے لکھنے کے انداز میں پختگی ہے۔ ناول 'فراق' میں بیوی کی اپنے شوہر کے لیے محبت دکھائی گئی ہے۔ عورت کا دل بہت بڑا ہوتا ہے مرد کی بے وفائی معاف کر دیتی ہے۔ بے راہ روی میں تو دبئی نے ساری حدیں پار کی ہوئی ہیں۔ ناچ گانا عام ہے اور شراب خانے تو جگہ جگہ کھلے ہوئے ہیں۔ عورت تو اکیلی جانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ افسانہ 'کاغذی بندھن' میں بڑوں کے فیصلوں کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ باوفا بیوی کی قدر کرنے والوں کو ہی سکون کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ افسانہ 'زندگی کے ادھورے رنگ' میں قارئین کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ جذباتی فیصلے پائیدار نہیں ہوتے ہیں۔ عورت اپنوں کے بیچ اجنبی بن جاتی ہے۔ افسانہ 'تبدیلی' میں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے بوجھ لگنے والی ذمہ داری جب آزادی میں تبدیل ہو جاتی ہے تب بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ضمیر ضدی بچے کی طرح روتا ہے اور انسان خاموش ہو جاتا ہے۔ 'عشق عبادت' بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ پارسا کتے افسانہ حیرت کی وادی میں لے گیا۔ جوان بیٹے کی موت والد کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتی ہے لیکن والد تب بھی پیسوں کا حساب کتاب کر رہا تھا اور پھر کتوں کا گوشت سب کو کھلا کر یہ کہہ دینا کہ یہ چھوٹا گوشت ہے بڑی عجیب بات ہے۔ 'عزت اور محبت' دو بہنوں کی کہانی اچھی لگی۔ ناول 'موتی' کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار تھا۔ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا خیال شہزاد کا آیا کہ اگر وہ رمشا کے بغیر رہ نہیں سکتا ہے تو پھر وہ زوبی کو غلط فہمیوں میں کیوں ڈال رہا ہے؟ دیکھتے ہیں کہانی میں اب کون سا نیا موڑ آتا ہے۔ نئے کرداروں کے آ جانے کی وجہ سے دلچسپی مزید بڑھ گئی ہے۔ شوبز خبرنامہ اور سخن زار ہمیشہ کی طرح بہترین تھے۔ اب اجازت دیں زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

✍: عروج! خوش رہو تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار ہے اور تم نے ہر تحریر کے ساتھ انصاف کیا ہے لکھاری چاہتا ہے کہ پڑھنے والے اس کی کاوش پر رائے ضرور دیں اور یہ اس کا حق بھی ہے۔

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دوشیزہ کے حصول میں اگر کوئی بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے خوش رہیے خوش رکھیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈز ونر لسٹ 2017ء

1	اماوس میں گھرا چاند	احمد سجاد بابر
2	عزیزہ خالہ	رضوانہ پرنس
3	خاک ہے کاسۂ دل	کاشی چوہان
4	سیلن	روحیلہ خان
5	توازن	بلال فیاض
6	بے ثمر محبتیں	اقبال بانو
7	شریفے	خولہ عرفان
8	نسوانیت	سنبل
9	زینی اور زینب	بلال فیاض
10	مثلث	سکینہ فرخ
11	چوزن ون	عمران مظہر
12	خشک چہرہ	سیما رضا ردا
13	سائل	فرح اسلم قریشی
14	شہر بلا	خولہ عرفان

زادِراہ

غزالہ عزیز (اُمِ ایمان)

حضرت اُمِ ایمنؓ

جن کو رسول اللہ ﷺ اماں جان کہہ کر پکارا کرتے تھے

حضرت اُمِ ایمنؓ وہ خوش نصیب صحابیہ تھیں جنہیں لسانِ رسالت سے جنت کی بشارت ملی خدا اور خدا رسول اُن سے راضی اور خوش ہوئے۔

ان کا آبائی وطن حبشہ تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد عبداللہ بن عبدالمطلب کی کنیز تھیں اصل نام برکتہ بنت تعلبہ تھا۔ ان کا پہلا نکاح عبید بن زید خزاجی سے ہوا جن سے اُن کے صاحبزادہ ایمن پیدا ہوئے یہ صحابی تھے اور ان کے ہی باعث آپ اپنی کنیت 'اُمِ ایمن' سے مشہور و معروف ہوئیں۔

رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے آپ کا تعلق بہت گہرا اور پرانا تھا۔ آپ ﷺ کے والد ماجد کو اُن کے والد نے کھجوریں لانے مدینہ بھیجا اور وہ ایک قافلے کے ساتھ واپس آتے ہوئے بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے اُس وقت اُن کی عمر پچیس سال تھی صحیح ترین روایت کے مطابق جسے عموماً اہل علم نے تسلیم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش والد محترم عبداللہ کے انتقال کے بعد ہوئی چنانچہ قرآن میں اسی بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

''اے نبی! کیا ہم نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانے فراہم کیا۔''

چونکہ ابھی رسول اللہ ﷺ کے والد محترم نے عملی زندگی میں قدم رکھا ہی تھا اور اپنے کاروبار کا آغاز ہی کیا تھا لہٰذا انہوں نے اپنے یتیم بچے اور بیوی کے لیے کوئی لمبی چوڑی جائیداد اور دولت نے چھوڑی تھی۔

ترکہ میں کل پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک حبشی لونڈی چھوڑی تھی۔ یہ لونڈی جن کا نام برکتہ تھا اُمِ ایمن کی کنیت سے مشہور ہوئیں۔

سرزمین عرب کے قبائلی دستور کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی عمر بنو سعد کے ساتھ گزری جہاں آپ ﷺ پانچ برس تک حلیمہ سعدیہ کے آغوش میں پرورش پاتے رہے پانچ برس کے بعد حلیمہ سعدیہ نے آپ ﷺ کو مکہ لاکر بی بی آمنہ کے سپرد کر دیا۔

بی بی آمنہ کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کریں شوہر کی محبت اور یاد کے ہاتھوں بے چین ہو کر آپ نے اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ مدینے کے سفر کا ارادہ کیا۔ اُس وقت ننھے محمد ﷺ کی عمر چھ سال تھی۔

بی بی آمنہ کے اس سفر میں اُن کی خادمہ اُمِ ایمن ساتھ ساتھ تھیں۔ مدینہ میں ایک ماہ قیام کے بعد واپسی کا ارادہ کیا ابھی مدینہ سے کچھ دور ہی پہنچی تھیں کہ بیماری نے آلیا پھر بجائے صحت یاب ہونے کے وقت کے ساتھ ساتھ اس بیماری نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی یہاں تک کہ مدینہ سے کچھ دور ابواء کے مقام پر باوفا بیوی اپنے محبوب شوہر کے پاس جانے کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ واقعہ ابواء کے مقام پر پیش آیا تھا اس وقت ننھے محمد ﷺ کے پاس صرف اُمِ ایمن موجود تھیں۔

انہوں نے آپ ﷺ کو گود میں لیا دلاسہ دیا اور ممتا سے محرومی کے بعد حتی الامکان ماں کا خلاء پُر کرنے کی کوششیں کی۔ ضبط اور حوصلے کے ساتھ حضرت آمنہ کو وہیں سپردِ خاک کیا اور حضور ﷺ کو انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ مکہ مکرمہ لے آئیں اور یتیم پوتے کو دادا کے سپرد کیا۔

حضرت عبدالمطلب کا دل یتیم پوتے کے لیے شفقت اور محبت کے مارے ابل رہا تھا انہوں نے اسے کلیجے سے لگایا اور اپنی کفالت میں لے لیا اور اُمِ ایمن کو ان کی پرورش اور نگہداشت پر مامور کر دیا۔

مدینہ کے سفر کے وقت اگرچہ آپ ﷺ کی عمر سات سال بھی نہ تھی لیکن آپ کو اس سفر کے واقعات اچھی طرح یاد تھے۔ ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو اپنے اصحاب کو اس پہلے سفرِ مدینہ کے واقعات سناتے تھے۔ جو آپ ﷺ نے اپنی والدہ اور ان کی کنیز اُمِ ایمن کی معیت میں کیا تھا۔

بنی عدی بن نجاد کی گڑھی جو آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا ننھیال تھا آپ ﷺ اسے دیکھ کر فوراً پہچان گئے۔ فرمایا یہاں میں انصار کی ایک لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اترنے والے پرندوں کو اڑایا کرتا تھا۔

دارالعابغہ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہاں میں اپنی والدہ کے ساتھ اترا تھا اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے۔ مدینہ میں اس پہلے سفر اور قیام کی ایک خاص بات حضرت ایمن کو مدت العمر یاد رہی۔ فرماتی ہیں کہ......

''یثرب میں قیام کے دوران میں یہود کی ایک جماعت کے لوگ آ آ کر ننھے محمد ﷺ کو دیکھا کرتے تھے اور آپس میں کہتے تھے کہ یہ ہی لڑکا نبی آخر الزماں معلوم ہوتا ہے اور یہ ہی شہر اس کا دار الہجرت ہے۔''

یہودی کی یہ بات جیسے میرے دل پر نقش ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ جب جوان ہوئے تو اُمِ ایمن کو آپ ﷺ نے آزاد کر دیا اور عبید بن زید خزرجی سے اُن کا نکاح کر دیا۔ جن سے ایمن پیدا ہوئے جو بڑے بہادر صحابی تھے۔ غزہ حنین میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے انہوں نے شہادت پائی ان کی وجہ سے ہی آپ اس کنیت اُمِ ایمن سے مشہور ہوئیں حضور اکرم ﷺ کی ہجرت مدینہ سے پہلے اُمِ ایمن بیوہ ہو گئی تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد آپ اپنے بیٹے کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں آپ ﷺ نے ان کی

دلجوئی فرمائی۔ ایک دن صحابہ کے مجمع کے درمیان ارشاد فرمایا کہ......

"اگر کسی شخص کو جنت کی عورت سے عقد کی آرزو ہے تو اسے چاہیے کہ اُمِ ایمن سے نکاح کرے۔" رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سن کر حضرت زید بن حارثہ نے اُن سے فوراً نکاح کرلیا حالانکہ وہ عمر میں اُن سے کہیں بڑی تھیں۔

حضرت زیدؓ سے حضرت اُمِ ایمن کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے حضرت زید کی طرح ان کے صاحبزادے اسامہ کو بھی 'حب النبی' بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ اور حضرت اُمِ ایمنؓ سے رسول اللہ کا خاص تعلق تھا لہٰذا حضرت اسامہ سے اس قدر محبت فرماتے تھے کہ وہ 'حب رسول اللہ' کے لقب سے مشہور تھے۔

حضور اکرم ﷺ کو اپنے متعلقین میں حضرت حسن اور حضرت حسین سے زیادہ کسی سے محبت نہیں تھی۔ لیکن بعض دفعہ اس محبت میں حضرت اسامہؓ کو بھی شریک کر لیتے تھے صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک زانو پر حسنؓ اور دوسرے پر اسامہؓ کو بٹھاتے اور پھر فرماتے۔

"خدایا میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں اس لیے تو بھی ان سے محبت فرما۔"

حضرت اسامہ سے حضور ﷺ کی غیر معمولی محبت دیکھ کر بعض منافق ان سے حسد کرنے لگے اور انہوں نے مشہور کردیا کہ اسامہ زید کے حلب ہی سے نہیں' یہ جنگ موتہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ منافقوں کی اس شرانگیزی کی زد حضرت اُم ایمنؓ پر بھی پڑتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ پر اس شرانگیزی پر آپ سخت آزدہ خاطر ہوئے۔

اسی زمانے میں عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اُس وقت حضرت اسامہؓ اور اُن کے والد زیدؓ دونوں سر سے چادر لیے سو رہے تھے۔ اور صرف پاؤں چادر سے باہر نظر آرہے تھے حضور ﷺ نے اُس سے فرمایا۔

"ذرا بتاؤ ان پاؤں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟" قیافہ شناس نے پاؤں پر نظر ڈالی اور عرض کیا۔

"یہ باپ بیٹا ہیں۔" اِس کا جواب سن کر آپ ﷺ بہت مسرور ہوئے اور حاسدوں اور منافقوں کی شرانگیزی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

طبرانی کے مطابق وہ ہجرت نبوی کے وقت مکہ میں ہی مقیم تھیں چند ماہ بعد اُن کے شوہر حضرت زید بن حارثہؓ جو پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے۔ مکہ آئے اور اُمِ المومنین حضرت سودہؓ اور رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیوں حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت اُمِ کلثومؓ اپنی بیوی حضرت اُم ایمن اور اپنے فرزند حضرت اسامہؓ کو لے کر اپنے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے۔

اس وقت تک حضرت اُم ایمنؓ کافی عمر رسیدہ ہوچکی تھیں سفر کے دوران ان کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں سفر کے ساتھ لے جایا جانے والا پانی ختم ہو چکا تھا۔ ان کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ یہاں تک کہ جان لبوں پر آگئی قریب و جوار میں کہیں دور دور تک پانی موجود نہ تھا۔

قریب تھا کہ غشی کا دورہ پڑ جاتا اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ آسمان سے ایک ڈول آہستہ آہستہ ان کی طرف اتر رہا ہے اس کے ساتھ نہایت سفید رنگ کی رسی بندھی ہے ڈول ان کے چہرے کے

پاس آ کر رک جاتا ہے آپ نے اسے منہ سے لگایا اور دل بھر کر پانی پیا۔

فرماتی ہیں کہ اس کے بعد زندگی بھر مجھے پیاس نہیں لگی میں نے سخت ترین گرمی کے زمانے میں بھی روزے رکھے لیکن مجھے کبھی پیاس نے نہ ستایا اور ہمیشہ میرے سینے میں خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ڈیرہ جمائے رہا۔''

جنگ احد 3ھ کے وقت اگرچہ حضرت اُم ایمنؓ کافی عمر رسیدہ ہو چکی تھیں لیکن اُن کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر بیٹھی رہیں۔ چنانچہ وہ اُن خواتین کے ساتھ تھیں جو مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھیں جنگ احد کے بعد وہ جنگ خیبر میں شریک ہوئیں اور مجاہدین کی خدمت کا فریضہ انجام دیا۔

بعض روایات کے مطابق اُن کے صاحبزادے ایمنؓ بھی اسی جنگ میں شریک تھے اور وہ بڑی بہادری کے ساتھ لڑ کر شہید ہوئے لیکن سیرت صحابہ کی اکثر کتابوں میں اُن کا نام شہدائے خیبر کی فہرست میں شامل نہیں ابن اسحاق نے انہیں غزوہ حنین کے شہداء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان آٹھ صحابہ میں سے تھے جو حنین میں شروع سے آخیر تک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میدان جنگ میں جمے رہے تھے اور ان آٹھ میں سے صرف حضرت ایمنؓ شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

اپنے صاحبزادے حضرت ایمنؓ کی شہادت پر حضرت اُم ایمن نے بڑے صبر و برداشت سے کام لیا اور ایمن کے فرزند حجاج کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ حجاج بڑے ہو کر بڑے عالم بنے اور فضلائے مدینہ میں شمار ہوئے۔ چند احادیث بھی ان سے مروی ہیں۔

غزوہ موتہ میں حضرت اُم ایمنؓ کے شو
رت زید بن حارثہ نے شہادت پائی یہ غز
جمادی الاول 8ھ میں پیش آیا تھا۔ حضور اکر
نے حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو دعوت دین
خط دے کر حاکم نصریٰ کے پاس بھیجا تھا وہ جب
دمشق کے پاس موتہ کے مقام پر پہنچے تو بلقاء کے
رئیس شرجیل بن عمرو غسانی نے انہیں شہید کر دیا۔

سفیر کا قتل ایک نہایت سنگین جرم تھا۔ حضو
اکرم ﷺ نے اُن کا انتقام لینے کے لیے تین ہزا
مجاہدین کا لشکر روانہ فرمایا اس لشکر کا امیر حضو
اکرم ﷺ نے حضرت زیدؓ کو مقرر کیا۔

جب لشکر روانہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ لشکر کے ساتھ تھوڑی دور تک تشریف لے گئے اور رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں
جعفرؓ امیر لشکر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ قیادت سنبھال لیں۔''

محدثین نے یہ روایت تواتر کے ساتھ نقل کی ہے کہ عین اس وقت جب موتہ کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا رسول اللہ ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔

یکا یک آپ ﷺ نے فرمایا۔

''زید شہید ہو گئے اب جعفر نے علم سنبھالا ہے، وہ بھی جنت کو سدھارے اب علم عبداللہ بن رواحہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بھی شہید ہوئے اب اُس شخص نے علم سنبھالا ہے جو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے میدان جنگ کا نقشہ حضور ﷺ کے سامنے کر دیا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جس وقت آپ مسلمانوں کو یہ خبر سنا رہے تھے تو

آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
آخر میں علم سنبھالنے والے حضرت خالد بن ولیدؓ تھے حضرت خالد بن سمرہ سے روایت ہے کہ حضرت زیدؓ کی (کمسن) صاحبزادی نے باپ کی شہادت کی خبر سنی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں انہیں دیکھ کر حضور ﷺ پر بھی گریہ طاری ہو گیا اور آپ ﷺ اس قدر روئے کہ آواز رک گئی۔
حضرت سعد بن عبادہؓ نے حیران ہو کر پوچھا۔
''یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا ہے؟'' فرمایا۔
''یہ جذبہ محبت ہے جو ہر محبّ کے دل میں اپنے محبوب کے لیے ہوتا ہے۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں صحابہ کے وظائف مقرر کیے تو اپنے فرزند عبداللہ کا وظیفہ ڈھائی ہزار اور حضرت اسامہ بن زید کا تین ہزار مقرر کیا۔
حضرت عبداللہ نے عرض کیا۔
''جان پدر! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن رسول اللہ ﷺ اسامہ کو تم سے اور اسامہ کے باپ کو تمہارے باپ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔''
11ھ میں رسول اللہ ﷺ نے جنگ موتہ کا بدلہ لینے کے لیے ایک لشکر تیار کیا جس میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر فاروقؓ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید اور کئی دوسرے جلیل القدر صحابہ اکرام شامل تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت اُم ایمن اور حضرت زید بن حارثہ کے نوجوان بیٹے حضرت اسامہ کو قیادت پر معمور کیا۔
یہ وہ وقت تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ کی علالت کا آغاز ہو چکا تھا لیکن آپ ﷺ نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔
لشکر نے مدینے سے چل کر جُرف' کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اسی دوران نبی اکرم ﷺ کی علالت شدید تر ہو گئی۔
حضرت اُم ایمن خاندان ہاشمیہ کے بہت سے لوگوں کا آخری وقت دیکھ چکی تھیں۔ حضور ﷺ کی بیماری میں آپ سے کچھ ویسی ہی علامت پائیں تو انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری وقت قریب ہے۔
انہوں نے فوراً حضرت اسامہؓ کے پیچھے آدمی دوڑائے کے فوراً مدینہ آجاؤ حضور اکرم ﷺ ہمیں داغ مفارقت دے رہے ہیں۔ حضرت اسامہؓ بعض دیگر صحابہ اکرام کے ساتھ مدینہ واپس آگئے اور رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے تجہیز و تکفین میں شرکت کی۔
حضرت اُم ایمن کو رسول اللہ ﷺ سے جو قلبی تعلق تھا اس کے باعث آپ کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ لوگوں نے حضرت اُم ایمنؓ کو سمجھایا تو کہنے لگیں۔
''یہ تو میں جانتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے مفارقت ہو گئی لیکن رونا مجھے اس بات پر آتا ہے کہ اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔''
غم سے ڈوبے ہوئے مرثیے کے اشعار زبان پر جاری تھے آنسوؤں کی لڑیاں تھمتی نہ تھیں۔ آپ ﷺ کے لیے ان کے جذبات ایک ماں کے جذبات تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو گودوں میں کھلایا شادی دیکھی رسالت کے اعلان کے بعد کفار مکہ کا ظلم و جود دیکھا اپنوں کے مظالم اور غیروں کی وفا دیکھی ہجرت کے بعد ریاست مدینہ میں حکمرانی دیکھی اور پھر آفتاب رسالت کو غروب ہوتے دیکھا رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ہر دور کو انہوں نے دیکھا اور دل سے محسوس کیا۔

آپ ﷺ کی وفات کے چند روز بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت اُم ایمنؓ کے پاس دلاسہ اور تشفیع کے لیے تشریف لے گئے آپؓ رسول اللہ ﷺ کی یاد میں زار و قطار رو رہی تھیں۔ کہا..... ''اماں جان آپ اتنا کیوں رو رہی ہیں رسول اللہ ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے پاس نہایت آرام دہ ماحول میں ہیں۔'' فرمایا۔

''یہ میں جانتی ہوں لیکن مجھے غم اس بات کا ہے کہ وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔'' یہ سن کر وہ دونوں بھی آب دیدہ ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے حضرت اُم ایمن بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئیں انہیں دیکھتے ہی رسول اللہ 'امی' 'امی' کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور پھر پوچھا۔

''امی کیسے تکلیف کی؟'' انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک اونٹ کی فرمائش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔

''اونٹ کا آپ کیا کریں گی؟'' اُم ایمنؓ نے کہا۔

''یارسول اللہ ﷺ آج کل ہمارے پاس سواری کا کوئی جانور نہیں ہمیں دور جانا ہو تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا۔

''اچھا تو میں آپ کے لیے اونٹ کا ایک بچہ حاضر کر دیتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''اونٹ کا بچہ بھلا میرے کس کام کا؟ وہ تو میرا بوجھ نہیں سہار سکے گا مجھے تو اونٹ ہی چاہیے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''میں آپ کو اونٹ کا بچہ ہی دوں گا اور آپ کو سوار بھی کرواؤں گا۔'' پھر خادم کو اشارہ کیا وہ تھوڑی دیر میں جوان اور فربہ اونٹ لے کر حاضر ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی مہار حضرت اُم ایمن کو تھمائی اور فرمایا۔

''امی ذرا دیکھیے تو یہ اونٹ کا بچہ ہی ہے نا؟''

حضرت اُم ایمنؓ بے ساختہ ہنس پڑیں اور دعائیں دینے لگیں حاضرین مجلس بھی شگفتہ ہو گئے۔

حضرت اُم ایمن نے رسول اللہ ﷺ کو گودوں کھلایا تھا اور آپ ﷺ کے والد والدہ اور دادا اور دیگر بزرگوں کی بھی خدمت کی تھی رسول اللہ ﷺ ان کی بے حد تعظیم فرماتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ حضرت اُم ایمنؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے۔

'' هذا بقية اهل البيتى. ''

حضرت اُم ایمنؓ کو بھی حضور ﷺ پر بڑا ناز تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ ان کے گھر گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں شربت پیش کیا۔ حضور ﷺ نے اس کو پینے میں (کسی وجہ سے) عذر کیا۔

(غالباً آپ ﷺ کا روزہ تھا جس کا اظہار نہ فرمایا)

اس پر اُم ایمنؓ نے خفگی کا اظہار کیا تاہم رسول اللہ ﷺ نے آپ کی باتوں پر مطلق برا نہیں مانا۔

حضور اکرم ﷺ کے پاس انصار کے دیے ہوئے بہت سے نخلستان تھے جنہیں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ میں تقسیم کیا تھا ان میں سے کچھ نخلستان حضرت انسؓ بن مالک کے بھی تھے جو آپ ﷺ نے حضرت اُم ایمنؓ کو دیے ہوئے تھے۔ جب بنو قرطیہ اور بنو نضیر پر غلبہ حاصل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے انصار کے نخلستان ان کو واپس کرنا

شروع کیے حضرت انسؓ بن مالک کے نخلستان بھی واپس لوٹائے وہ جب ان کا قبضہ لینے گئے تو حضرت اُمِ ایمنؓ متردد ہوئیں اور باغات واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کو راضی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''اماں جان...... چھوڑیے ان باغات کو آپ واپس کر دیں میں اس سے دس گناہ زیادہ جائیداد آپ کے نام لگا دیتا ہوں۔'' اس طرح آپ ﷺ نے حضرت اُمِ ایمنؓ کو راضی کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ پانی پی رہے تھے اُمِ ایمنؓ بھی وہاں موجود تھیں انہوں نے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یا رسول اللہ ﷺ مجھے بھی پانی پلایئے۔'' میں نے کہا۔

''آپ رسول اللہ ﷺ سے پانی پلانے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''کیوں نہیں میرا حق بنتا ہے میں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سن کر ارشاد فرمایا۔

''عائشہ یہ سچ کہتی ہیں۔'' پھر آپ ﷺ نے بصد ادب و احترام کے اُن کی خدمت میں پانی پیش کیا۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ بعض دفعہ رسول اللہ ﷺ حضرت اُمِ ایمنؓ کے ہاں جاتے تو میں بھی ساتھ ہوتا۔ وہ ہماری آمد پر بے انتہا خوش ہوتیں کھانے پینے کے لیے جو کچھ موجود ہوتا لا کر رکھتیں۔ اگر کسی وجہ سے ہم ہاتھ نہیں بڑھاتے تو پیار سے جھگڑا کرتیں۔

''آپ ﷺ کیوں نہیں کھاتے؟ آپ ﷺ کیوں نہیں پیتے؟'' آپ ﷺ اُن کے پیار بھرے شکوے کے جواب میں مسکراتے۔

حضرت اُمِ ایمنؓ حبشی النسل تھیں لہٰذا عربی کے بعض الفاظ صحیح طرح ادا نہیں کر پاتی تھیں رسول اللہ ﷺ جب کچھ ان کا غلط تلفظ سنتے مسکرا کر اصلاح کر دیا کرتے تھے۔

وہ عموماً اسلام اللہ علیکم کہتے ہوئے سلام لا علیکم کہہ جایا کرتی تھیں ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا۔

''اماں جان آپ صرف لفظ سلام کہہ دیا کریں۔''

حضرت اُمِ ایمنؓ دل کی انتہائی صاف تھیں ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور اخلاص سے پیش آتیں۔

منافقین نے جب حضرت عائشہؓ پر غزوہ بنو مصطلق سے واپسی پر بہتان باندھا تو حضرت اُمِ ایمنؓ نے حضرت عائشہؓ کی پاکیزہ زندگی اور عادات و اطوار کی برملا گواہی دی۔ حضرت عائشہؓ دل سے ان کی بے حد قدر کرتی تھیں۔

حضرت اُمِ ایمنؓ نے طویل زندگی پائی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دور خلافت دیکھا حضرت عثمانؓ کے دور حکومت میں وفات پائی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے اور دونوں نے غازی اور شہید کا رتبہ حاصل کیا۔ خاوند حضرت زید بھی شہادت کے رتبے پر پہنچے۔

یوں یہ شہید خاوند کی بیوی اور شہید بیٹوں کی یہ عظیم اور نامور ماں جنہیں جنتی ہونے کی خوش خبری زندگی ہی میں حاصل ہو چکی تھی اس دار فانی سے رخصت ہو کر فردوس بریں کے جانب روانہ ہو گئیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے آمین۔

سلسلے وار ناول

تحسین انجم انصاری

بچھڑنا بھی ضروری تھا

قسط 19

بعض اوقات انسان سوچتا کیا ہے اور ہو کیا جاتا ہے محبت اور نفرت کے درمیان بہت باریک لکیر ہے مگر اس لکیر کو صرف وہی لوگ پاٹ سکتے ہیں جنہوں نے دونوں جذبوں کا مزہ چکھا ہو
دوشیزہ کے قارئین کے لیے ایک خوبصورت ناول

''یہ ہے مسئلہ..... کون ہے یہ؟'' نور نے پیچھے سے ہاتھ نکال کر تصویر اس کے سامنے کی..... پھر تصویر کی پچھلی سائیڈ پر لکھے الفاظ اس کے سامنے کیے۔

''اور یہ کیا ہے؟'' سرخیل کے چہرے پر ایک لمحے کو سایہ سا لہرایا۔ پھر آنکھوں میں بے پناہ اذیت لیے اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے میرے کاغذات کو ہاتھ کیوں لگایا؟'' اس نے تلخ لہجے میں کہہ کر اس کے ہاتھ سے تصویر چھین لی۔

''آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ میری پرائیویٹ چیزوں کو دیکھتی پھریں۔''

''کیوں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟'' وہ طنزیہ انداز سے بولی۔

''آپ کی توقع سے کہیں زیادہ..... بہت زیادہ..... کاش آپ سمجھ سکتیں۔'' اس کا پورا چہرہ کسی اَن دیکھے درد کی تصویر بنا تھا۔ کسی گہرے دکھ کی چھاپ تھی اس پر.....

''آئندہ اس تصویر کو ہاتھ نہیں لگائیں گی آپ۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیوں یہ کوئی مقدس صحیفہ ہے..... جو ہاتھ لگانے سے ناپاک ہو جائے گا۔'' نور اندر سے جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ تن من میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں ناکارہ ہونے لگیں۔

''میرے لیے ہے یہ مقدس..... بہت مقدس.....''



''کون ہے یہ آخر؟''

''کیوں آپ نے تصویر کے پیچھے نہیں پڑھا۔'' سرخیل کا چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی زخم کے ٹانکے کھل گئے ہوں اور وہ بڑی مشکل سے اس کا درد برداشت کر رہا ہو۔

''اگر پھر بھی آپ کو سمجھ نہیں آئی تو میں آپ کو پھر بتا دیتا ہوں...... یہ میری زندگی کی سب سے بڑی محبت ہے۔'' نور ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خود ہی سب اقرار کر رہا تھا۔

''اگر یہ بات ہے تو اسے وہاں کیوں چھوڑ آئے؟''

''چھوڑنا پڑا...... اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا۔'' نور کو آگ سی لگ گئی۔

''آپ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں...... لیکن میں جانتی ہوں کیوں چھوڑنا پڑا۔ یقیناً اس نے بے وفائی کی ہوگی آپ سے...... وہاں کی عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔''

''بس......'' سرخیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''اب ایک اور لفظ مت نکالیے گا اپنی زبان سے...... میں جانتا ہوں کہ آپ بے وقوف ہیں لیکن یہ نہیں پتہ تھا کہ اتنی بے وقوف ہیں کہ کبھی دماغ کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کریں گی' آخر کس مٹی کی بنی ہیں آپ' آپ پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا' اتنی بار کہنے کے باوجود آپ بولنے سے پہلے سوچنا گوارا نہیں کرتیں۔''

''اپنی غلطیوں کا الزام میرے سر رکھنا چھوڑ دیں آپ...... آپ نے مجھے اندھیرے میں رکھا اپنا ماضی مجھ سے چھپایا۔ اس کے علاوہ جانے اور کتنے افیئرز چلائے ہوں گے آپ نے...... یہ سوچ کر کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلے گا۔'' وہ اس کے کہنے کے باوجود باز نہیں آ رہی تھی۔

''نور...... خدارا خاموش ہو جائیں۔'' وہ اپنا سر بمشکل ہاتھوں میں تھام کر اٹھا۔

''کیوں خاموش ہو جاؤں تاکہ آپ کے گناہوں پر پردہ پڑا رہے۔'' اور وہ چیخ کر بولی تو سرخیل کا ہاتھ ایکدم اٹھا لیکن اس نے بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے کر لیا۔ نور نے بے پناہ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے؟''

''یہ ہاتھ ضرور اٹھ جاتا...... جس قسم کی باتیں آپ کے منہ سے نکل رہی ہیں...... یہ بے سروپا باتیں...... لیکن میری ماں نے مجھے عورت کی عزت کرنا سکھایا ہے۔ آپ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ آپ کو اپنے تھپڑ سے نواز سکوں...... ورنہ میری ماں کی تربیت پر حرف آئے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''آپ اسی ماں کی بات کر رہے ہیں نا...... جو آپ کو چھوڑ کر چلی گئی...... ہمیشہ کے لیے......'' سرخیل نے ایک نظر سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اذیت اور دکھ سے بھرپور آنکھیں جو نور کے دل میں کھب گئیں اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ جیسے اس کی موجودگی میں ایک لمحہ بھی وہاں رہنا اُسے گوارا نہ ہو...... نور چند لمحے ملتے دروازے کو دیکھتی رہی اور پھر کسی روبوٹ کی طرح سلوموشن میں وہیں بیٹھ گئیں۔ جہاں سے آئی تھی۔

کتنی دیر بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں کیا ہوا تھا...... اس کی سوچنے کی صلاحیتیں بے کار ہو گئی تھیں...... پھر بھی وہ گزرے ہوئے وقت میں گزری باتیں

یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ سب باتیں یاد آ ئیں اپنا لہجہ یاد آیا تو اس کا دل بیٹھنے لگا...... اپنا لہجہ...... اپنی باتیں اور سب سے زیادہ سرخیل کا چہرہ...... کیا کچھ نہیں تھا اس چہرے پر...... اذیت' دکھ' گزرے سالوں کے درد کی دھول...... اور سب سے بڑھ کر نور کی طرف سے ہونے والی باتوں کی چبھن نور سے ملنے والی مایوسی بے اعتباری......

''یہ کیا کر دیا اُس نے؟'' وہ بے چینی سے کھڑی ہوگئی۔

''جس سے محبت کا دعویٰ دل نے کیا اسی کو دکھوں کے بھنور میں دھکیل دیا...... آج پھر اس کے خود پر کنٹرول کے امتحان کا دن تھا۔ اور آج پھر وہ بری طرح فیل ہوگئی۔ آج پھر بدتمیزی کی انتہا کر دی' دماغ نے پھر کچھ نہیں سوچا...... ایک چنگاری نے اسے آگ لگائی تو اس نے خود ہی اس آگ کو بھڑکا دیا اتنا زیادہ بھڑکایا کہ اسے سرخیل کے دامن تک پہنچا دیا سرخیل نے کتنا سمجھایا تھا کہ تحمل سے کام لیا کرو...... بولنے سے پہلے سوچا کرو...... لیکن میں نے پھر اس کی بات کو اہمیت نہیں دی دو کوڑی کا کر دیا اُسے...... کاش میں آرام سے پوچھ سکتی...... اس تصویر کے بارے میں...... یوں بھی مجھے اس قدر مشتعل ہونے کا حق ہی کیا تھا۔ میرا ماضی کون سا بے داغ رہا ہے۔''

''میرے دامن پر بھی تو دھبہ ہے عاصم کے ساتھ کا...... لیکن یہ اُس کا ظرف ہے کہ اس نے آج تک میرے سامنے عاصم کا نام نہیں لیا...... کبھی کسی طریقے سے اسے عاصم کے حوالے سے شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ایک میں ہوں...... جو ایک تصویر دیکھ کر بھڑک اٹھی۔ ٹھنڈے دل سے اس سے دریافت کرنے کی بجائے پے در پے اوچھے حملے کرتی رہی...... وہ روکتا رہا...... لیکن مجھ پر تو جیسے خون سوار تھا...... میں نے کچھ نہ سوچا کچھ نہ سمجھا...... بس بولتی رہی...... بولتی رہی......

اگر ماضی میں اس کی زندگی میں کوئی لڑکی تھی بھی تو یہ اتنا بڑا جرم تو نہ تھا اس کے حال میں تو صرف میں ہوں۔ پھر...... پھر...... اس پھر کے آگے ہزاروں سوال تھے لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ کیا وہ سرخیل کے سامنے جا سکے گی۔ اس سے کبھی نظریں ملا سکے گی۔ اور اس کا جواب نہیں کے سوا کوئی نہیں مل رہا تھا سوچنے سوچنے میں رات بیتتی رہی...... وہ وہیں پتھر کے بت کی مانند بیٹھی رہی...... بے چینی زیادہ بڑھی تو کمرے کے اَن گنت چکر لگاتی رہی...... گھڑی دیکھی تو دو بج رہے تھے۔ لیکن سرخیل کمرے میں نہ آیا یقیناً وہ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا...... ہاں آج رات وہ گیسٹ روم کا گیسٹ بننے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا سوچ رہی ہو؟'' رات کو تینوں بچوں کو شب بخیر کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آئے تو کیری کو اتنا گم صم دیکھ کر جانی نے پوچھا۔

''سوچ رہی تھی ہمارے بچے جوان ہوگئے ہیں اور اس حساب سے ہم تو بوڑھے ہو رہے ہیں نا۔'' کیری مسکرا کر بولی۔

''کون کہتا ہے......'' جانی نے بھرپور مسکراہٹ سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم تین بچوں کی ماں ہو...... جن میں سے ایک کڑیل جوان ہے اور باقی دونوں بھی اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں...... تم ابھی بھی اتنی ہی خوبصورت اور دلکش ہو جتنی

اس وقت تھیں جب میں نے پہلی بار تمہیں بینچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔'' کیری اس کی باتوں پر مسکرا دی۔
''اور تم کون سا کم ہو...... ابھی بھی اتنے ہینڈسم ہو کہ کوئی بھی کم عمر خوبصورت لڑکی اب بھی تمہیں دل میں بسا لے۔''
''یہ کوئی اور لڑکی کہاں سے آ گئی...... میرا دل تو بس ایک ہی لڑکی کے لیے بنا ہے۔''
''پتہ ہے جانی......'' کیری پرسوچ انداز میں بولی۔
''پچھلے پچیس سال میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں...... سوائے ان دو تین سالوں کے جو میں نے تمہارے اور رومی کے بغیر گزارے اور جس کے لیے رومی نے ابھی تک پاپا کو معاف نہیں کیا...... کہنے کو یہ میری زندگی کا سیاہ ترین باب تھا...... لیکن اس سیاہ دور میں میں نے وہ روشنی حاصل کی جو اس کے بغیر حاصل نہ کر سکتی اسلام قبول کیا...... خدا کو پایا' خود کو پہچانا' شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے...... شاید خدا کو پانے کے لیے ہمارا بچھڑنا ضروری تھا۔''
''یہ تو بالکل درست ہے......'' جانی نے کہا۔
''میرا بھی یہی خیال ہے۔''
''اب تو ایک ہی خواہش ہے...... جو شدت سے میرے دل میں بار بار سر اٹھاتی ہے۔''
''وہ کیا؟''
''میں چاہتی ہوں پاپا یہ برا کام چھوڑ دیں...... اور مسلمان ہو جائیں...... میری شدید خواہش ہے کہ کسی کو مسلمان کروں...... کوئی میری وجہ سے اسلام قبول کرے......''
''تمہاری یہ خواہش بھی انشاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔''
''ایک بار پاپا نے مجھے بتایا...... کہ وہ چھ بار تمہیں مروانے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن تم خدا کے فضل سے بچ گئے...... تمہیں یاد ہے پانچ سال پہلے تمہارا جو ایکسیڈنٹ ہوا تھا...... وہ بھی ان کی وجہ سے تھا...... لیکن خدا نے تمہیں بال بال بچا لیا...... اس کے بعد انہوں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں۔''
''اچھا......'' جانی حیران ہوا۔
''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''
''میں تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتہ ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے...... اب پاپا تمہاری اس طرح مخالفت نہیں کرتے...... مجھے کبھی کبھی لگتا ہے وہ تمہیں ذہنی طور پر قبول کر چکے ہیں...... بس اپنی اَنا کی وجہ سے اظہار نہیں کرتے۔''
''کوئی بات نہیں...... تم فکر کیوں کرتی ہو...... ایک وقت آئے گا کہ تمہاری دونوں خواہشات قبول ہوں گی۔ وہ مسلمان بھی ہو جائیں گے اور برے کام چھوڑ دیں گے۔''
''شاید ایسا ہی ہو......'' کیری پھر سے سوچوں میں ڈوب گئی۔
''آج کیا سونے کا ارادہ نہیں......'' جانی نے محبت سے اُسے دیکھا۔
''آج رات سوچ کر گزارنا چاہتی ہو؟''
''ایک اور بات سوچ رہی تھی...... آنٹی فاروقی کے بارے میں......''

''کیا......وہ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''ہاں ٹھیک تو ہیں دیکھنے میں......لیکن وہ بہت برا فیل کرتی ہیں...... ہر وقت اس بات پر دکھی رہتی ہیں کہ ان کے بیٹوں نے انہیں تنہا چھوڑ دیا......کوئی نہیں چاہتا کہ وہ ان کے پاس رہیں......نہ پاکستان میں رہنے والے اور نہ یہاں والا......اور یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے نا؟'' کیری نے سوال کیا تو جانی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ظاہر ہے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے......اسی لیے ان کی ہر طرح سے دلجوئی کیا کرو اور بچوں سے بھی کہو کہ ان کے پاس بیٹھا کریں......باتیں کیا کریں۔''

''وہ تو کرتے ہیں......لیکن میں چاہتی تھی پھر بھی آپ ان کے بیٹے سے بات کریں......شاید اس کا دل نرم ہو اور ماں کی محبت جاگ اٹھے......میں اُن کے چہرے پر سچی خوشی دیکھنا چاہتی ہوں......حالانکہ میں چاہتی ہوں وہ یہاں سے کبھی نہ جائیں......لیکن مجھے ان کی خوشی اپنی خواہش سے زیادہ عزیز ہے۔''

''اوہ کیری......میری جان......تم کتنی اچھی ہو......کتنا دردمند دل رکھتی ہو...... ہر وقت خدا کے سامنے جھکتی ہو......دعائیں کرتی ہو تو خدا تمہاری خواہش کیسے پوری نہیں کرے گا......میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میری بیوی ہو......اور وہ گھڑی کیسی خوش نصیب تھی جب پہلی بار میری تم پر نظر پڑی......'' جانی نے بے اختیار اسے قریب کر کے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے سر پر تھوڑی ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ سب اللہ کی وجہ سے ہے......اس نے تمہیں میرے نصیب میں لکھ دیا تھا۔''

''ہاں......اس نے تمہیں میرے نصیب میں لکھ دیا تھا......حالانکہ میں اس قابل بھی نہ تھا۔'' اس نے اُسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

صبح تہجد کے وقت اٹھ کر کیری نے بڑے درد سے رو رو کر مسز فاروقی کے لیے دعا کی۔ ان کے بیٹے کو سیدھا راستہ دکھا......اس کے دل میں ماں کے لیے محبت جگا دے......وہ اپنی ماں کی آنکھوں کے لیے دوبارہ سے وہ ٹھنڈک بن جائے جو پہلے تھا تاکہ مسز فاروقی کے دل کو قرار آئے۔ ان کی زندگی کے سفر کے آخری دن سکون و آرام سے گزریں...... پھر اپنے پاپا کے لیے دعا کی کہ وہ سیدھے راستے پر آجائیں......آج تک جو ناجائز کام وہ کرتے رہے ہیں وہ چھوڑ دیں اور سچے دل سے توبہ کر لیں......یا خدا انہیں معاف کر دینا......وہ جیسے بھی ہیں میرے پاپا ہیں اور تو نے ہی تو اپنی مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ ماں باپ سے اچھا سلوک کرو......ان کی آخرت سنوار دے خدایا......اور انہیں سیدھا اور سچا راستہ دکھا دے......انہیں مسلمان کر دے اور اس کے لیے مجھے وسیلہ بنا دے...... یہ میری شدید ترین خواہش ہے۔'' وہ کافی دیر تک دعا مانگتی رہی اور پھر جانی کو بھی جگایا۔

''جانی اٹھو تہجد پڑھ لو......'' یہ اس کا روز کا معمول تھا اسے صبح کی اس نماز میں بہت سکون ملتا...... پھر سارا دن سکون سے گزرتا......صبح ناشتے کے لیے اٹھی تو شیری اور ٹونی آپس میں پھر جھگڑ رہے تھے۔

''کیا ہو گیا میرے بچو......''

''ماما یہ میرا سیریل ہے......اور ٹونی زبردستی اسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے......'' شیری کے

ہاتھ میں سیریل کا باؤل تھا جسے ٹونی چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔
''ماما یہ میرا بھی فیورٹ ہے یہ ہمیشہ آخری والا حصہ لے لیتی ہے......اس بار میں لوں گا۔''
''میں ہرگز نہیں دوں گی۔'' کیری نے فریج پر چپکائی ہوئی گروسری لسٹ میں اس سیریل کا نام ایڈ کیا اور پھر دونوں کی طرف آئی۔
''اب تم دونوں سولہ سال کے ہونے والے ہو لیکن اس طرح لڑتے ہو جیسے دونوں چار سال کے چھوٹے بچے ہو...... بری بات......''
''ماما......ٹونی پہلے لڑائی شروع کرتا ہے۔''
''تو سیریل پہلے تم نے کیوں ڈالا......؟''
''اس لیے کہ پاپا یہ سیریل میرے لیے لائے ہیں......میں اُن کی فیورٹ ہوں......''
''شیری......غلط بات...... ماں باپ کے لیے سب بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' کیری نے سرزنش کی۔
''پاپا نے کہا تھا میں اُن کی فیورٹ بیٹی ہوں۔'' اندر سے آتے ہوئے رومی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے آ کر کندھوں سے شیری کو تھاما۔
''کیوں شیری...... پاپا کی کتنی بیٹیاں ہیں جن میں سے تم ان کی فیورٹ ہو۔'' رومی کی آنکھوں میں بے پناہ شرارت ناچ رہی تھی۔
''رومی بھائی......میں ہوں پاپا کی فیورٹ......'' وہ فیورٹ پر زور دے کر بولی۔
''آپ بے شک ان سے پوچھ لیں۔'' شیری نے جانی کو تیار ہو کر اندر سے آتے ہوئے دیکھا اور بھاگ کر ان کے کندھوں سے جھول گئی۔
''کیوں پاپا...... میں ہوں نا آپ کی فیورٹ بیٹی۔'' جانی نے بے حد محبت سے اس چمکدار گرے آنکھوں اور لمبے کمر تک آتے بالوں والی بیٹی کے معصوم اور خوش چہرے کی طرف دیکھا۔
''ظاہر ہے......تم میری فیورٹ بیٹی ہو۔'' اس نے اُس کے گال پر پیار کیا۔
''بھئی میری پرنسس کو کوئی کچھ مت کہے......میری جان ہے یہ...... سمجھ آئی؟''
''یس پاپا......ہم تو سمجھ گئے۔'' رومی کی آنکھوں میں ابھی تک شرارت تھی۔
''بس اب آپ ٹونی کو سمجھا دیں......وہ کس کا فیورٹ ہے۔''
''کسی کا بھی نہیں۔'' وہ روٹھے انداز میں بولا تو کاؤنٹر کے پیچھے ناشتہ بناتی کیری نے محبت سے اُسے دیکھا۔
''ارے یہ کیا بات کی میری جان......تم بھی اسی طرح ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جیسے باقی دونوں بچے...... ماں باپ کے لیے سب برابر ہیں......اور شیری آئندہ تم یہ ٹاپک نہیں چھیڑو گی......سب ایک جیسے ہیں ہمارے لیے...... سمجھیں......''
''اوکے ماما......لیکن......''
''کوئی لیکن نہیں......بس اس بات کو یہیں ختم کرو......''

''اور ماما چونکہ میری کلاس شروع ہونے میں تھوڑی دیر ہے اس لیے فساد کی جڑ سیریل میں ہی لے لیتا ہوں...... آپ ان دونوں بچوں کو کچھ اور بنا دیں۔'' اس نے جلدی سے سیریل والا باؤل اپنی طرف کھسکا لیا۔

''ہم بچے نہیں ہیں......'' شیری اور ٹونی بیک وقت بولے۔

''اچھا ٹھیک ہے...... بس اب بڑائی ختم...... شیری اور ٹونی آج گرینڈ پاپا کی طرف جانا ہے...... یاد ہے نا تم دونوں کو؟''

''یس ماما یاد ہے...... آئی جسٹ لو دیٹ مینشن......'' شیری ایکسائیٹڈ تھی۔

''آئی لو گرینڈ پاپا......'' ٹونی بولا تو جانی نے چونک کر اسے دیکھا۔ کیری نے جلدی سے جانی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے...... کیری ناشتہ لے کر آئی اور جانی کی طرف دیکھا۔

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جانی...... اصل میں پاپا ٹونی سے محبت کرنے لگے ہیں ان کے کھیلوں کے شوق مشترکہ ہیں نا تو وہ ہر وقت اس پر باتیں کرتے ہیں اور پھر میں ہوں نا...... میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں ہر بات پر نظر رکھتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اوکے ماما پاپا میں چلا...... میرا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے...... دعا کریں دونوں آپ جانتے ہیں نا یہ پڑھائی کا آخری سال ہے۔ اس لیے بہت زیادہ دعائیں کریں...... بہت ٹف پڑھائی ہے۔''

''ہماری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں میری جان...... اگر وقت ہو تو آج تم بھی ہمارے ساتھ چلو...... پاپا تمہیں بہت یاد کرتے ہیں...... اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔'' کیری نے اس لہجے میں کہا تو وہ ایک منٹ رکا۔

''اوکے ماما...... آپ کی خاطر کوشش کروں گا۔'' وہ ماں باپ سے گلے ملا شیری اور ٹونی کو پیار کیا اور رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

وہ رات دونوں پر بھاری تھی گیسٹ روم میں ایزی چیئر پر بیٹھے سرخیل کے ہاتھوں میں وہ تصویر تھی۔ اور آنکھوں میں دکھ اور ویرانیاں ڈیرے ڈالے تھیں۔ اس کی بے چینیاں اور بے قراریاں عروج پر تھیں۔ ان زخموں کے ٹانکے بڑی بے دردی سے ادھیڑے گئے تھے جنہیں اس نے بڑی مشکل سے سیا تھا۔ اس کے پاؤں کا ہلتا انگوٹھا اس کی بے کلی اور دکھ کا غماز تھا۔

اُدھر اپنے کمرے میں نور پچھتاؤں اور شرمندگی میں گھری بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ آخر میں اپنی زبان کو لگام کیوں نہیں دے سکتی...... میں اپنے غصے کو کنٹرول کیوں نہیں کر پاتی...... اور غصے میں ایسی دل شکن باتیں کر جاتی ہوں جو سامنے والے کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہیں۔ ابھی تو سرخیل میری زبان کے پہلے دیے ہوئے زخموں کو نہیں بھول سکا...... تو اب یہ جو نئے زخم اُسے دیے ہیں اُن کا کیا ہوگا...... وہ بے قراری سے بیڈ پر بیٹھی لیکن اسے یوں لگا جیسے کانٹوں پر بیٹھ گئی ہو...... ایکدم سے اٹھی اور

پھر اُسی طرح چلنے لگی۔ چلتے چلتے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ لیکن اُسے احساس نہ ہوا۔

''یہ میں نے کیا کر دیا...... یہ کیا کر دیا میں نے...... جبکہ میں جانتی تھی کہ سرخیل اور سب برداشت کر لیتا ہے...... لیکن اپنی ماں کے بارے میں ایسی باتیں کبھی برداشت نہیں کرتا۔ آخر میری عقل کو کیا ہو گیا تھا جبکہ بڑے بابا نے بتایا بھی تھا کہ سرخیل کی ماں بہت اچھی بہت پیاری عورت تھی۔ لیکن ہمارے دل میں مغربی عورتوں کے بارے میں شروع سے ہی جو خیالات پل رہے ہوتے ہیں وہ ختم کیوں نہیں ہوتے...... سب عورتیں تو کسی بھی جگہ ایک سی نہیں ہوتیں۔ یہاں بھی تو عورتیں بے وفا ہوتی ہیں یہاں بھی تو عورتیں بچوں کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ اخبار میں کتنی بار خبر پڑھی تھی کہ چھ بچوں کی ماں بچوں کو چھوڑ کر آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ پھر میں نے یہ کیا کر دیا۔ اُسے ایسی جگہ مارا جہاں سب سے زیادہ درد تھا۔''

''اُس کی دکھتی رگ پر بے رحمی سے ہاتھ رکھ دیا...... اور پھر میں اُس سے محبت کا دعویٰ کرتی ہوں...... یہ کیسی محبت ہے جو زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اس پر نمک چھڑکتی ہے...... شاید مجھے اس سے محبت نہیں ہے...... میں نے تو عاصم سے محبت کا بھی دعویٰ کیا تھا لیکن وہ بھی کھوٹ تھا...... شاید میں اس قابل ہی نہیں کہ محبت کر سکوں......'' دل نے پُر زور مخالفت کی۔

''نہیں تم سرخیل سے شدید محبت کرنے لگی ہو...... وہ تمہاری زندگی بن چکا ہے۔'' وہ پھر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے اچانک وہ تصویر یاد آ گئی اور تصویر سے زیادہ پیچھے لگے بڑے بڑے الفاظ 'لو آف مائی لائف' یہ الفاظ ہی تو تھے جن سے اُسے اتنی زیادہ آگ لگی تھی۔ لیکن اسے پوچھنا تو چاہیے تھا شاید پوچھا تھا لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر انگارے اگلنا شروع کر دیے۔ اس کا چہرہ تک نہ دیکھا...... اس پر کتنی اذیت اور درد تھا یہ بھی محسوس نہیں کیا...... وہ بے چینی سے اٹھی اور دھیرے سے کمرے سے نکلی اس کا رخ گیسٹ روم کی طرف تھا۔ قدم بے اختیار ہی اُس طرف بڑھ رہے تھے...... وہ دروازے پر رک گئی دروازہ بند تھا...... اور اسے کھولنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا کہ روشنی کی ذرا سی کرن بھی دروازے کے نیچے سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ سو رہا ہو۔ تو کیا وہ اپنے اشکوں سے چراغاں کر رہا ہے...... وہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر ہمت کر کے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا...... دروازہ لاک نہیں تھا۔ ذرا سا اور کھول کر وہ بے آواز قدموں سے اندر آ ئی۔ روشنی سے اندر آئی تو آنکھوں کو کچھ نظر نہ آیا۔ روشنی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''لائٹ آن مت کریں......'' سرخیل کی سرد پتھریلی آواز آئی تو اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

''اور آپ یہاں سے جائیں...... اس سے پہلے کہ میں کچھ غلط کر بیٹھوں۔'' وہ گم صم سی کھڑی تھی۔ کسی پتھر کے بت کی طرح......

''آپ نے سنا نہیں...... جائیں پلیز...... میں اس وقت کسی کی کسی بات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'' کوئی بات تھی اس کے لہجے میں کہ وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ کمرے سے نکلی اور دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی اُسے پتہ تھا آج نیند کا تو سوال ہی نہیں اسے روتے ہوئے یہ رات گزارنی ہو گی۔

☆......☆......☆

وہ لنچ کی تیاری میں مصروف تھی اور مسز فاروقی سامنے صوفے پر بیٹھی چائے کے سپ لے رہی تھیں۔ جب بیل کی آواز آئی۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' کیری نے چولہا بند کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے آنٹی کا بیٹا کھڑا تھا...... کیا خدا نے اس کی دعائیں سن لیں...... پہلا خیال دل میں یہی آیا...... وہ کچھ شرمندہ لگ رہا تھا۔

''السلام علیکم بھابی...... میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''ضرور آ سکتے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''لیکن میری ایک بات صاف صاف سن لو اگر تم آنٹی کو کوئی نیا دکھ دینے آئے ہو تو یہیں سے واپس لوٹ جاؤ...... میں یہ بالکل برداشت نہیں کروں گی کہ انہیں تمہاری طرف سے کوئی نئی تکلیف پہنچے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

''مجھے اور شرمندہ نہ کریں بھابی...... میں امی سے معافی مانگنے اور ساتھ لے جانے آیا ہوں...... انہیں دکھ دینے کا انجام میں نے دیکھ لیا ہے میں کبھی خوش نہیں رہا' میری بیوی کو کینسر ہو گیا ہے اور میرے بچے میرے انداز سے بھی زیادہ آزاد ہو گئے ہیں۔ بری عادتوں میں پڑ گئے ہیں اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتا بیوی بہت شرمندہ ہے بیمار ہے آ نہیں سکتی لیکن اس کی شدید خواہش ہے کہ وہ امی سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکے...... میں بہت دکھی اور پریشان ہوں...... شاید بھول گیا تھا کہ اوپر اس کی ذات سب کا حساب برابر کر دیتی ہے اور کسی سے ناانصافی نہیں ہونے دیتی...... میرے ساتھ جو ہوا شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔'' وہ رو رہا تھا۔

''اندر آ جاؤ......'' وہ اندر آیا اور ماں کے قدموں میں گر کر روتا رہا مسز فاروقی نے اس کی کہانی سنی تو ان کا دل فوراً پگھل گیا ماں کا دل تھا ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا...... وہ ایک لمحہ سوچے بغیر اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں...... جانی بچوں کو اسکول سے لے کر آیا تو حیران رہ گیا۔ مسز فاروقی کے جانے پر ٹونی اور شیری مایوس اور اُداس تھے۔

''ماما ہم کیا کریں گے دادو کے بغیر۔'' شیری رو پڑی۔

''ہم دادو سے ملنے جایا کریں گے نا...... تم بس یہ سوچو کہ دادو کی اُس گھر کو ہم سے زیادہ ضرورت ہے۔''

''اِدھر آؤ میرے پاس......'' مسز فاروقی محبت سے بولیں تو دونوں پاس آ کر دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

''تم دونوں تو میری جان ہو...... بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے...... میں تم دونوں کو اور رومی کو کبھی نہیں بھول سکتی...... تم لوگوں نے مجھے وہ خوشی دی ہے جو اور کوئی نہیں دے سکتا تھا...... تم دونوں اور رومی میرے لیے ہمیشہ ایک خوشگوار یاد بن کر میرے دل میں رہو گے...... اور کیری......'' انہوں نے جانی اور کیری کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں نے میرا اُس وقت میں ساتھ دیا جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ میرے

پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں تم دونوں ایک آئیڈیل میاں بیوی ہو...... تمہاری جگہ میرے دل میں ہے کاش تم لوگ میری سگی اولاد ہوتے ...... کیونکہ میں نے تم دونوں کو بہترین انسان پایا ہے۔''

آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان وہ رخصت ہوتی ہوئی رومی کو بھولیں۔

''رومی سے کہنا میں کسی دن اُس سے ملنے ضرور آؤں گی ......بس اس وقت جلدی میں ہوں۔''

ان کے جانے کے بعد کچھ دیر سب یوں خاموش بیٹھے رہے...... جیسے کوئی بہت قیمتی چیز گم ہوگئی ہو...... پھر کیری نے سب کو سنبھالا۔

''میں بہت خوش ہوں جانی...... آنٹی کے چہرے پر سچی خوشی تھی۔ اور میں یہی دیکھنا چاہتی تھی اُن کے چہرے پر کیا ہوا وہ ہم سے جدا ہوگئیں...... خوشی کی بات یہ ہے کہ اُن کی دلی خواہش پوری ہوگئی۔ میں کھانا لگانے لگی ہوں...... سب منہ ہاتھ دھوکر آجاؤ پھر ہمیں گرینڈ پاپا کے ہاں بھی جانا ہے۔ تم دونوں کا دل بہل جائے گا میں رومی کو کال کرتی ہوں۔'' سب بے دلی سے کھانا کھانے بیٹھ گئے کیری نے رومی کو فون کیا۔

''سوری ماما...... آج ہماری ایکسٹرا کلاسز ہورہی ہیں میں نہیں آسکوں گا۔''

''چلو بیٹا کوئی بات نہیں...... پھر کبھی سہی۔'' کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں وکٹر کی طرف جانے کے لیے کیری کی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ٹونی اور شیری ایکسائیٹڈ تھے جبکہ کیری آنٹی کے جانے پر ابھی تک افسردہ تھی۔

☆......☆......☆

رومی فکرمندی کے عالم میں جانی کے کمرے میں آیا پاپا وہاں نہیں تھے۔ باہر آیا تو لاؤنج میں ٹہل رہے تھے۔

''پاپا...... اتنا ٹائم ہوگیا ماما اور ٹونی شیری ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟'' جانی نے رک کر اسے دیکھا۔ رومی نے جانی کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ تو دل میں ہزاروں خدشے ناگواری سے سر اٹھانے لگے۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں...... اتنی دیر تو کیری نے کبھی نہیں لگائی......'' جانی نے فکرمندی سے انگلیاں اپنے بالوں میں پھیر کر کہا۔

''پاپا ماما اتنی غیر ذمہ دار نہیں ہیں ...... اگر کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہوتی تو وہ ہمیں کال کرکے ضرور بتاتیں......'' جانی نے پُرسوچ انداز میں اپنے بیٹے کی فکرمندی دیکھی تو اُسے تسلی دینے لگا۔

''تم فکر نہ کرو بیٹے یقیناً ایسی بات ہوگی کہ کال کرنا بھول گئی۔''

''تو آپ کال کرلیتے...... میں پوچھوں؟''

''نہیں رہنے دو...... میں نے کیا تھا...... فون بند جارہا ہے...... ابھی تھوڑی دیر بعد پھر کروں گا۔'' اس نے رومی کے سامنے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی۔

''پاپا...... کال کرتے رہیں جب تک ماما اٹھاتی نہیں۔'' اب جانی اسے کیا بتاتا کہ وہ کوئی پچاس مرتبہ

تو کال کر ہی چکا تھا۔
''وہ نہیں اٹھا رہیں تو شیری یا ٹونی کو کر لیتے ہیں۔'' وہ جلدی سے نمبر ملانے لگا..... شیری کا فون بند تھا اس نے ٹونی کا نمبر ملایا وہ بھی بند تھا۔
''پاپا..... کچھ ٹھیک نہیں ہے.....'' وہ مضطرب انداز میں بولا۔ جانی کا چہرہ فکر سے بے رنگ ہو رہا تھا۔ رومی نے اسے کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور پانی کا گلاس لے آیا ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔
''پاپا..... ہمت سے کام لیں..... اور اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتائیں میں اب بچہ نہیں ہوں چھبیس سال سے زیادہ عمر ہوگئی ہے میری۔''
''بیٹا..... میں تم سے کیوں چھپاؤں گا..... تم تو میرا مضبوط بازو ہو..... لیکن مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا..... کیری نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا..... وہ کبھی اتنی غیر ذمہ دار نہیں رہی..... میں حیران ہوں کہ وہ کال کیوں نہیں کر رہی..... اور ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔''
''میں جا کر پتہ کرتا ہوں۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
''کہاں جاؤ گے؟''
''وکٹر بریڈ کے گھر.....'' رومی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
''نہیں.....'' جانی نے کھڑے ہو کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔
''تم اس کے گھر نہیں جاؤ گے..... اور تم کیسے جانتے ہو اس کا گھر کہاں ہے؟''
''پاپا..... ان کے گھر کو کون نہیں جانتا..... میں ہزاروں بار اس مینشن کے سامنے سے گزرا ہوں۔''
''پھر بھی تم وہاں نہیں جاؤ گے..... اگر کیری اور بچے وہاں جا کر کسی مصیبت کا شکار ہوئے ہیں تو میں تمہیں وہاں نہیں جانے دے سکتا۔''
''تو پاپا کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟'' رومی بے کلی سے بولا۔
''ابھی تھوڑا اور انتظار کر لو..... پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔''
''پاپا جتنی دیر کریں گے..... مجھے ڈر ہے کوئی نقصان نہ ہو جائے میں اس شخص کو جانتا ہوں وہ شیطان صفت انسان کچھ بھی کر سکتا ہے..... اُس نے پہلے بھی ایک بار ماما کو ہم سے چھین لیا تھا..... اور اب تو ماما کے ساتھ شیری اور ٹونی بھی ہیں۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے پھر ہمیں پولیس کے پاس جانا ہوگا۔''
''پاپا پولیس ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد اپنا کام شروع کرتی ہے..... کیا آپ اتنی دیر انتظار کر سکتے ہیں۔''
''چلو پھر چلتے ہیں۔'' دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہی ہوا جس کا رومی کو ڈر تھا۔ انہوں نے اپنا پروسیجر بتایا تو رومی بے قراری سے بولا۔
''آپ کی بات تو ٹھیک ہے سر..... لیکن آپ تو وکٹر بریڈی کو جانتے ہیں اگر دیر ہوگئی تو وہ شخص کچھ بھی کر سکتا ہے..... میری ماما اور بہن بھائی خطرے میں ہیں۔''

''وکٹر بریڈی......'' آفیسر چونک گیا۔
''وہ مشہور ڈرگ ڈیلر اور اسمگلر......تم کہیں اُس کی بات تو نہیں کر رہے؟'' دوسرے آفیسر نے بھی الرٹ ہو کر کہا۔
''جی سر...... وہ میری ماما کے فادر ہیں...... ماما اور شیری ٹونی اُن سے ملنے ہی گئے تھے...... ماما نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔''
''وہ اپنی بیٹی کو کیوں نقصان پہنچائیں گے؟ اور اپنے گرینڈ چلڈرن کے ساتھ کیوں کچھ برا کریں گے۔''
''آپ تو اُسے جانتے ہیں...... وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں...... ایک بار پہلے بھی ماما کو زبردستی ساتھ لے گئے تھے اور تین سال اپنے گھر میں زبردستی رکھا تھا...... آپ پلیز چیک تو کریں وکٹر بریڈ کا گھر......'' آفیسر سوچ میں پڑ گئے۔
''ہم زیادہ پریشان اس لیے ہیں سر کہ تینوں سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔''
''ہماری ماما بالکل بھی غیر ذمہ دار نہیں ہیں...... اگر وہ اپنی مرضی سے دیر کرتیں تو ہمیں ضرور انفارم کرتیں...... لیکن اب تو کئی گھنٹے گزر گئے ہیں...... کوئی گڑبڑ ضرور ہے...... آپ تو چیک کر سکتے ہیں۔'' وکٹر بریڈی کو ہر پولیس والا زیر حراست لینا چاہتا تھا اسی لالچ میں وہ چلنے پر تیار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد پولیس کی دو تین گاڑیاں وکٹر بریڈی کے گھر جا رہی تھیں دو جانی کی گاڑی کے آگے اور ایک اُس کی گاڑی کے پیچھے تھی۔ مینشن سے کچھ دور پولیس والوں نے گاڑی روکی اور ان دونوں کے پاس آئے۔
''آپ دونوں کو یہیں رکنا ہوگا......ہم اندر جا کر پتہ کرتے ہیں۔''
''سر ہم بھی ساتھ جانا چاہیں گے۔'' رومی نے باہر نکل کر کہا۔
''میری ماما اور دو بہن بھائی اندر ہیں۔''
''ہم آپ کی پریشانی سمجھتے ہیں...... لیکن اندر ہمیں کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا ہم نہیں جانتے...... آپ کی حفاظت ہمارا فرض ہے ہم نہیں چاہتے آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔''
''ہمیں کوئی پرواہ نہیں سر......'' رومی بے انتہا فکر مند تھا۔
''لیکن ہمیں تو ہے...... یہ دونوں گاڑیاں جو آپ دیکھ رہے ہیں ان میں اس طرح کی سچویشن کے لیے ٹرینڈ لوگ ہیں...... آپ کو ہر صورت یہیں رکنا ہے ہم جتنی جلد ہو سکے آپ کو صورت حال سے آگاہ کریں گے۔'' وہ چلے گئے اور رومی بے بسی سے انہیں دیکھتا ہوا واپس اپنی سیٹ پر آیا اور پریشانی سے جانی کی طرف دیکھا...... جو بالکل چپ پتھر کے بت کی مانند بیٹھا تھا......اس کا چہرہ اور آنکھیں کسی طوفان کی زد میں تھیں۔
''پاپا...... پلیز خود کو سنبھالیں...... ماما کو کچھ نہیں ہوگا۔ ٹونی اور شیری بھی بالکل ٹھیک ہوں گے انشاء اللہ......اگر آپ اس طرح ہمت ہار بیٹھیں گے تو میں کیا کروں گا...... مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' جانی نے دکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''تم میری طاقت ہو رومی...... مجھے ہمت نہ ہارنے دینا'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کی طاقت ہیں......'' رومی نے جانی کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔

''ہمیں یہاں بیٹھ کر مسلسل دعائیں کرنی ہیں...... خدا ہمارے پیاروں کو محفوظ رکھے...... وہ جلدی ہم سے آملیں۔'' گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں بے چین اور مضطرب تھے دونوں کے دل میں انجانے خدشات اور وسوسے تھے۔ دل بے قابو ہو کر دھڑک رہا تھا لیکن دونوں مضبوط مرد تھے اور ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

زبان پر دعائیں تھیں اور دل پر وہ سارے آنسو گر رہے تھے جو آنکھیں گرنے نہیں دے رہی تھیں ایسا خوف بھرا سناٹا تو انہوں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا تو رومی کا صبر جواب دے گیا۔

''اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے پاپا...... پولیس کو اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔''

''اتنی بڑی مینشن ہے...... تلاشی لیتے ہوئے کافی وقت لگے گا۔'' جانی بمشکل کہہ سکا۔ کچھ دیر بعد پولیس آفیسر اندر سے برآمد ہوا۔ اور تیز رفتاری سے چلتا ہوا ان کے قریب آیا۔ رومی جلدی سے باہر آیا اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اندر تو کوئی نہیں ہے...... ہم نے ہر جگہ دیکھ لی...... پوری مینشن خالی ہے۔ کوئی ملازم تک موجود نہیں ہے...... ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے...... ایسا بالکل نہیں لگتا کہ کسی کے ساتھ کوئی زور زبردستی کی گئی ہو...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ماما اور بہن بھائی اپنی مرضی سے وکٹر بریڈی کے ساتھ کہیں گئے ہوں؟''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ ہمیں اطلاع ضرور دیتے...... اور یوں بھی کیا آپ کو عجیب بات نہیں لگ رہی کہ پوری مینشن میں کوئی ملازم موجود نہیں...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ سب ایک ہی وقت میں کہیں غائب ہو جائیں...... ضرور کوئی گڑبڑ ہے آفیسر...... مجھے تو یہ بات بہت پُراسرار لگ رہی ہے۔''

''کیا مینشن میں کوئی خفیہ جگہ ہے' جو ہماری نظروں میں نہ آسکی ہو۔''

''ہم دونوں کبھی اندر نہیں گئے سر...... ہم وکٹر بریڈی سے کبھی نہیں ملے۔''

''ویری اسٹرینج...... یہ کیسے ممکن ہے۔''

''ماما نے پاپا سے وکٹر بریڈی کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ جب وہ جیل میں تھے۔ انہوں نے اس شادی کو اور پاپا کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اس لیے ہم کبھی یہاں نہیں آئے۔'' رومی بے حد سنجیدہ تھا۔

''آپ کو اب گھر جانا ہوگا...... ہم اپنی تفتیش جاری رکھیں گے...... جیسے ہی کوئی کلو ملا آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔''

''لیکن آفیسر......'' رومی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جانی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''ہم ماما کو ساتھ لیے بغیر کیسے جائیں...... آپ کو انہیں تلاش کرنا ہوگا...... آپ کے خیال میں اُن کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ینگ مین...... دو تین چیزیں ہو سکتی ہیں...... یا تو وہ وکٹر کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا سر...... ماما بتائے بغیر کہیں نہیں جاتیں...... کیا وہ سارے ملازموں کو بھی ساتھ لے گئے ہیں۔''

''دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ وکٹر انہیں گن پوائنٹ پر ساتھ لے گیا ہو اور تیسری بات یہ ہوسکتی ہے
کہ کوئی اور اُن سب کو گن پوائنٹ پر لے گیا ہو۔''
''لیکن کیوں سر؟'' رومی خوفزدہ ہو گیا۔
''اس کا مطلب ہے اُن کی زندگی خطرے میں ہے...... ان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''
''گھبرانے اور بری بری باتیں سوچنے کی بجائے آپ لوگ گھر جائیں...... اور ہماری تفتیش کا انتظ
کریں۔'' آفیسرز گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تو وہ بوجھل دل لیے بادل نخواستہ گھر آ گئے۔ دونوں صو
پر یوں دکھی اور چپ بیٹھے تھے جیسے اُن کی زندگی میں کچھ نہ رہا ہو...... رومی کے دل میں جیسے آگ سی لگ
تھی۔

''وکٹر بریڈی...... تم میری ماما کو دوسری بار مجھ سے جدا نہیں کر سکتے۔'' رومی سے جانی کی طرف دیکھ
نہیں جا رہا تھا۔ پاپا اس قدر دل گرفتہ اور خاموش تھے جیسے اُن کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ دونوں کا غم یکساں
تھا۔ لیکن انہیں کسی نہ کسی طرح رات گزارنی تھی۔ رومی نے کچن میں جا کر پاپا کے لیے سینڈوچ بنایا پھ
دونوں کے لیے کافی بنائی اور ٹرے لے کر آ گیا۔
''بہت بڑا صدمہ ہے پاپا...... لیکن آپ کو کچھ کھانا ضروری ہے آپ کو انرجی چاہیے۔''
''میرے حلق سے کچھ نہیں اتر سکتا......'' انہوں نے بس اتنا کہا۔
''میں آپ کا بیٹا ہوں پاپا...... میں بھی اتنا ہی پریشان ہوں...... اور اگر آپ کو بھی کچھ ہو گیا تو میں ک
کروں گا...... آپ کو میری خاطر...... اپنے اس بیٹے کی خاطر کچھ کھانا ہوگا...... ابھی تو ساری رات جا
ہے۔ ہمت اور طاقت چاہیے ہمیں۔''
''پلیز میری خاطر......'' اس نے التجا کی تو جانی رد نہ کر سکا...... دونوں نے بڑی مشکل سے آدھ
آدھا سینڈوچ ختم کیا اور کافی پی...... آج کی رات سب راتوں سے بھاری تھی۔ وہ دونوں مرد تھے۔
مضبوط مرد...... آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے تھے تو کیا ہوا دل تو ان کی بارش سے بھیگا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

سرخیل اگر ساری رات اپنے زخموں کے ادھیڑے ہوئے ٹانکے سینے کی کوشش میں کانٹوں پر چلتا ر
تھا۔ تو کمرے میں وہ آرام دہ بیڈ نور کے لیے بھی پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ دونوں اپنے اپنے دکھوں او
پچھتاوؤں کی آگ میں جلتے قطرہ قطرہ کر کے رات گزارتے رہے۔ صبح کے قریب شاید دونوں کی آنک
ذرا سی دیر کے لیے لگی۔ پھر جانے خواب میں نور نے کل گزرنے والے تکلیف دہ واقعہ کی چبھن محسوس کی
کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی کافی دیر تک وہ خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ سرخیل کی خالی جگہ پر نظر پڑی
تو دل میں درد کی لہر سی اتری۔
''وہ اس کمرے سے باہر کیسے جائے گی؟''
''وہ سرخیل کا سامنا کیسے کرے گی؟''
''اس سے نظریں کیسے ملائے گی؟''

(جاری ہے)

ادارہ

سروے

لاک ڈاؤن نے آپ کی زندگی پر کیا اثر ڈالا......

عائشہ شفقت

جب ہم اسکول میں ہوتے ہیں۔ ہر قدم ہاتھ پکڑ کے چلایا جاتا ہے۔ جب پرائمری سے مڈل میں آتے ہیں تو پڑھائی پیادہ مسافر سے سائیکل سوار بن جاتی ہے۔ تب بھی ہمارا ساتھ دیا جاتا ہے۔ مڈل سے میٹرک میں اچانک بائیک تھما دی جاتی ہے۔ انٹر میں گاڑی میں جبکہ یونیورسٹی میں تو حد ہی کر دیتے ہیں...... ٹرین تھما دیتے ہیں' خود ہی چلاؤ پہلے ہم پر اتنی کرم نوازی ہوتی تھی کہ راستے کھلے ہوتے تھے اور سمجھا بھی دیا جاتا تھا کہ ان راستوں پر چلنا ہے۔ مگر لاک ڈاؤن نے تو ہم بچوں کو اس سے محروم کر دیا۔ تمام راستے بند کر کے کہتے ہیں ٹرین چلاؤ جیسے ایک فوجی سے سارا اسلحہ لے کر کہو جاؤ جا کے جنگ لڑو' اور پڑھائی کا میدان تو وہ میدان جنگ ہے جہاں کا مرا ہوا شہید نہیں نالائق کہلائے۔ مما کی زندگی کو لاک ڈاؤن سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا...... جبکہ اس لاک ڈاؤن نے مجھ جیسی معصوم طالبات کو خاص سے عام کر دیا۔

''بچی روز یونیورسٹی جاتی ہے۔''

''عائشہ ایم...... کام کر رہی ہے۔''

''اور اب نالائق گھر بیٹھی ہے۔'' ستم ظریفی تو یہ ہے کہ گھر کے کام بھی نہیں کرتی۔''

اس کڑے لاک ڈاؤن میں جتنا ساتھ ہمارے موبائل فونز نے دیا اس سے کہیں زیادہ ساتھ اماں ابا کی ڈانٹ اور طعنوں نے دیا۔

''ہر وقت موبائل میں لگی رہنا...... کبھی اپنا بھی پڑھ لیا کرو۔'' مگر ہم تو ٹھہرے اسٹوڈنٹ' اور اسٹوڈنٹ نے کبھی پڑھائی کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اماں ابا کے طعنوں کو کیسے اہمیت دیتے...... سو اس لاک ڈاؤن میں ہم زیادہ تر وقت موبائل کے جال (Internet) میں پھنسے رہے۔

کتابوں کو تو اس آس پر بستے میں محفوظ کر دیا کہ شاید حکومت کو ہم پر ترس آ جائے اور وہ ہمیں بغیر پڑھائی کے اور امتحان میں ڈالے بنا پاس کر دیں مگر وزیراعظم صاحب نے تو ہم یونیورسٹی

والوں سے سوتیلے بچوں والا سلوک کیا۔اب کتابوں کو دھوپ لگوانے کا سوچ رہے ہیں۔مگر امید کا دامن اب بھی نہیں چھوڑا' شاید.....شاید ہم پر بھی کچھ نظرِ کرم ہو جائے اور ہم بھی بنا امتحان کے کامیاب ہو جائیں امید پر دنیا قائم ہے۔

اور دوستو...... ابھی تھوڑی دیر پہلے باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ ایم کام کے فائنل امتحانات نومبر کے پہلے ہفتے میں متوقع ہیں سو ہم جو لاک ڈاؤن میں پڑھائی کو سنجیدگی سے نہ لے سکے۔ اب پڑھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ آپ سب ہمارے لیے دعا کیجیے گا۔

غزالہ رشید

وقت جب گزر رہا ہو تو یہ احساس نہیں رہتا کہ کیسے گزر رہا ہے لیکن جب وہ گزر جاتا ہے تب اس کی کیفیت ہم پر آشکار ہوتی ہیں۔ کتابوں میں ضرور پڑھا تھا کہ طاعون کی وبا پھیلی تھی شاید چوہوں کی وجہ سے' خیال آیا کہ وبا کا تعلق میں 'چ' بہت اہم ہے۔ چمگاڈر' چوہے' چین' اور پھر کیسا چین کہاں کی چستی......اثرات بھی کچھ ایسے......

دیر تک سونے کے شوقین بستر چھوڑنے پر راضی نہیں لہٰذا ناشتے کی بچت...... اور کھانے پر اہتمام کی تھیوری' ہم نے پہلے ہی ماہ میں دریافت کرلی۔

گھر والے آپس میں بات چیت کرنے لگے۔کب تک......سوشل میڈیا کو انجوائے کرتے' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ خیال آنے لگا کہ کہاں آتے تھے ہم......گھر میں قید رہتے۔

ناراضگی کا تو سوال ہی نہیں تھا جاتے تو کہاں جاتے۔ رشتے داروں نے سکھ کا سانس لیا۔ شادیاں سادگی سے ہونے لگیں۔ لیکن رمضان اور عید پر...... اداسی نے ہر گھر پر دستک دی...... کیونکہ محبت اور رنجش کا تعلق ملنے جلنے سے ہے۔

جو گلے ملنے سے گھبراتے تھے وہ ہاتھ ملانے سے بھی گئے۔ شاپنگ مال کے شوقین خواتین و حضرات کی جان پر بن آئی۔تو فوڈ پانڈا...... نے بڑھ کے مدد کی۔لیکن سچ پوچھیں تو گھر میں رہنے کی کچھ ایسی عادت ہو چلی ہے کہ اب کوئی دعوت نامہ ملے تو پہروں سوچنا پڑتا ہے۔اور بھی کچھ بدلا لیکن سچ پوچھیں تو پہلے بھی صرف باتیں اور سیاست دانوں کی گھاتیں اور آج بھی وہی سب کچھ جبکہ بچپن سے سنتے تھے...... حالات بدل جائیں گے لیکن......!

خولہ عرفان

اس پورے عرصے میں جب کہ دنیا صرف ایک نکتے کے گرد گھوم رہی تھی جو تھا موت کا خوف اور اس سے بچنے کی احتیاطی تدابیر تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی جسے ہم رنگین کہتے ہیں وہ حقیقتاً بڑی سنگین ہے اور رشتے جنہیں ہم وبال جان سمجھتے ہیں وہ ہی اہم ترین ہیں۔

ہمہ وقت مصروفیت کی گرد تلے اپنی اصل خوبصورتی جو رشتے کھوتے جا رہے تھے۔اللہ نے لاک ڈاؤن کی صورت میں ان رشتوں کے قریب ہونے کا موقع فراہم کیا۔

اس لاک ڈاؤن نے جہاں اپنے ہر عمل کا گہرائی سے جائزہ لینے کا موقع دیا وہاں دبے قدموں گھروں میں اسلامی تہذیب و اقدار کو ڈبلیو' ایچ' او کا جدید چولا پہن کر ماسک لگانے، ہاتھ دھونے کا اہتمام کرنے اور چھینکتے و کھانستے ہوئے منہ پہ ہاتھ رکھنے کی صورت میں پورے طمطراق سے براجمان ہوتے اور ایک مسلمان کی شناخت ہاتھ ملانے اور گلے لگنے جیسی رسومات کو رخصت ہوتے بھی دیکھا۔ جسے اللہ نے دلوں

سے کینہ وکدورت دور کرنے کا علاج بتایا تھا۔
میں اگر وسیع النظری سے جائزہ لوں اور ایک لبرل مسلمان کی طرح سوچوں جسے اللہ پر یقین اپنی تدابیر اختیار کرنے کے بعد آتا ہے تو جو کچھ ہو رہا ہے وہ مجھے بالکل صحیح لگے گا لیکن اگر بلیغ النظری سے سوچوں تو یہ میرے رب کے احکامات اور نبی کی سنت ہے جس پر ڈبلیو ایچ او کے احکامات کی صورت میں عمل درآمد کرانے کی کوشش کر کے ہمارے بچوں کے کچے ذہنوں سے اللہ ورسول کے احکامات کو غیر محسوس طریقے سے نکالا جا رہا ہے۔ جسے آپ برین واشنگ یعنی ذہن سازی کہہ سکتے ہیں۔ سوشل ڈسٹینس کے نام پر تھوڑی بہت محبت اور بھائی چارگی رشتوں میں جو رہ گئی تھی۔ جسے اسلامی معاشرے میں رشتوں کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔

دوسری طرف میں نے رب کائنات کو بہت احسن طریقے سے لوگوں کے سینوں میں موجود اپنے گھر کو پھر سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرتے محسوس کیا۔

ہر انسان جدید سہولیات سے آراستہ گھر میں ایک آرام دہ زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق وقتاً فوقتاً فرسودہ چیزوں کو جو اس کے گھر کی خوبصورتی کو متاثر کرتی محسوس ہوتی ہیں نکالتا رہتا ہے اور اپنے گھر کو سجاتا وسنوارتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں رینوایشن کرواتا ہے۔ فرنیچر بدلتا ہے۔ کبھی گھر کی کلر اسکیم چینج کرتا ہے۔ کبھی انٹیریئر ڈیکوریٹرز کی مدد سے امپورٹڈ سامان کے ساتھ گھر کی خوبصورتی بڑھاتا ہے۔ بالکل اسی طرح رب اللہ اپنے گھر کو جو ہمارے سینوں میں دھڑکتا ہے رینوایٹ کرنا چاہتا ہے تو اس کو ان تمام حاسدانہ، متکبرانہ اور بدگمانی وغیبت جیسے فاسد خیالات سے جو اس کی خوبصورتی کو متاثر کر رہے ہوتے ہیں پاک کر کے عاجزانہ، مخلصانہ اور خشیت الٰہی جیسے خوبصورت احساسات اور جذبات سے مزین کر دیتا ہے۔

اور عاجزی وخلوص وخشیت الٰہی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان میں اپنی اصل حیات (موت) کو یاد کرتا ہے۔

تو بس میرے نزدیک لاک ڈاؤن اور Covid19 درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اپنے گھروں کو رینوایٹ کرنے کی اسکیم تھی یا ہے۔

اب بس اندر جھانک کر یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے گھر کے اندر بھی اللہ نے رینوایشن کی اگر دل میں نفرتوں کا گذر نہیں اور محبتیں سلامت ہیں تو سمجھ لیں۔ آگے کے راستے صاف ہیں کہ اللہ محبتوں وخلوص والے گھر میں رہنا پسند فرماتا ہے۔ پر فضا مقام پر ہر کوئی قیام کا خواہاں ہے تو بس اللہ کے قیام کے لیے اپنے اس دل کو سب کدورتوں سے صاف کر لیں کہ اللہ کے لیے سب سے پسندیدہ مقام انسان کے اندر یہی تو ہے۔ جتنا درد سے بھرا اور کدورتوں سے پاک ہوگا اتنا ہی مقبول ہوگا کہ اللہ جانتا ہے دنیاوی رشتے سب سے زیادہ اس دل کو ہی دکھاتے ہیں جبھی اس نے صلح رحمی کا راستہ دکھایا کہ تلخ رویوں کو پی جانا آسان نہیں ہوتا یہ انسان کو اندر تک جلا دیتے ہیں۔ تو وہ وہاں موجود رہتا ہے کہ مجھ سے لے لینا ان کے برے رویوں کا بدلہ یوم حساب۔

بس منزہ...... بڑا کڑا وقت ہے۔ جو بات سمجھتا ہے اس سے بات کر لیتے ہیں جو نہیں سمجھتا تو دعا ہے۔ اس لاک ڈاؤن میں اللہ نے مجھے خود سے ملا دیا اور اپنا یقین پختہ کرا دیا۔ دعا ہے

کے دلوں کو اللہ ڈیکوریٹ کر دے۔ آمین

افسر سلطانہ

لاک ڈاؤن نے ہم پر اور ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ یہ تو پتہ تھا اگلے لمحے کی سانس کا بھروسہ نہیں ہوتا لیکن یہ بات ذہن میں نہیں تھی کہ آپ گھر میں قید ہو کر دنیا سے بھی کٹ سکتی ہیں لوگ آپ سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔ عمر رسیدہ لوگوں کی چاندی ہو جائے گی۔ بچے موبائل لیے تھک کر ان کے پاس بیٹھنا پسند کریں گے۔ اب یہ ان کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے وقت گزارے بھی۔ اس لاک ڈاؤن نے ذاتی طور بھی تھوڑا کاہل بنا دیا۔ ناشتہ کیا فیس بک پر پوسٹ لگائی لیپ ٹاپ اٹھایا سرچنگ کی کاپیوں کے ڈھیر کو بہت کم لفٹ کرائی۔ ویسے الحمدللہ واک کا ٹائم خوب ملا۔ اپنی ڈرائنگ روم کو پارک سمجھا' باہر تو پابندی تھی وہ بھی ماسک لگا کر اوپر سے چشمہ' اکثر گرتے گرتے بچی ہوں اور ہاں اپنا آسٹریلین طوطوں کی بہت خدمت کی۔ دیکھو تم نے سب سے لکھنے کا کہا تھا مجھ سے نہیں پھر بھی میں نے انٹری مار دی۔ کبھی کھوٹہ سکہ بھی کام آ جاتا ہے خوش رہو۔

فائزہ مشتاق

یہ شاید انسانی سرشت ہے کہ وہ اپنے گرد موجود شے کی اہمیت و وقعت کا اندازہ اس کو کھونے اور دور ہو جانے کے بعد کرتا ہے۔ لاک ڈاؤن جہاں کرہ ارض کے لیے پریشانی کا باعث رہا ہے ساتھ ہی ساتھ بہت کچھ سکھا گیا۔ کبھی آپ کے آس پاس نعمتوں کا حصار ہوتا ہے لیکن قدر نہیں ہوتی' معاملہ لاک ڈاؤن سے قبل میرے ساتھ تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوران مجھے زندگی کی حقیقت کو قدرے قریب سے سمجھنے کا موقع ملا اور ادراک ہوا کہ انسان صحیح معنوں میں سوشل اینیمل ہی ہے۔ لازمی نہیں کہ ہمارے گرد لوگوں کا ہجوم ہی ہمیں سوشل بناتا ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے ہے کہ ہمارے اطراف دوڑتی بھاگتی زندگی ہی ہماری سانسوں کو دوڑائے رکھتی ہے، ان رونقوں سے ہم لاکھ نا چاہنے کے باوجود جڑے ہیں، یہ بے ہنگم شور ہمارے لہو کو گرماتا ہے، ہماری نفسیات کو متحرک رکھتا ہے، یہی روٹین جس سے ہم بیزار دکھائی دیتے ہیں، دراصل آکسیجن کی مانند ہے۔ بس یہی سیکھا کہ زندگی سراسر شکر گزاری سے عبارت ہے جو کر گیا، وہ جی گیا۔

فرحی نعیم

آپ کا سوال ہے، لاک ڈاؤن نے ہماری زندگیوں پر کیا اثر ڈالا، تو ورکنگ وومن کی زندگی کی تو خیر کایا ہی پلٹ گئی ہوگی۔ لیکن ہم جیسی کسی حد تک گھریلو خواتین کے شام وسحر بھی کچھ نہ کچھ تو متاثر ضرور ہوئے۔ میاں اور بچوں کا مستقل گھر ہونا، گھر کے کاموں کی مصروفیت، اور اس میڈیا کا چوبیس گھنٹے کا واویلا، آج اس ملک میں اتنے اور اس میں اتنے' اس وقت بحیثیت مسلمان، اللہ سے اپنے تعلق پر اطمینان بھی ہوا اور فخر ومسرت بھی، جس کی وجہ سے اس خوف کی فضا میں بھی، ویسا ڈر نہ تھا، احتیاط اپنی جگہ، اللہ پر بھروسہ اپنی جگہ، میں تو صبح' شام کی دعائیں پڑھ کر مطمئن ہو جاتی۔ اس کے علاوہ کوشش کی کہ عام دنوں میں جب اپنی کلاسس کی مصروفیت کی وجہ سے کتابیں چاہنے کے باوجود نہیں پڑھ پاتے، ان سے دوستی کر لی جائے۔ بس دعا ہے، اللہ تعالیٰ ساری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کر دیں اور پوری انسانیت کو محفوظ کر دیں۔ آمین۔

تحسین انجم

اسلام وعلیکم نومبر 2019 میں پاکستان گئی کرونا وائرس کی آمد آمد تھی' اس وقت تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا' پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ چین سے نکلا اور پوری دنیا میں پھیل گیا۔ میں گھر سے باہر کم ہی نکلتی ہوں اس لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہاں سے بیٹی کے پاس نیدرلینڈ گئی تو دو ہفتے بعد امریکا اور یورپ کی دوطرفہ پروازیں غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو گئیں۔ وہاں میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں نے سوچا ناول لکھنا

شروع کر دیا۔اس میں نیدر لینڈ کے بارے میں بھی مواد ڈالا' ناول وہیں پر ختم کیا۔آخر کار کرونا تھوڑا کم ہوا فوراً واپس آ گئی' اب تو کرونا سے خاص فرق نہیں پڑتا' باہر جاتے ہیں تو بس احتیاط کی ضرورت ہے' ماسک پہنیں اور گھر آ کر جراثیم کش لوشن لگائیں اور بس' اب سوچ رہی ہوں ایک اور ناول شروع کر دوں' خاکہ تو دماغ میں بنایا ہوا ہے' بس کرونا کے ساتھ ایڈجسٹ کرلیا ہے۔

نفیسہ سعید

کرونا کے سبب لگائے جانے والے لاک ڈاؤن نے تقریباً پوری دنیا کو متاثر کیا اور ہر شخص کی زندگی میں اس لاک ڈاؤن نے مثبت اور منفی تبدیلیاں پیدا کی۔جس طرح دوسرے لوگ اس سے متاثر ہوئے ویسے ہی میری زندگی میں بھی کافی تبدیلی آئی جس میں سرفہرست سستی اور کاہلی ہے۔میری جیسی ایکٹو بندی کا اب دل ہی نہیں چاہتا گھر سے باہر نکل کر کوئی کام سر انجام دیا جائے سمجھ نہیں آرہا اسکول شروع ہوں گے تو دوبارہ روٹین کیسے سیٹ ہو گی؟ لکھنے کے حوالے سے بھی ذہنی کاہلی کا شکار ہوں لگتا ہے زندگی رک گئی ہے۔تخلیقی عمل آخری سانسیں لے رہا ہے' ایک جمود سا چھا گیا ہے' الفاظ گم ہو گئے ہیں۔شروع کے تین ماہ بہت کوکنگ' بیکنگ کی' لیکن اب اس سے بھی دل اوب گیا ہے لہٰذا یہ عمل بھی لاک ڈاؤن سے پیدا شدہ کاہلی کی نظر ہو گیا۔مثبت تبدیلی یہ آئی ذاتی اخراجات بہت کم ہو گئے دوسروں کی مشکلات کا احساس بڑھ گیا۔لاک ڈاؤن نے دل نرم کر دیا اللہ پر یقین میں کئی گنا اضافہ ہوا اس پروردگار کا خاص کرم ہے ہم پر جو اس وبائی مرض سے بچ نکلے الحمدللہ۔

مریم شہزاد

لاک ڈاؤن سے اندازہ ہوا کہ زندگی بہت آسان اور سادہ ہے اس کو ہم نے مشکل بنایا ہوا ہے، ہم بہت سی چیزوں کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں، کتنی ہی مرنے جینے کی رسومات کی ضرورت نہیں رہی تھی، شاپنگ بے مصرف ہو گئی تھی کہ جب کہیں آنا جانا ہی نہیں تو نئے جوتے، کپڑے، پرس، عبایا، کیا کریں گے جمع کر کر کے، بلکہ جو الماریاں بھری ہوئی ہیں ان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ سامان سو برس کا اور پل کی خبر نہیں، مگر اب لاک ڈاؤن ختم ہو جائے گا تو شاید پھر سب ویسا ہی ہو جائے گا آثار تو یہی بتا رہے ہیں، مگر ایک بات طے ہے کہ سمجھنے والے سمجھ گئے ہیں کہ ضرورتوں اور آسائشوں میں، اور سادگی اور دکھاوے میں کیا فرق ہے بقول شاعر

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

فرح اسلم قریشی

تیزی سے گزرتی زندگی پر قدغن لگا کر اس کی رفتار کو قابو کرنے کی ایک کوشش لاک ڈوان کی صورت میں سامنے آئی۔کاروبار بند، تعلیمی ادارے بند، تفریح گاہیں، پبلک ٹرانسپورٹ سب بند، تعلق توڑنے والوں کے ہاتھ سنہری موقع آیا، اور گوشہ نشینوں کو ماحول۔ خاموشی، سناٹا، فراغت سہیلیاں بنیں اور میل ملاپ، تعلقات، ہلچل ان کی رقیب......

ٹھہری ہوئی پژمردہ، خوف و اندیشوں میں مبتلا زندگی رونقوں کی تلاش میں سرگرداں، درودیوار سے سر مارتی رہی، ایسے میں ناممکن تھا کہ حساس طبیعت اس کے زیر اثر نہ آتی، کاروبار زندگی ہی نہیں معمولات بندگی میں بھی فرق آیا...... دنیا سے دوری نے خالق دنیا کے قریب کر دیا۔یوں زمینی لاک ڈاون روحانی لاک ڈاون کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ اس لاک ڈاون نے میرے دنیاوی رابطوں کو بھلے کمزور کیا ہو لیکن میرے روحانی رابطے جو کب سے لاک ڈاون کا شکار تھے انہیں بحال کر دیا۔الحمدللہ۔

صائمہ نفیس

وہ باتیں تیری، وہ فسانے تیرے

آج کی شخصیت ظہورالاسلام جاوید

ظہورالاسلام جاوید ۹ فروری ۱۹۴۸ء کراچی کے علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں ہی حاصل کرتے ہوئے ۱۹۶۳ء میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ نانا الیاس گوالیاری، ماموں مظہر گوالیاری اور ولد انعام گوالیاری کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا کہ شاعری کی جانب رغبت نہ رکھتے چنانچہ ۱۹۶۵ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ایم ای ایس ملٹری انجینئرنگ سروسز میں ملازمت اختیار کی اور تبادلہ چٹا گانگ (سابق مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش) ہو گیا۔ ملازمت اور شاعری ساتھ ساتھ چلتے رہی۔ ملازمت کرتے ہوئے چند ہی برس بیتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہو گئے اور ۱۹۷۱ء میں



پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ زندگی مصائب اور آسائش سے عبارت ہوتی ہے، ظہورالاسلام جاوید کی زندگی میں جب مصائب کا دور آیا تو انہوں نے جرات مندی سے نہ صرف ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا بلکہ نہایت دانشمندانہ فیصلے کر کے زندگی کو دوبارہ ہموار راہ پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ کراچی آ کر اسی ادارہ میں دوبارہ ملازمت جاری رکھی۔ ۱۹۷۴ء میں دبئی آ بسے، جونہی زندگی میں اطمینان نے بسیرا کیا۔ ظہورالاسلام جاوید نے دبئی کے صحرا میں مشاعروں کے گلاب کھلانا شروع کر دیئے ان گلابوں کی خوشبو میں دنیا بھر سے شاعروں مدعو کیا جاتا جو ان مشاعروں میں شرکت کرنا ایک اعزاز

مانتے۔ یوں دنیا بھر میں اچھا شعر کہنے والا شاعر کہیں بھی بستا ہو ظہورالاسلام جاوید کی پارکھی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ ان مشاعروں کو کسی شاعر کے نام کے



ساتھ منسوب کر کے جشن کا نام دیا۔

مشاعرے کے انتظام و انصرام میں آپ کا ایک خاص مقام ہے جو آپ کو ممتاز کرتا ہے۔ مگر جب آپ سے ان سب کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ اسے اُردو زبان سے محبت گردانتے ہیں اور اپنے کام کو اُردو زبان کے فروغ کے لئے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ آپ کا ایک مجموعہ کلام 'موسم کا اعتبار نہیں' ۲۰۰۲ء میں منظر پر آچکا ہے۔ عالمی سطح پر مشاعروں میں آپ کا مدعو کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ شعر کی دنیا میں آپ کی شاعری کے دلدادہ موجود ہیں جو کلام بہ زبانِ شاعر بار بار سننا پسند کرتے ہیں اور سراہتے ہیں۔

دبئی میں 'نوائے وقت' کی جانب سے 'مجید نظامی ایوارڈ'، انجمن فروغ اُردو ادب دوحہ قطر کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں اعزازی شیلڈ، اُردو اکیڈمی لندن کی جانب سے اعزازی شیلڈ، اُردو مرکز جدہ کی جانب سے اعزازی شیلڈ، انجمن فروغ اُردو ادب دوحہ قطر جی جانب سے اعزازی شیلڈ ۲۰۱۴ء، پاکستان ایسوسی ایشن دبئی کی جانب سے اُردو ادب کی خدمت پر 'جشنِ پاکستان ایوارڈ'، سفارتخانہ



پاکستان کی جانب سے اُردو لٹریچر پر پاکستان ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

ان کا تعارفی قطعہ

میں یہ سمجھا کہ کوئی نرم زمین آپہنچی
غور سے دیکھا تو وہ پاؤں کے چھالے نکلے
آج کے دور کے سقراط پہ کیا ہو گا اثر
اپنی ہی ذات میں جو زہر کے پیالے نکلے

انٹرویو اور کلام بہ زبانِ شاعر

سوال:۔ بیرون ملک میں روزگاہ کی مشقت کرتے ہوئے اپنی شناخت بنانا کیا یہ مشکل ہے؟

☆ظہورالاسلام جاوید: زندگی میں یوں تو کچھ بھی آسان نہیں لیکن اگر آپ کی نیت صاف ہو اور حوصلے بلند ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل حال ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے روزگار کے مواقع عطا کیے کہ ادبی سرگرمیوں کے لئے وقت نکالنا مشکل نہیں رہا میں اپنا کام کرتا رہا اور قدرت مجھے نوازتی رہی۔

آپ ہمارے پڑھنے والوں کو اپنا کلام عطا کیجیے۔

ظہور الاسلام جاوید: یہ اشعار عمرہ کے دوران کہے تھے سب سے پہلے یہی سناؤں گا۔

صحن کعبہ میں کھڑا ہوں وسعتوں کے درمیاں
اک تماشہ بن گیا ہوں حیرتوں کے درمیاں
پھر وہی شہر کرم ہے پھر وہی دستِ طلب
پھر وہی میں ہوں یہاں پر رحمتوں کے درمیاں
آج باطل مٹ گیا۔۔۔ حق آنے کو ہے
کہہ رہا تھا کوئی کعبے میں بتوں کے درمیاں
پا برہنہ کیوں کھڑا ہوں شہر ابراہیم میں
ڈھونڈتا رہتا ہوں کیا دو پربتوں کے درمیاں
سبز ہو پیلی ہو یا رُت ہو کسی بھی رنگ
اُس کا جلوہ کارِ فرما سب رُتوں کے درمیاں

سوال: آپ عالمی سطح کے مشاعرے منعقد کراتے ہیں اور پوری دنیا سے شعراء کو مدعو کرتے ہیں ان مشاعروں کا انتظام اور شعراء کے انصرام کا بندوبست یہ سب کیسے ممکن ہوتا ہے؟

☆ظہور الاسلام جاوید: (جواب دینے سے پہلے انہوں نے ایک سوال کر دیا) آپ کے کتنے ہاتھ ہیں؟ (میں نے حیرانگی سے بے ساختہ کہا دو) بالکل اسی طرح میرے بھی دو ہی ہاتھ ہیں مگر میں مشاعرے کا قصد کرتا ہوں تو میرے ساتھ بہت سے دوسرے ہاتھ بھی مل جاتے ہیں جو میرے کام کو اتنا آسان بنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اتنا کرم ہے کہ سب لوگ مجھ پر اپنا اعتماد دیکھا کر میرا مان رکھتے ہیں اس طرح میرا کام آسان ہو جاتا ہے۔

سوال: شعراء کا انتخاب کے لئے آپ کا معیار کیا ہوتا ہے؟

☆ظہور الاسلام جاوید: شاعری عطیہ خدا وندی ہے۔ اس کے معیار و پیمانے مختلف ہو سکتے ہیں ،مگر بنیادی نکتہ جذبات واحساسات کا اظہار ہر معیار و پیمانے میں برقرار رہتا ہے۔ جس بھی شاعر کے کلا[م] میں جذبات واحساسات کا اچھوتا رنگ ہوتا ہے و[ہ] انتخاب ہوتا ہے۔

کچھ عطا کیجیے۔

میری ایک غزل ہے جو میرے سننے والوں کی نذر۔

مزاج میں وہ تلاطم ،وہ انتشار نہیں
پھر ایسا کیوں کہ ہمیں خود پہ اعتبار نہیں
میں اس کے واسطے جس درجہ، بے قرار ہوں آج
وہ میرے واسطے اُس درجہ بے قرار نہیں
اُسے بھی شوق نہیں ہے گلاب بننے کا
مجھے بھی فصل بہاراں کا انتظار نہیں
عجب مزاج ہے اس کا بدلتا رہتا ہے
ہمارے شہر کے موسم کا اعتبار نہیں
جہاں پہ کام نہ دیوانگی مری آئے
وہ اور سب ہے مگر موسمِ بہار نہیں
ہزار مجھ پہ ہو تنقید یہ خیال رہے
کہ میر و سودا و غالب یہ خاکسار نہیں

سوال: آپ ایک اچھے ناظم بھی ہیں کچھ اس بارے میں بتائے؟

☆ظہور الاسلام جاوید: یہ سفر گھریلو نشستوں سے شروع ہو کر عالمی مشاعروں تک جا پہنچا۔ کبھی یارانِ قافلہ میں شامل ہوئے تو کبھی میرِ قافلہ کے فرائض بھی انجام دیئے۔ العین اور دبئی میں پہلے بین الاقوامی مشاعروں کی نظامت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور اس کے بعد تو اتنے مشاعروں کی نظامت کی کہ اب تو تعداد بھی یاد نہیں۔

سوال:۔ آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا اور کس نے رانمائی کی؟

☆ظہور الاسلام جاوید: وہ جو کسی نے کہا ہے

کہ ماحول انسانی ذہن کی جلا کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے ،میرے گھر کا ماحول بچپن ہی سے ادبی سرگرمیوں کا گہوارہ رہا۔ والد صاحب انعام گوالیاری جنھیں ہم لوگ صاحب میاں کہتے تھے اپنے وقت میں کراچی کے اساتذہ شعرا میں شمار کئے جاتے تھے ۔ماموں مظہر حسن مظہر اور نانا الیاس گوالیاری کا شمار بھی استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ گھر ٹیوشن پڑھانے کے لیے حضرت بہادر کوٹی تشریف لاتے تھے کہ شاعری کے حوالے سے جن کے شاگردوں کی خاصی تعداد آج بھی کراچی میں موجود ہے۔ ہر مہینے گھر میں طرحی نشست کا اہتمام ہوتا تھا۔ وراثت اور ماحول دونوں ہی میسر تھے تو پھر کیوں نہ دریچہ دل وا ہوتا ۔بہت ہی کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دئے تھے۔ صاحب میاں سے جب کوئی سہرا لکھنے کی فرمائش کرتا تو وہ مجھے بلاتے اور مصرعہ بتا کر کہتے کہ ان ناموں کو مصرعوں میں میں نظم کروں۔ چونکہ خاصے نام ہوتے تو میں ان ناموں سے پہلا مصرعہ بنا دیتا۔ صاحب میاں اس کی نوک پلک درست کر کے دوسرا مصرعہ قافیے کے ساتھ لگا کر شعر پورا کر دیتے ۔ یہ تھا تربیت کا ایک انداز جو آج کل عنقا ہے۔

سوال :۔آپ مشاعروں میں پوری دنیا سے شعراء کو مدعو کرتے ہیں اگر ہم موازنہ کرنا چاہیں تو پاکستانی شاعر کا کیا مقام و مرتبہ ہے تو اس بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

☆ظہورالا اسلام جاوید: اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ہمارے ہاں کے شعراء بہت اچھی شاعری کر رہے ہیں ہمارے ہاں کے شعراء کے پاس بہت سے مضامین ہیں جنھیں وہ اپنی شاعری میں سموتے ہیں۔

اپنا تازہ کلام پڑھنے والوں کی اگر نظر کریں گے تو انہیں اچھا لگے گا۔

سرفروشی کی روایت جب ردا ہو جائے گی
رسمِ شبیری وہاں از خود ادا ہو جائے گی
خون مٹی پر گرے گا جب کسی مظلوم کا
یار رکھنا وہ زمیں بھی کربلا ہو جائے گی
مائلِ گفتار ہوگی جب نوائے زیرِ لب
دشتِ وحشت میں اناالحق کی صدا ہو جائے گی
چشمِ حیراں جب بھی سرگرم تماشا ہوگئی
نرگسِ بیمار نے دکھ کی دوا ہو جائے گی
بام و در ہوں جو فریب موسم گل کا شکار
خیمہ زن صحرائے جاں میں اک دعا ہو جائے گی
ناخنِ تدبیر کی عقدہ کشائی کے سبب
حلقہ ،دام جنوں زلف رسا ہو جائے گی
فیصلہ جب بھی کریں جاوید مستحکم کریں
ورنہ ہر گزری گھڑی زنجیر پا ہو جائے گی

سوال:۔اتنے سارے مشاعرے منعقد کرتے کرتے آپ کے لیے یہ سب بہت آسان ہو گیا ہوگا اب کیا مشکل پیش آتی ہوگی؟

☆ظہورالا اسلام جاوید: ہر مشاعرے کے لیے نئے سرے سے کام کرنا پڑتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بار بار کی مشق کسی بھی کام کو آسان بنا دیتی ہے مگر مشکلات بھی ساتھ ساتھ جڑی رہتیں ہیں ۔پہلے ہمارے پاس اساتذہ شعراء کی پوری ایک رو تھی ایک لمبی فہرست تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ بہت گھٹ گئی ہے بہت سے شعراء جیسے فیض احمد فیض ،احمد ندیم قاسمی ،ناصر کاظمی ،حمایت علی شاعر، احمد فراز ،جون ایلیاء اسی طرح اور بہت سے دوسرے اب ہم میں نہیں ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور جب صدارت کے منصب کے لیے کسی کو منتخب کرنا ہوتا ہے تو یہ سب عظیم شعراء بہت یاد آتے ہیں۔

سوال:۔ان مشاعروں سے آپ کو شہرت کے ساتھ ساتھ اور کیا ملا جس کا کوئی اور نعم البدل نہیں ہوسکتا؟

☆ظہورالاسلام جاوید: ان بین الاقوامی مشاعروں، مذاکروں اور سیمیناروں کے توسط سے نہ صرف برصغیر کے شعرء کرام، مشاہیر، دانشوروں سے استفادہ کا موقع ملا، بلکہ اقوام عالم کے چیدہ چیدہ مشاہیر سے ملاقات کا شرف بھی حاصل رہا۔محترم احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان کانپوری، کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، چین کے انتخاب عالم۔ایک طویل فہرست ہے اس معاملے میں میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں اور ان سب کا کوئی نعم البدل نہیں یہ میرا بہت قیمتی اور انمول اثاثہ ہیں۔

سوال:۔ متحدہ عرب امارات کے قیام کے دوران مرکز پاکستان العین کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے کچھ اُس بارے میں بتایئے؟

☆ظہورالاسلام جاوید: میں مرکز پاکستان العین کا تین سال جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ پھر جب ابوظہبی آیا تو مرکز پاکستان ابوظہبی کا تین سال جنرل سیکرٹیری رہا۔ان چھ برسوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔مرکز کے حوالے سے بہت سی شخصیات ہیں جو اپنی ذات میں پوری انجمن ہیں۔

اپنی کوئی غزل سنایئے۔

ایک غزل ہے

اپنی نفرت کو جو زنجیر نہیں کر سکتے
وہ کبھی خواب کو تعبیر نہیں کر سکتے
فیصلے وقت ہی تحریر کیا کرتا ہے
آپ چاہیں بھی تو تحریر نہیں کر سکتے
بس یہی بات بنی اپنی تباہی کا سبب
اپنے جذبات کو تصویر نہیں کر سکتے
آپ سچے ہیں اگر آپ کا دعویٰ ہے تو کیوں
ایسی سچائی کی تشہیر نہیں کر سکتے
فاتح شہر جنوں یاد رہے بات مری
حوصلوں کو کبھی زنجیر نہیں کر سکتے
حکم آیا ہے مسیحائے محبت کا ظہور
زخم کھاتے رہو تدبیر نہیں کر سکتے

سوال: آپ نے ابوظہبی اور العین میں جو مشاعرے منعقد کیے کچھ ان کا احوال بتایئے؟

☆ظہورالاسلام جاوید: یہ سلسلہ سلیم جعفری مرحوم نے دبئی میں شروع کیا تھا ہوتا یہ تھا کہ سلیم جعفری جب پاک و ہند کے کسی بھی اہم سینئر شاعر کے ساتھ جشن منعقد کرتے تو میں ان صاحب جشن اور مدعو شعراء کے لئے ایک مشاعرہ ابوظہبی میں منعقد کرواتا پھر رفتہ رفتہ ابوظہبی عالمی اردو مرکز کا درجہ اختیار کر گیا۔اس میں لگاتار سعی کرنی پڑی اور جشن خمار ۱۹۸۷ء جشن فراز ۱۹۸۸ء، جشنِ کنور مہندر سنگھ بیدی ۱۹۸۹، جشنِ جون ایلیا ۱۹۹۰ء، جشنِ مجروح سلطان پوری ۱۹۹۱ء، جشنِ غزل وغزال ۱۹۹۱ء، جشنِ قتیل شفائی ۱۹۹۲ء، جشنِ جگن ناتھ آزاد ۱۹۹۳ء، جشنِ محشر ۱۹۹۴ء، جشنِ کیفی ۹۹۵ء، جشنِ پیرزادہ قاسم ۱۹۹۶ء، جشنِ علی سردار جعفری ۱۹۹۷ء اور ابوظہبی میں ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۱۸ تک عالمی مشاعرے منعقد کرتے رہے۔

سوال اتنے سارے کام کے پیچھے کون سا جذبہ ہے جو آپ کو اُکساتا ہے؟

☆ظہورالاسلام جاوید: صرف اور صرف اپنی زبان کی محبت اس کا فروغ اور ہمارے شعراء کی پوری دنیا سے شناسائی اور پذیرائی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے راستے ہموار کرنا۔

کچھ اور عطا کیجیے۔

☆ظہورالاسلام جاوید: جی۔ ضرور!

بٹھا کے سامنے تجھ کو غزل کبھی لکھوں
ہیں استعارے حسیں جتنے بھی سبھی لکھوں
یہ سچ شکستِ تمنا کے باوجود یہ دل
بضد رہے کہ تجھے اپنی زندگی لکھوں
تجھے جو سوچوں تو پھیلے ہے روشنی ہر سو
ترے خیال کو پھر کیوں نہ چاندنی لکھوں
ہزار تلخ ہو پھر بھی جو سچ لگے یارب
قلم سے صفحہ قرطاس پر وہی لکھوں
یہ سانحہ کہ جنوں ہمرکاب وحشت ہو
یہ میرا ظرف کہ اس کو شگفتگی لکھوں
اسی کے نام سے زندہ ہوں میں ظہور تو پھر
اسی کے نام نہ کیوں اپنی ہر خوشی لکھوں

سوال: پردیس کی فضاء روزگار کی جد وجہد، سماجی مصروفیات اور ساتھ ساتھ بھرپور ادبی مصروفیات ایسے میں اپنی فیملی کو کیسے وقت دیتے ہیں ؟اور فیملی میں کون کون ہے؟

☆ظہور الااسلام جاوید: اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے ہمت دی کہ میں ان تمام معاملات میں متوازن رہوں اور یہ بھی اُس کی خاص عنایت ہے کہ مجھے وہ شریک حیات عطا فرمائی جو قدم سے قدم ملا کر چلتی ہیں۔ کبھی زیرِ لب کوئی گلہ نہیں آیا بلکہ ہمیشہ مجھے حوصلہ دے کر میری تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ ہمارے پانچ بچے ہیں ڈاکٹر احمد انعام، اسماء ندیم، ڈاکٹر یاسر انعام اور رابعہ ذیشان سب ماشاءاللہ ازدواجی رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ جبکہ ایک بیٹا منصور انعام ہمارے ساتھ ہے۔ جو اللہ کی رضا سے ہمارا سہارا ہے اور ہم اس کے سہارے ہیں۔ الحمدللہ! ہم پر اللہ کا بہت کرم ہے ہم میاں بیوی اُس کے شکر گذار ہیں۔

سوال: مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں شاید کوئی ایسی بات جو گفتگو کا حصہ بننے سے رہ گئی۔ اگر ایسا ہے تو آپ اپنی بات کر سکتے ہیں؟

☆ظہور الااسلام جاوید: (مسکراتے ہوئے) میں یہ بتانا چاہوں گا کہ ریڈیو سے میرا رشتہ زمانہ طالب علمی سے ہے جب میں کالج کا طالبعلم تھا یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے اُس زمانے میں ریڈیو پاکستان سے طالب علموں کی غیر نصابی سرگرمیوں کو اُبھارنے اور تخلیقی صلاحتوں کو مزید نکھارنے کے لیے بزم طلبہ ہوا کرتا تھا۔ اسی برس جشنِ طلبہ کے سلسلے میں ایک مشاعرہ برپا کیا گیا کئی طالب علموں نے بحیثیت شاعر حصہ لیا ان میں، میں بھی شامل تھا اور بحیثیت شاعر اپنا کلام سنایا اور انعام یافتہ شعرا کی فہرست میں اول آیا جبکہ دیگر انعام یافتہ شعراء میں جاذب قریشی اور نقاش کاظمی شامل تھے۔

سوال: آپ نے خوبصورت نظمیں بھی کہی ہیں کوئی نظم سنایئے۔

میری ایک نظم ہے اے وادی کشمیر میں اُس کا کچھ حصہ سنا دیتا ہوں۔

خوشبو میں بسی ہوں گی ہر اک سمت ہوائیں
پھولوں کی مہک اُٹھیں گی گل رنگ قبائیں
پھر چاروں طرف چھائیں گی رحمت کی گھٹائیں
جب نعرہ تکبیر کی گونجیں گی صدائیں
آزاد تجھے ہند سے ہم کر کے رہیں گے
کشمیر تجھے رشک ارم کر کے رہیں گے
تھی کچھ بھی مگر اب ہے یہی صورت حالات
لکھیں جو مضامین، غزل، نظم، مقالات
بیٹھیں جو کہیں اور کریں کچھ بھی سوالات
کشمیر ترا ذکر ہو کشمیر تری بات
تبدیل اب انداز ستم ہو کے رہے گا
اللہ کا اب اس پہ کرم ہو کے رہے گا

اسی نظم پر آمین کہتے ہوئے ہم اپنے پڑھنے والوں سے اجازت چاہتے ہیں۔

"سچی کہانیاں/دوشیزہ" اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے

ادارہ 'سچی کہانیاں' اپنے قارئین کی سہولت کے لیے دفتر میں ایک ڈیسک قائم کر رہا ہے۔ آپ کو اگر 'سچی کہانیاں' ملنے میں دشواری ہے تو بذریعہ فون یا میسج ہمیں مطلع کریں آپ کہیں بھی رہتے ہیں ادارہ آپ کے گھر کے پتے پر بذریعہ وی پی 'سچی کہانیاں' ارسال کرے گا اس طرح آپ اور آپ کے پیارے 'سچی کہانیاں' کے درمیان جو دوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ 'سچی کہانیاں' اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے۔

فوری رابطہ 021-35893122-23

موبائل نمبر 0309-0364564

افسانہ

رضوانہ پرنس

لاک ڈاؤن

پہلے شوہر کی مصروفیت کا شکوہ تھا اور اب بے جا مداخلت
کا کیا عورت کسی حال میں بھی خوش رہ سکتی ہے؟

''فاخر پلیز بھولیے گا نہیں...... شام کو ہمیں علیزہ کی برتھ ڈے پر جانا ہے۔'' زویا نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے ایک بار پھر یاد دلایا تو وہ چڑ سا گیا۔

''افوہ بھئی تم تو جان کو آ گئی ہو۔ کتنی بار یاد دلاؤ گی مجھے' کہہ تو دیا ہے کہ آ جاؤں گا۔'' اس کے موڈ کو خراب ہوتا دیکھ کر اس نے جلدی سے ایک پیاری سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بہت محبت سے اسے ایک بار پھر خدا حافظ کہا تو فاخر بے اختیار ہنس دیا۔

''تم بھی نہ......'' وہ اس کے رخسار کو پیار سے چھوتا ہوا دروازے سے باہر نکلا تو سکون کی ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ کچن کی جانب بڑھ گئی فاخر اور زویا کی شادی کو تقریباً آٹھ برس ہو رہے تھے۔ دونوں آپس میں سیکنڈ کزن تھے۔ اکثر مختلف تقریبات میں دونوں کا آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا اور کب یہ عام سی ملاقاتیں پسندیدگی میں ڈھلیں اور کب پسندیدگی نے محبت کا دلکش پہناوا پہنا دونوں کو پتہ بھی نہ چلا۔ جس طرح منہ اندھیرے دبے پاؤں چلنے والی ہوا پھولوں پر شبنم گرا جاتی ہے ایسے ہی فاخر کی محبت ایک خوبصورت احساس بن کر جیسے زویا کے دل میں بکھرتی چلی جا رہی تھی۔ محبت جسے اپنا آپ بخش دیتی ہے پھر اسے کسی اور چیز کی طلب ہی نہیں ہوتی۔ زویا کی بھی یہی کیفیت تھی چاہتوں کے پل آنکھوں میں جاگ اٹھے تھے اور نیند روٹھ کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔

بس فاخر کو دیکھنے اس سے ملنے کی تمنا اسے ہمہ وقت بے چین رکھتی۔ خاندان میں خوشی یا غمی دونوں ہی موقعوں پر فاخر کو دیکھنے کی ایکسائٹمنٹ باقی سب جذبوں کو دھندلا دیتی تھی اور فاخر کی بے تاب نگاہوں کی گرمی اسے بن کہے بتا دیتی کہ وہ بھی اسی آگ میں سلگ رہا ہے جس میں وہ جل رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی خاموش محبت کو ان کے موبائل نے اظہار کی طاقت دے دی۔ واٹس ایپ پر باتیں اور خوبصورت میسجز نے جیسے جذبوں میں مزید شدت پیدا کر دی اور پھر ایک دن جب فاخر کی امی اُس کا رشتہ لے کر زویا کے گھر آئیں تو زویا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی فلم کی ہیروئن کی طرح لہک لہک کر گانا گا کر اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ فاخر کی شادی شدہ بہن

بھی ان دنوں کینیڈا سے آئی ہوئی تھی اور ابھی ایک مہینہ مزید رُکنے کا ارادہ تھا۔

سوان کی خواہش کے مطابق اُسی ایک ماہ میں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ اتنی جلدی فاخر کی دنیا میں چلی آئی کہ ہفتوں اسے فاخر کا ساتھ جیسے ایک حسین خواب کی مانند محسوس ہوتا رہا تھا۔ شروع کے دو ماہ تو فاخر کی خوبصورت سنگت میں جیسے دن رنگین جگمگاتے پر لگا کر گزر گئے پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آتی گئی۔ لو میرج میں سے لو دھندلاتا گیا اور لفظ میرج کی آب و تاب ویسے ہی رہی جیسے عام شادی شدہ جوڑوں کی زندگی میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک رنگین رومانٹک لائف سے نکل کر وہ دونوں بھی حقیقت کی بلیک اینڈ وائٹ دنیا میں محبوب اور محبوبہ کا چولا اتار کر میاں بیوی کے گھریلو روپ میں آ ہی گئے۔

فاخر کو شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ایک بہت بڑی پرائیویٹ کمپنی کی طرف سے جاب کی آفر آ گئی۔ پُرکشش تنخواہ کے ساتھ پوسٹ بھی کافی بڑی تھی فاخر اور زویا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ فاخر کا بار بار یہ کہنا کہ اس کے قدم فاخر کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئے ہیں زویا کو جیسے مغرور بنا دے رہا تھا۔ نئی جاب کی پہلی سیلری پر دونوں نے ایک شاندار دعوت کا بھی اہتمام کر ڈالا۔ آخر دوستوں اور عزیزوں پر بھی تو رعب ڈالنا تھا۔ اس شاندار جاب کا......

پہلی والی جاب میں فاخر چھ بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا اور پھر شام دونوں کی اپنی ہوتی تھی۔ لیکن اس نئی نوکری نے جیسے فاخر کو اس سے دور ہی کر دیا تھا آٹھ نو بجے سے پہلے تو اس کی واپسی ناممکن تھی اور پھر آنے کے بعد اس کے چہرے پر بکھری شدید تھکن زویا کو بن کہے ہی سمجھا دیتی کہ فاخر سے کہیں بھی جانے کی فرمائش کرنا بے سود ہے۔ وہ کچھ خفا خفا سی رہنے لگی لیکن فاخر اتنا مصروف رہنے لگا تھا کہ اسے منانے کا وہ خوبصورت مخصوص انداز بھی بھلا بیٹھا تھا۔

زویا بجھ سی گئی تھی۔ اس جاب نے جیسے اس کے فاخر کو اس سے دور کر دیا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان کی زندگی اب ایک نارمل ڈگر پر آ گئی تھی۔ وہ شادی کے



شروع کے چاؤ چونچلے اب گھریلو باتوں میں ڈھلنے لگے تھے پھر بھی ایک خوبصورت سا ہلکا پھلکا رومانس ان کے درمیان اب بھی موجود تھا۔ فاخر کے آفس سے آنے کے ٹائم پر سج سنور کے اس کا انتظار کرنا اسے سارے دن کی سب سے خوبصورت بات لگتی تھی۔ فاخر کو بھی زویا کی اداسی اور بوریت کا احساس تھا لیکن اس کی پوسٹ کی ڈیمانڈ ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود جلدی آنے سے قاصر تھا۔ کچھ ہی دنوں میں زویا ماں بننے والی تھی اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہورہی تھی۔ اس کی ساس فاخر کے بڑے بھائی کے پاس رہتی تھیں اور ہرویک اینڈ پر ان کے گھر رہنے آجاتیں اور پورے ہفتے میں ملنے والا یہ چھٹی کا دن بھی زویا کو بٹا ہوا ہی ملتا۔ پھر ننھے یاسر کی آمد نے جب اسے زندگی کا دوسرا حسین روپ دکھایا تو وہ سب گلے شکوے بھول کر اپنے اس ننھے منے سے کھلونے میں مصروف ہوگئی۔

فاخر بھی آفس سے آنے کے بعد اپنا زیادہ وقت یاسر کے ساتھ کھیلنے اور لاڈ پیار کرنے میں گزارتا یہ الگ بات تھی کہ زویا بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ اب یاسر گھٹنوں گھٹنوں چلنے لگا تھا واکر پر بھی سارے گھر میں گھومتا پھرتا زویا کو اس کا ہر لمحہ دھیان رکھنا پڑرہا تھا۔ گھر میں کام کاج کے لیے فل ٹائم ماسی بھی رکھ لی گئی تھی۔

لیکن پھر بھی اب زویا کا دل چاہنے لگا تھا کہ فاخر عام شوہروں کی طرح شام کو وقت پر گھر آجایا کرے اور وہ لوگ یاسر کو لے کر کہیں باہر گھومنے جایا کریں کہ سارا دن بچے کے پیچھے ہلکان ہونے کے بعد کم از کم شام کو تو اسے فاخر کی ضرورت اور اس کی سپورٹ چاہیے تھی جو اسے بہت کم میسر ہورہی تھی۔

اسی بات پر دونوں میں جھگڑا بھی ہونے لگا تھا۔ سنڈے کو ساس کی وجہ سے مہمان داری میں ہی گزر جاتا۔ کوئی نہ کوئی ان سے ملنے آجاتا یا پھر جیٹھ جٹھانی کی آمد ہوجاتی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی رہنے لگی لیکن پھر اچانک اس کی زندگی میں بہار آگئی۔ ہر سو دھنک سی بکھرتی ہوئی محسوس ہونے لگی اسے ساری مہمان داریوں سے جان کچھ ایسی چھوٹی کہ دنوں اسے یقین ہی نہیں آیا تھا فاخر جس کی قربت کے لیے وہ ترس گئی تھی اب چوبیں گھنٹے اسی کے پاس ہوتا تھا اور مزے کی بات یہ کہ ظالم سماج بھی درمیان میں آنے سے قاصر تھا۔ کرونا جیسی وبا نے جہاں ہزاروں لوگوں کو آنسوؤں میں ڈبویا وہیں اس کے لبوں پر ایسی خوبصورت ہنسی بکھیری جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے فاخر اب گھر میں ہر پل اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔

ملازمہ بھی فی الحال کام سے ہٹادی گئی تھی۔ اب وہ ننھے یاسر اور اپنے فاخر کے ساتھ زندگی کا پل پل انجوائے کررہی تھی وقت کتنا خوبصورت ہوگیا تھا کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں تھا نہ کسی کے آنے کا خوف اور نہ کہیں کسی کے یہاں جانے کی پریشانی...... سب سے فون پر باتیں ہوتی رہتیں۔ ساس جن کو وہ فاخر کی طرح امی جی کہتی تھی وہ اکثر فون پر ان سے بہت محبت بھرے لہجے میں کہتی۔

''امی جی ہر سنڈے کو آپ کی وجہ سے میرے گھر میں کتنی رونق ہوتی تھی اب تو جیسے سناٹا سا چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے در و دیوار پر......'' لبوں پر امی جی کے نہ آنے کا غم اور دل 'یاہو' کے نعرے ماررہا ہوتا۔ کسی کے دل میں کیا چھپا ہے یہ تو رب ہی جانتا ہے۔

دل اگر بے نقاب ہوتے
تو سوچو کتنے فساد ہوتے

صبح اکثر وہ دونوں مل کر ناشتہ بھی بناتے۔ وہ توے سے گرم گرم پراٹھے اتارتی اور فاخر اس سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے ہری مرچ اور پیاز کا آملیٹ

بناتا زندگی کسی رومانٹک فلم سے بھی زیادہ حسین لگنے لگی تھی اسے...... کبھی ایسے دن بھی آئیں گے اس کی لائف میں یہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ایک ماہ کیسے گزر گیا دونوں کو خبر ہی نہ ہوئی۔ پھر کمپنی کی طرف سے گھر سے کام کرنے کے آرڈر آ گئے۔ پھر بھی کام بہت زیادہ نہ تھا۔ چار پانچ گھنٹے فاخر کمرہ بند کر کے کمپیوٹر پر بزی رہتا۔ اس اثناء میں زویا گھر کے بہت سے کام نپٹا لیتی ورنہ فاخر کسی جن کی طرح جیسے اس کے سر پر سوار رہنے لگا تھا۔ شروع شروع میں تو زویا کو اس کی ہیلپ کرانا بہت اچھا لگا تھا لیکن اب اسے بیزاریت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ کیا بھئی کہ اس کے روٹین کے سارے کاموں میں فاخر کی دخل اندازی ضروری ہو۔ وہ اُلجھ کر سوچتی۔

اس دن وہ جھاڑو لگا رہی تھی کہ فاخر نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو کھینچ لی۔

''ارے یار تم عورتیں ماسیوں کی اتنی عادی ہو جاتی ہو کہ خود جھاڑو لگا ہی نہیں سکتیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا...... ٹھیک سے تو دے رہی ہوں جھاڑو۔'' وہ برامان کر بولی۔

''یہ دیکھو صوفے کے نیچے کتنی مٹی نظر آ رہی ہے۔'' فاخر نے اشارہ کرتے ہوئے جھاڑو سے صوفے کے نیچے سے جھاڑو دینی شروع کی تو وہ بور ہو کر کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد فاخر بھی مسکراتا ہوا وہاں چلا آیا۔

''ملکہ عالیہ ذرا آ کر دیکھیے تو سہی آپ کے سگھڑ شوہر نے لاؤنج کو کیسے چمکا دیا ہے۔'' زویا کو اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اب تو لاک ڈاؤن کو دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہو رہا تھا۔ شروع کا ایک ماہ جتنا پُر کیف اور رم جھم برستی پھوار جیسی خوشیوں میں بھیگتے ہوئے گزرا تھا۔ اب زویا کو اس میں دھوپ جیسی تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ کبھی میکے کی یاد آنے لگتی تو کبھی اپنی فرینڈز سے ملنے کی تڑپ جاگ اٹھتی۔ فاخر کی ہر بات میں بے جا مداخلت بھی اسے بہت کھلنے لگی تھی۔ پہلے اس کے آفس جانے کے بعد کتنی کتنی دیر تک وہ اپنی امی اور بہن بھائیوں سے فون پر باتیں کیا کرتی تھی دوستوں سے بھی خوب گپ شپ ہوتی تھی۔ لیکن اب تھوڑی سی دیر بھی اگر وہ فون پر ہوتی تو فاخر بیزار ہو جاتا۔

''افوہ بھئی اب کتنی دیر تک باتیں ہوں گی تم لوگوں کی' یار کوئی لمٹ بھی ہوتی ہے دیکھو یاسر کتنا تنگ ہو رہا ہے۔'' حالانکہ یاسر بڑے مزے سے واکر پر اِدھر سے اُدھر گھوم رہا ہوتا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتی ہوئی فون بند کر دیتی۔ تب فاخر بہت پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیتا۔

''یار بور ہونے لگتا ہوں میں جب تم فون پر اتنی دیر تک بزی رہتی ہو۔ اپنے دیوانے کو بھی کچھ وقت دے دیا کرو۔'' لاک ڈاؤن کے شروع میں ایسے جملے امرت بن کر اسے اپنے کانوں میں اترتے محسوس ہوتے تھے لیکن اب یہ ہی ڈائیلاگ اسے عجیب سی بیزاری کا احساس دلانے لگے تھے۔ کتنے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں آفرینہ سے پتہ نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں کباب میں ہڈی بن کر وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی تھی۔

اس دن وہ کچن میں آملیٹ کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی کہ فاخر بھی وہاں آ گیا۔

''افوہ زویا کوئی آملیٹ کے لیے اتنی موٹی پیاز کاٹتا ہے کیا...... لاؤ مجھے چھری دو اور دیکھو کتنی باریک اور نفاست سے کاٹوں گا میں یہ پیاز۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ تو بہت الجھ کر اس نے فاخر کے حوالے چھری اور پیاز کرتے ہوئے اس لاک ڈاؤن کو خاموشی کی زبان میں ہزاروں صلواتیں سنا ڈالیں۔ کیونکہ یہ پہلی بار نہ تھا فاخر اس کے ہر کام میں جیسے اپنی مداخلت ضروری سمجھنے لگا تھا۔ اب زویا کو

لاک ڈاؤن سے پہلے کے دن شدت سے یاد آنے لگے تھے۔ جب وہ سارا دن اپنی مرضی سے گزارا کرتی تھی اور شام ہوتے ہی فاخر کے آنے کا انتظار ایک خوبصورت احساس بن کر اس کے چار سو چھانے لگتا تھا۔ اب تو وہ ڈھنگ سے اپنے پسندیدہ ڈرامے بھی نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ عین ڈرامے کے درمیان کبھی فاخر کو چائے کی طلب ہو جاتی یا یاسر کو ڈھنگ سے نہ دیکھنے پر وہ الجھنے لگتا۔ اتنے دنوں بعد اب جا کر زویا کو پتہ کہ فاخر کتنی اُلجھی طبیعت کا مالک ہے۔

نہیں تھا کہ وہ ہر وقت ہی اسے ٹینشن دیتا رہتا تھا کبھی کبھی وہ بہت پیار سے خود اس کے لیے ناشتہ بناتا یاسر کے سو جانے کے بعد کافی پیتے ہوئے وہ دونوں کوئی مووی بھی دیکھتے۔ وہ اس کی محبت کی شدت کو محسوس کر کے خوش بھی ہو جاتی تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بوریت اسے اپنے وجود پر چھائی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس دن وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے فاخر کو چائے دے کر یاسر کو سلانے اپنے بیڈروم میں آئی تو کمرے کی بے ترتیبی دیکھ کر جیسے اس کا موڈ ہی آف ہو گیا گیلا تولیہ بیڈ پر پڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ فاخر کی شرٹ نیچے قالین پر پڑی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ کمرہ خاصا بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ جبکہ کچھ دیر پہلے ہی وہ کمرہ بالکل صاف کر کے گئی تھی۔

فاخر جب بھی نہا کر نکلتا تھا کمرے کا حشر ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ یاسر کو Cot میں لٹا کر اس نے دوبارہ کمرے کو برابر کیا لیکن فاخر سے کچھ کہنا گویا اپنی شامت کو دعوت دینا تھا کافی دیر کے لیے زویا کو اس کی خفگی سہنا پڑتی تھی۔ اسے منانے کے کافی جتن کرنے پڑتے تھے وہ کچھ بیزار سی باہر آئی فاخر بہت محویت سے کوئی ٹاک شو دیکھ رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے ان چار مہینوں میں فاخر کو بھی میری بہت سی خامیوں کا احساس ہوا ہو اور میری طرح وہ بھی مروت میں مجھ پر ظاہر نہ کرتے ہوں۔'' ایک دم سے ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا گہری سانس لے کر وہ کچن میں چلی آئی برتن دھوتے ہوئے اسے نذیراں کی یاد شدت سے ستانے لگی۔

اب تو اسے اپنی ماسی کی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا اور تو اور اپنے میکے والوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ساس کو بھی مس کرنے لگی تھی کتنی رونق ہو جاتی تھی گھر میں ان کے آنے سے......توبہ یہ زندگی اتنی سنسان اور بے رونق ہو جائے گی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

تبھی اسے فاخر کے پکارنے کی آواز آئی۔

''زویا زویا جلدی آؤ یار۔'' وہ گھبرا کر نلکا بند کرتے ہوئے تیزی سے لاؤنج میں آئی تو فاخر نے بانہیں پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''جان دیکھو پلیز تم اپ سیٹ مت ہو جانا' مجھے پتہ ہے تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگے گی لیکن مجبوری ہے یار۔'' وہ جیسے کچھ کہتے کہتے ہچکچا رہا تھا۔ زویا نے بہت گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے فاخر جلدی بتائیں مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''زویا مجھے ابھی باس کی کال آئی تھی کل سے ہمارا آفس کھل رہا ہے۔ اب زندگی دوبارہ پہلے کی طرح ہو جائے گی۔'' وہ ایک لمحہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی پھر زیرِ لب بڑبڑائی۔

''زندگی پہلے کی طرح ہو جائے گی۔'' فاخر نے دوبارہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''زویا پلیز اداس مت ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا زویا نے بے اختیار اس کے سینے میں منہ چھپا لیا ڈر گئی تھی کہ کہیں وہ اس کے خوشی کے آنسوؤں کو پہچان نہ لے۔

□□......❁......□□

ماہنامہ

دوشیزہ

سچی کہانیاں

پڑھیے

آپ دوشیزہ اور سچی کہانیاں

ایک ساتھ منگوائیں

سالانہ = /1500 روپے

بیرون ملک سالانہ خریداری

175 امریکی ڈالر	ایران	175 امریکی ڈالر	کویت
175 امریکی ڈالر	بحرین	175 امریکی ڈالر	سعودی عرب
175 امریکی ڈالر	جاپان	175 امریکی ڈالر	امارات
175 امریکی ڈالر	لیبیا	175 امریکی ڈالر	مصر
175 امریکی ڈالر	تھائی لینڈ	175 امریکی ڈالر	یونان
175 امریکی ڈالر	ترکی	175 امریکی ڈالر	فرانس
175 امریکی ڈالر	ملیشیا	175 امریکی ڈالر	ہالینڈ
175 امریکی ڈالر	انڈونیشیا	175 امریکی ڈالر	عراق
185 امریکی ڈالر	ایشیا	185 امریکی ڈالر	امریکہ
185 امریکی ڈالر	آسٹریلیا	185 امریکی ڈالر	افریقہ

منی آرڈر

آپ اپنے عزیز و اقارب کو تحفے میں دوشیزہ اور سچی کہانیاں بھجوا سکتے ہیں

سالانہ خریداری کے لیے رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر 175 ڈالر

Monthly Dosheeza کے نام ارسال کریں۔

آپ اپنا پتہ صاف صاف اور مکمل تحریر کریں۔

آفس کا پتہ C-88 II ایکسٹینشن، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

021-35893122 - 35893123 :فون P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400.

افسانہ

ارشد ابرار ارش

بانجھ

ضروری تو نہیں کہ بانجھ عورت ہی ہو مرد بھی تو بانجھ ہو سکتا ہے مگر یہ بات کوئی مانے نہ مانے وہ عورت نہیں مانتی جس نے اس بانجھ مرد کو پیدا کیا ہوتا ہے......

ٹرین کے اس بوڑھے زنگ آلود انجن، جسے وہ اپنے بچپن سے اسٹیشن پر بیکار کھڑا دیکھتی آئی تھی اور اپنی ذات میں، اسے کچھ بھی تفریق معلوم نہ ہوتی۔ کتنے برسوں بعد آج بھی یہ بے رنگ زنگ آلود انجن اسی سابقہ حالت میں وقت کی شکست و ریخت سہتا چلا آ رہا ہے اور وہ خود...... اس کا اپنا وجود بھی ٹرین کا وہی زنگ آلود انجن ہو چلا تھا۔

کرم جلی کی مانگ کا کنگھے سے، وجود کا سنگھار سے اور تن کا نئے لباس سے ناطہ ٹوٹے عرصہ ہوا تھا اب تو جیسے نوری کو اجڑے اور خراب حالوں سے ہی انس ہو۔

چہرے کی مردنی اس قبر سے مشابہ تھی جو بوڑھے گورکن کے مطابق اس قبرستان کی سب سے پرانی قبر تھی اور عرصہ ہوا جس پر فاتحہ پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا گیا تھا۔

ایک بار نوری نے ماں کی زبانی ہی سنا تھا۔

''زندہ قبریں بھی تو ہوتی ہیں جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی انسانی قبریں۔

'اندر' مر جائے تو ظاہری وجود قبر سے ہرگز کم نہیں ہوتا۔''

نوری کو بھی اپنا اندرون مردہ محسوس ہوتا اور اپنا وجود ایک قبر' جسے وہ اپنی تمام خواہشات اور ارمانوں کا بے نشان مدفن بنا چکی تھی۔

اور اب اس کی اپنی زمانہ شناس ماں کے پاس بھی بیٹی کا علاج نہیں تھا، کوئی مرہم نہیں تھا جو بیٹی کے زخموں پر رکھتی، کوئی دوا نہیں تھی جو اس کو درد سے نجات دے سکتی۔ لفظوں کی رفوگری بھی اس پر بے اثر تھی۔

بس دور سے اپنی نوری کو بجھے دل سے دیکھا کرتی، چپ چاپ اداس اور غمزدہ۔ جہاں نوری کو بٹھا دیتی وہ پہروں وہیں بیٹھی رہ جاتی۔ اب تو اس کے وجود سے بہت کم آوازوں کو برآمد ہوتے سنا گیا تھا۔ اگر بات کرتی بھی تو آواز اس قدر کمزور ہوتی کہ ماں کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگتا اور پوری بات سمجھنے کے لیے اسے پھر سے نوری کو مخاطب کرنا پڑتا۔

ایک بار زمینوں پر گھومتے ہوئے نوری نے خشکی کا ایک وسیع علاقہ دیکھ کر اپنے بابا سے پوچھا تھا۔

''بابا یہاں سبزہ کیوں نہیں ہے؟'' بابا نے اسے آسان لفظوں میں سمجھایا۔

''بیٹا بانجھ زمینوں پر سبزہ نہیں اگا کرتا۔''

اسے ہرگز سمجھ نہیں آئی تھی بلکہ اس کی سماعتوں کے لیے یہ لفظ بھی غیر شناسا سا، اجنبی اور حیران کن تھا۔

''بانجھ۔ زمین تو صرف زمین ہوتی ہے بس۔''

یہ بانجھ زمین ''کیسی ہوتی ہے بابا؟'' وہ پھر سے اس حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ویران قطعے کو دیکھنے لگی۔

''جو زمین پیداوار نہیں دیتی۔ جس زمین کی مٹی سے زرخیزی ختم ہو جائے۔'' بابا اسے پھر سے سمجھا کر مطمئن ہو گئے۔

مگر وہ مطمئن نہ ہو سکی۔ چھوٹا سا دماغ اتنی بڑی بات قدر آسانی سے کیسے قبول کرتا بھلا۔

واپس گھر آئی اور پچھلے کئی پہروں سے دماغ کی کوری سلیٹ پر نقش سوال اپنی ماں سے دہرایا

''جیسے کچھ انسان بانجھ ہوتے ہیں ویسے ہی کچھ زمینیں بھی بانجھ ہوتی ہیں۔''

دیوار کے ایک بڑے قدم بھر کے فاصلے پر پھیلے سائے میں کپڑے سلائی کرتی اماں نے ایک نئی الجھن ڈال دی۔

''انسان بھی بانجھ ہوتے ہیں اماں؟''

''ہاں...... جب قلوب نیکی سے زیادہ بدی سے بھر جائیں، جب انسانی دل سے احساس اور انسانیت سرے سے مر جائے تو وہ دل 'نیکی' جنم نہیں دے سکتا۔۔۔ ایسے لوگ بانجھ اور بنجر زمین جیسے ہی ہو جاتے ہیں۔''

الجھن اب بھی نہیں سلجھی تھی اور اگلے کئی سال بعد بھی نہیں سلجھ پائی جب تک نوری نے ماں کا اپنے لیے پائی پائی جمع کر کے خریدا ہوا لال عروسی



رنگ پہن کے اور پھر اسے پانچ سال بعد پیٹی سے نکال کرنہیں دیکھا۔

پانچ سال بعد الجھن تو اب سلجھ چکی تھی مگر وہ اپنے وجود پر لگی گانٹھ اور اپنی داغدار جبیں کے نشان بابا کونہیں دکھا پائی کیونکہ بابل کا در چھوڑنے اور سرخ جوڑا پہننے سے کئی برس پہلے ہی وہ انہیں چھوڑ کے یہاں سے بہت آگے ایک اور دنیا کو سدھار چکے تھے۔

بچپن کی حدوں کو پھلانگ کر جوانی کے الھڑ دور میں قدم رکھتے ہی ماں نے اسے باور کرا دیا کہ ''بیٹیاں تو ہمیشہ پرایا دھن ہوتی ہیں اور ماں باپ کو نا چاہتے ہوئے بھی یہ امانتیں بحکم الٰہی اس کے مالک کو سونپنا ہی پڑتی ہیں۔نوری تمہیں بھی ایک دن یہ در چھوڑ کر اپنے گھر چلے جانا ہے۔یہ حکم اٹل ہے ورنہ میری طرح کوئی بھی ماں عمر بھر اپنی اکلوتی بیٹی کو خود سے جدا نہ کرے۔''

اسد نام کی انگوٹھی پہننے اور اس کے نام اپنے تمام حقوق لکھے جانے سے قبل وہ اس نام کے کسی بھی شخص سے انجان تھی۔ماں سے اسے اس قدر غیریت کی امید ہرگز نہ تھی کہ وہ اپنی اکلوتی کو گاؤں سے بھی باہر غیروں کے حوالے کر دیں گی۔

جب نوری نے ماں سے شکوہ کیا تو وہ بولیں

''نوری میری دھی۔۔۔یہ جوڑے ھم انسان نہیں بلکہ بہت اوپر آسمان پر رب رحمان بنا دیتا ہے اور نکاح کے دو لفظوں کو خدا نے وہ طاقت بخشی ہے کہ یہ ازلوں سے انجان دو دلوں کو لمحوں میں جوڑ دیتے ہیں۔'' اور ایسا ہی ہوا

پیا گھر جانے سے پہلے خدا جانے کتنے ان گنت ست رنگے سپنے تھے جو اس نے اپنی پلکوں کی جھالر پر ٹانک لیے تھے۔

میٹھی عید، بقر عید اور جنم دن پر اسد کی خوشبو سے لپٹے گاہے بگاہے موصول ہونے والے ایسے کتنے رنگ برنگے تحائف تھے جو اس کے کنوارے دل میں اسد نامی محبت کے دیے کی لو مزید بڑھاتے رہتے۔

اور کبھی کبھار عنایت ہونے والی چند پل کی مختصر ملاقاتیں جو اسے جذبات واحساسات کی کسی اور دنیا میں لے جاتیں۔

چند لفظوں پر مشتمل چند لمحات کی مختصر ملاقات کے بعد وہ خود کو اس زمین سے بہت بلند ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی۔

اور پھر شرارتیں کرتی ، بات بے بات چھیڑنے والی سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری نکاح نامے کے سفید ورق پر خود کو اسد کے لیے وقف کرتے ہوئے اس نے سوچا

''اگر بنا سر میں خاک بھرے اور بنا کسی تیشے سے کوہ توڑنے کی مشقت اٹھائے من چاہے شخص کو اس قدر آسانی سے حاصل کر لینا خوش نصیبی ہے تو آج اس کا نام دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہوگا۔''

ایسی کتنی حسین وخوشگوار یادیں تھیں جنہیں وہ اپنے جہیز اور وجود کے ساتھ اپنے نئے عالیشان گھر لے گئی تھی۔ الوداعی گھڑیوں میں حسب عادت اماں نے بہت سی نصیحتیں اور دعائیں اس کے لال دوپٹے میں کس کے گرہ لگا دیں۔

مگر نوری اپنی سرخ عروسی رات گزار کے اگلے دھوپ بھرے دن میں کسی مرجھائے گلاب کی طرح کملائی ہوئی تھی۔یہ کیا کہ حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ لاحاصلیت اور محرومیت کی علامت ٹھہری تھی۔وہ اپنی مراد پا کر بھی بے مراد تھی

ایک دن پہلے کی خوشی اپنے نقطہ عروج کو چھو کر واپس کہیں گہرائیوں میں ڈوب گئی تھی۔

ہر آنکھ نے دیکھا کہ جہاں ازدواجی زندگی کے پہلے دن سے ہی اسد نے اسے اپنی پلکوں پر بٹھایا، اپنی تمام تر محبتیں صدق دل سے نوری کے نام لکھیں وہاں اسد کی ماں بھی اپنی اکلوتی بہو کی بلائیں لیتے اور صدقے اتارتے نہ تھکتیں۔ آنے والے دنوں میں نوری نے جہان بھر کی نگاہوں میں اپنے لیے رشک دیکھا۔ اس قدر چاہنے والے کب کسی کو نصیب ہوتے ہیں بھلا؟''

مگر وہ کملایا ہوا پھول پھر بھی نہ کھل سکا۔ سرخ عروسی ملبوس اور اماں کی ان گنت نصیحتوں سے گرہ لگا ہوا دوپٹہ اس نے اگلے دن ہی بے دلی سے پیٹی کی تہہ میں پھینک دیا تھا۔

دوسرے دن سے ہی وہ اداسی کی مجسم تصویر بنی گھر میں کسی بدروح کی طرح منڈلاتی رہتی۔

بیتتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کے سراپے پر پڑنے والی ہر نگاہ میں پہلے رشک اور پھر اس بے قدری لڑکی کے لیے تاسف کے ڈورے ابھرتے۔۔۔ وہ بیقدری جو اپنی رنگین ہتھیلیوں پر مہندی کے نشان دیکھتے ہی چھلک پڑتی۔ وہ بے قدری جس سے اس قدر محبتیں سنبھالی نہیں جا رہی تھیں اور اسے اپنا دامن تنگ پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ ساس نے اس کی اداسی کو گھر سے دوری جان کر بالکل اس کی اپنی اماں کے جیسے کئی دلاسے اور تسلیاں دیں۔

خوشی کے تمام اسباب میسر تھے مگر مردنی تھی کہ من کو پرانے اور خستہ کھنڈر کی دیواروں پر لگے جالوں کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔

''نوری میری بچی...... ناشکری نعمتوں کو کھا جاتی ہے۔ خوش رہا کرو۔ مجازی خدا کی خوشنودی ہی حقیقی خدا کی خوشنودی ہے۔'' ہفتے بعد وہ اپنے ویران چہرے سمیت ماں کے آگے پلکیں جھکائے بیٹھی تھی اور اس بار اپنے گھر واپسی ہوئی تو اماں نے نصیحتوں اور ہدایات کی ایک اور بڑی سی گھڑی اس مرمریں سی لڑکی کے سر پر لاد دی۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ ایک ہلکا سا تبسم نوری نے اپنے لبوں پر چپکا لیا۔ آنکھیں بھلے دل کی حالت کہتی پھرتیں مگر ہر کوئی اداس نینوں کی زبان نہیں پڑھ سکتا۔

رات کا فسانہ تو صرف وہی دو وجود جانتے تھے مگر دن بھر ہر آنکھ دیکھتی کہ اسد کس طرح نوری کو اپنی پلکوں پر بٹھائے رکھتا ہے اس کے ناز نخرے اٹھائے نہیں تھکتا۔

آٹھویں دن کچن میں گھسی تو ساس نے لاڈ سے ڈانٹ دیا

''ابھی تم ہنسو، کھیلو اور کھل کر اپنی زندگی جیو۔ خدا تم دونوں کی محبتیں یونہی سلامت رکھے اور بد نظروں سے میری جوڑی محفوظ رکھے۔ ابھی تو تمہاری مہندی بھی نہیں سوکھی۔۔۔ بہت زندگی پڑی ہے ان سب کاموں کے لیے...... یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے سنبھالتی رہنا۔''

اور وہ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کی لکیریں کھوجنے لگی۔ کیسا یہ نصیبا پایا تھا اس کرم جلی نے۔

دن بھر تو وہ خود کو جیسے تیسے مشغول رکھتی۔ ہنستی مسکراتی آنکھوں سے خود کو بڑی فنکارہ ثابت کر لیتی مگر اندھیرا پھیلتے ہی اس کی نسوانیت کا پندار ٹوٹ جاتا اور اماں کی تمام نصیحتیں بھول کر نوری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

''کئی دفعہ وہ خواب میں خود کو ایک لق دق صحراء میں سوکھے حلق کے ساتھ پانی تلاشتے بھاگتے ہوئے دیکھتی۔ وسیع و عریض ریت کے سمندر میں کوئی ذی روح تک اسے دکھائی نہ دیتا۔ اس صحرا میں نوری کو کسی فرات کی نہیں بس چند

گھونٹ پانی کی تلاش ہوتی۔

پھر اچانک سے کوئی مہربان اجنبی اس کی مدد کو آ پہنچتا۔۔۔ بغیر کوئی لفظ بولے وہ اس کے خشک ہونٹوں کو دیکھتے ہی اپنا مشکیزہ نوری کو سونپ کر غائب ہو جاتا۔

نوری مشکیزہ لبوں سے لگاتی مگر اس کے حلق تک پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچتی۔۔۔ مشکیزہ خالی ہوتا۔ حلق میں کانٹے اگنے لگتے اور خواب ٹوٹ جاتا وہ اپنا گلا پکڑے اٹھ بیٹھتی''

اسد اٹھتا اسے تسلیاں، دلاسے اور واسطے دیتا اور وہ اپنی آنکھیں رگڑ کر چپ سادھ لیتی کہ یہی میرا نصیب تھا جو میں نے پالیا۔

وقت کی رفتار ازل سے یکساں رہی ہے مگر وقت میں جیتے لوگ اس حقیقت سے ہمیشہ منکر رہے ہیں۔ تتلیوں کے سنگ اڑتے اور جگنوؤں کے پیچھے خوشی خوشی بھاگتے انسانوں کو یہ وقت بھی تتلیوں کی طرح پر لگائے اڑتا اور کسی برق رفتار بے لگام گھوڑے کے جیسے بھاگتا محسوس ہوتا ہے اور جن پر ''وقت'' ہوا نہیں ایک لمحہ سال برابر محسوس ہوتا ہے۔

نوری کا شمار بھی موخر الذکر انسانوں میں تھا۔ اس کڑے وقت کے لمحے آہستگی سے ایک ایک کر کے اس کی مٹھیوں سے سرکتے رہے اور یوں پانچ سال بیت گئے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے چہروں سے نقاب بھی اٹھتے چلے گئے، کئی اپنوں کے چہروں سے اپنائیت کی پرتیں ہٹ گئیں اور لوگوں کے رویئے بھی بدلتے چلے گئے۔ اب وہ گھر بھر کے ہاتھ کا چھالا نہیں رہی تھی

دن بھر خود کو گھر کے کام کاج میں تھکا مارتی۔ مگر اسد کی ماں کے دل سے وہ آہستہ آہستہ اترنے لگی۔ رویئے بدلتے لوگوں میں پہلا چہرہ اس کی اپنی ساس کا تھا۔

جسے آئے دن نوری سے پرخاش رہنے لگی تھی۔ نوری کے اٹھنے، بیٹھنے، پہننے، اوڑھنے غرض ہر کام میں کیڑے نکالنا اس نے اپنا وطیرہ بنا لیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ''پوتی پوتے'' کی مالا جپتی رہتی مگر پانچ سال گزرنے کے باوجود بھی کسی کو ایسی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اب ان کی ضد کے آگے کون کھڑا ہوتا بھلا؟

پانچ سال بعد مہروز بیگم نے اب ٹھان لیا تھا کہ وہ اپنا نام اور نسل زندہ رکھنے کے لیے بیٹے کی دوسری شادی کرے گی۔ گھر میں اک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نئے منصوبے کی سب سے بڑی مخالف ''نوری'' خود تھی۔ جس نے ایک عرصے سے اپنی ساس کا ہر اک طنز و نشتر چپ چاپ سہا اور کبھی اپنی زبان کو شکوے سے میلا نہ ہونے دیا۔

نوری نے قسم کھالی تھی کہ اسد کی دوسری شادی اس کے جیتے جی نہیں ہوگی۔

''کیوں نہیں ہونے دو گی دوسری شادی۔۔۔ خود تو بانجھ ہو کیوں میری نسل کی دشمن بنی پھرتی ہو، کون سا منحوس دن تھا جب میں تمہیں اپنے بیٹے کے لیے بیاہ کر لائی تھی۔ کتنے ناز اور چونچلے اٹھائے مگر پھوٹی قسمت تم بانجھ ہی نکلی۔۔۔ میں بھی دیکھتی ہوں تم کب تک اور کیسے روکتی ہو مجھے۔'' مہروز بیگم نوری کی اس جرات پر ہی سیخ پا ہو جاتیں۔

گو کہ وہ بے اختیار تھی مگر اپنے کمزور وجود اور احتجاج کے ساتھ ساس کے آگے ڈٹی رہی

اور پھر وہی ہوا۔ ماں نے بیٹے کو پاس بٹھا کے جذباتی حربے آزمانا شروع کر دیئے۔ طرح طرح کے واسطے دیئے مگر اسد نے بھی دوسرا نکاح کرنے سے سرے سے انکار کر دیا۔۔۔ اور پھر ماں کے مسلسل اصرار پر بپھر بھی گیا

مہروز بیگم اپنے فرمانبردار بیٹے کے منہ میں بہو کی زبان دیکھ کر ہی دنگ رہ گئیں۔

''کر دیا نا اس منحوس نے جادو تم پر۔۔۔ پڑھا دیں نا پٹیاں کمبخت ماری نے۔۔۔ وہ بانجھ ہے اسد۔نوری تیری نسل نہیں بڑھا سکتی۔

اللہ نا کرے تمہیں کچھ ہوگیا تو تمہارا نام ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ ہمارے بعد قبروں پر فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔۔۔

''وہ منحوس ہے بانجھ ہے، ہے بیٹا۔ بھلے نوری کو طلاق مت دو لیکن دوسری شادی کر لو۔''

''نہیں امی جان کچھ بھی ہو جائے مگر خدارا ایسا ہرگز مت کیجیے۔آپ میری ماں ہیں اولین حق آپ کا ہی ہے میں نے آج تک آپ کے کسی حکم سے کبھی رو گردانی نہیں کی۔لیکن یہ ظلم ہے میں اس بے زبان پر ایسا ظلم کبھی نہیں کر سکتا''

''کوئی ظلم نہیں ہے اسد۔۔۔ اور تم کون سا شریعت سے باہر جا رہے ہو، مرد کو چار کی اجازت ہے۔خدا کے فضل سے تم ابھی جوان جہان ہو، کما رہے ہو۔۔۔ میں تمہارے لیے رشتہ ڈھونڈتی ہوں جلد ہی۔تم دیکھنا نوری سے بھی حسین دلہن ڈھونڈ دوں گی تجھے۔وہ منحوس بانجھ عورت اس گھر کو وارث تو دے نہیں سکتی الٹا ہماری نسل کی دشمن بنی بیٹھی ہے۔''

اور وہ ''بانجھ'' باہر کھڑی اپنی ساس کے عنایت کردہ القابات پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

رات ہوئی تو اسد جھکی آنکھوں کے ساتھ ماں کا فرمان نوری کو سنانے لگا اور وہ سنتے ہی بپھر گئی۔

''ہرگز نہیں اسد۔۔۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔میرے جیتے جی آپ دوسری شادی بالکل نہیں کریں گے بس یہ میرا بھی آخری فیصلہ ہے۔''

اسد بیچارا چکی کے دو پاٹوں میں پھس کے رہ

غزل

دیوار سے کلام کیا اور چل پڑے
ہمسائیگی میں نام کیا اور چل پڑے

جنت بدست راہ میں آئے تھے واعظاں
ہم نے انہیں سلام کیا اور چل پڑے

اک غم تھا جس نے روک رکھا تھا وجود میں
اس غم کا انہدام کیا اور چل پڑے

دعوت تھی دشتِ نجد سے اِک ہم مزاج کی
مجنوں کے ہاں قیام کیا اور چل پڑے

ہر جسم، جس میں 'ہونے' کا شر تھا، فنا کیا
اپنا بھی انہدام کیا اور چل پڑے

علی زریون

گیا۔۔۔ ایک طرف جنم دینے والی ماں تھی اور دوسری طرف محبت کرنے والی وفا شعار بیوی۔ جس نے آج تک کبھی شکوے کا لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا اور ہمیشہ اس کی عزت کی حفاظت کی تھی۔۔۔

لاچار ماں کے آگے سر جھکائے اور ہاتھ جوڑے بیٹھ گیا۔۔۔ مگر مہروز بیگم بپھر گئیں۔

''اسد۔۔۔ تم اس چڑیل کو آج ہی طلاق دو گے۔۔۔ اگر میرے بیٹے ہو تو ابھی اس سے پیچھا چھڑاؤ۔ یہ بانجھ عورت کبھی تمہاری دوسری بیوی کی اولاد نہیں دیکھ سکے گی۔ یہ حاسد ہے۔ خود تو اس نعمت سے محروم ہے ہماری خوشیاں بھی اس سے برداشت نہیں ہوں گی۔''

اسد نے ماں کو ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ مان کے ہی نہیں دیں۔

''تمہیں میرے دودھ کی قسم اگر انکار کیا تو...... تم اس بانجھ عورت کے لیے آج ماں کو پیٹھ دکھا رہے ہو جس نے تمہیں نو ماہ پیٹ میں رکھا جس نے جنم دیا، دودھ پلایا، تمہاری پرورش کی اور وہ منحوس جسے پانچ سال نہیں ہوئے آئے جس نے تمہیں اپنے پلو سے باندھ دیا وہ تمہیں ماں سے زیادہ پیاری ہوگئی؟

کون سے پردے ڈال دیے ہیں اس نے تمہاری عقل پر۔۔۔؟ گردن کی تنی ہوئی نسوں کے ساتھ مہروز بیگم اپنے سپوت پر چلانے لگیں۔

اگر میرے بیٹے ہو تو اسے آج ہی طلاق دو گے تم۔''

جنم دینے والی کے احسان زیادہ تھے سو دودھ جیت گیا اور محبت کو شکست نصیب ہوئی۔ نوری کی پیشانی پر مطلقہ کا ٹھپہ لگ گیا۔ اور وہ اپنی لکیریں کھوجتی اپنے نصیب پر حیرت زدہ تھی کہ آج وہ روئے یا مسکرائے؟

اماں سمجھاتی تھی نوری ''شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور آج اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ اماں کہتی تھی۔

''نوری شوہر بیوی کے سر کی چھت ہوتے ہیں، شوہر کے ہر حکم کی بجا آوری اور اطاعت تم پر فرض ہے اور فرض نبھاتے نبھاتے آج نوری کے سر پر ہی چھت گر پڑی تھی۔''

اس نے اسد کے گھر سے کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا ماسوائے اپنے شکستہ وجود اور اپنے لال عروسی دوپٹے کے، جس میں اماں کی بہت سی نصیحتیں گرہ لگا کے بندھی ہوئی تھیں اور ان میں سب سے اولین نصیحت شوہر کی عزت اور اس کے ہر راز کی حفاظت تھی۔ اس کی کمی بیشیوں پر پردہ پوشی کرنا تھی۔

نوری ماں کو کیسے سمجھاتی کہ وہ اس راز کی حفاظت کرتے کرتے آج 'بانجھ' کا ٹھپہ لگوا کر اور اپنی پیشانی داغدار کروا کے طلاق یافتہ کی سند پا چکی ہے۔

وہ اپنی ساس کو کیسے سمجھاتی کہ وہ اسد کی دوسری شادی کے کیوں خلاف تھی اور اسد کیوں دن بھر اس کے گن گاتے نہیں تھکتا تھا؟

پانچ سال تو نوری مہروز بیگم کو سمجھا ہی نہیں سکی کہ اپنی نسل کی بقاء اور انا کی تسکین کے لیے وہ کسی اور نوری کا جیون تباہ کرنے جا رہی تھی۔ وہ تو جیتے جی اپنے مجازی خدا کے راز کی حفاظت میں گھل گئی۔

مگر پیا گھر چھوڑنے سے پہلے وہ اپنی ساس کی سماعتوں میں سیسہ گھول کے اسے ورطۂ حیرت میں ضرور ڈال آئی تھی

کیونکہ اس سے قبل سوائے ان دونوں کے کوئی تیسرا انسان نہیں جانتا تھا کہ 'بانجھ' نوری نہیں بلکہ اسد خود تھا۔ کمی نوری میں نہیں اسد میں تھی۔ وہ مکمل عورت ہے مگر اسد مکمل مرد نہیں تھا۔

□□......۞......□□

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف خوش خط لکھیں۔ حاشیہ لگائیں صفحہ کی ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں اور اس کی فوٹو کاپی کرا کر اپنے پاس رکھیں۔

☆ قسط وار ناول لکھنے کے لیے ادارہ سے اجازت حاصل کرنا لازمی ہے۔

☆ نئی لکھاری بہنیں کوشش کریں پہلے افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ پر طبع آزمائی کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ادارہ نے ناقابل اشاعت تحریروں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔

☆ مسودے کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخری صفحہ پر اپنا مکمل نام' پتا اور رابطہ نمبر خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانی ای میل کرنے کے لیے ان پیج کی فائل ہو' ایم ایس ورڈ کی فائل میں اردو میں لکھیں تحریر ہونی چاہیے یا یونی کوڈ پر ہو۔ کہانی کے نام سے فائل کا نام رکھنا ہوگا۔ کہانی کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخر میں اپنا پورا نام مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی لکھنا ہوگا۔

☆ ای میل چاہے کہانی کی کرنی ہو یا مستقل سلسلوں میں ہمیشہ نیو ای میل کا انتخاب کریں اور سبجیکٹ میں کہانی اور سلسلے کا نام لکھیں۔ جوابی میل پر کچھ بھی ای میل نا کریں اگر جوابی میل پر کچھ بھی ای میل کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

☆ ای میل پر کہانی پر مستقل سلسلے میں شرکت کے لیے اسکین' امیج' رومن یا پی ڈی ایف قابل قبول نہیں ہوتی۔

☆ دیگر سوشل ایپ پر بھی کہانی یا سلسلوں کی کوئی بھی چیز قابل قبول نہیں ہوگی۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک یا کوریئر کے ذریعے ارسال کیجیے۔

پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

سلسلہ وار ناول

ڈاکٹر سیمیں رخ

بادِ سموم

قسط 22

چولستان کے صحرا سے شروع ہونے والی ٹھنڈی اور میٹھی محبت اور لمحہ

بدلتی داستانِ حیات جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی!

اس کے بعد کچھ رسمیں سہاگنوں کی تھیں۔ اپنی جھولیوں میں مُٹھی بھر گندم اور خشک کھجوریں لیے انہوں نے لاڑی اور لاڑے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ رنگین ہونٹوں پر سہاگ کے گیت تھے۔ گندم کے دانوں کو ایک قطار میں بکھیرتے ہوئے انہوں نے خشک پھولوں کی پتیاں ہوا میں اچھالیں اور چھنچھناتی ہوئی پازیب سسی کے مہندی رنگ پیروں کے گرد باندھ دی۔ پازیب بندھتے ہی موسیٰ نے سکوں سے بھری تھیلی کے سنہرے دھاگے کو کھولا اور بے شمار چمکتے' چھنکتے سکے ہوا میں اچھال دیے۔ کچھ کاغذی نوٹ بھی تھے جو سہاگنوں کی جھولیوں میں آ گرے تھے۔

یہ اُس نئے جوڑے کی خوشی اور خوشحالی کی علامت تھا۔ کچھ سکے گامن بی بی نے اٹھا کر سسی کے آنچل میں باندھ کر گندم کے دانوں کو چھوٹی سی پوٹلی کا سنہرا دھاگہ اس کے گانے کے اردگرد لپیٹ دیا۔ سسی کی آنکھوں کا کاجل مسکرانے لگا تھا۔ اس کے آنچل کا سرا ہوا سے لہرایا تو اسے موسیٰ کی انگشت میں چمکتا وہ چھلا نظر آیا جو سسی نے فیروز اور سکینہ ماں کی ہمراہی میں مزار کی جانب جاتے ہوئے ایک پڑاؤ سے خریدا تھا۔

سورج کی آخری کرنوں کے رخصت ہوتے ہی اس کی رخصتی کی گھڑی بھی آ گئی تھی۔ چاند کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے اسے اپنے نئے گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے تھے روایت کے مطابق مکمل چاند جب دھیرے دھیرے گھٹتا ہے تو دلہن کے چہرے کو اس کے سائے سے دور رکھا جاتا ہے۔ کچھ دن تک دہلیز پر چراغ چلا کر یہ باور کیا جاتا ہے کہ تمام شب اس چوکھٹ پر روشنی رہے گی۔ اور ریت کے سینے پر دمکتی ماہتابی کرنوں کی چھب عمر رہے گی۔



شہر بانو نے فرزانہ کو اس کی منزل تک تو پہنچا دیا تھا لیکن اب وہ اس جگہ اس مکان میں خود کو بہت اجنبی محسوس کرتی تھی۔ کچھ جمع پونجی اس کے ہمراہ تھی واپسی کے راستے تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیے تھے۔

آگے پڑاؤ جانے کہاں تھا۔ کس منزل میں کس راہ میں پوشیدہ تھا یہاں صاحباں' شہباز' فرزانہ اور باقی لوگ اس کا یوں خیال رکھتے تھے جیسے وہ اس دنیا کی باسی نہ ہو۔ اس چھوٹے سے آنگن میں جہاں فرزانہ کی ماں نے اسے دنیا والوں سے اوجھل رکھا ہوا تھا فلک شیر کے انتظار کا دیا جلتا رہتا تھا۔ فرزانہ کی واپسی کے اگلے روز ہی یعقوب حسین جھکی ہوئی کمر اور جاتی ہوئی بینائی کے ساتھ بیٹی کو ملنے آیا تو فرزانہ کا دل درد کی شدت سے تھمنے لگا۔

ایک ہی برس میں اس کے غمزدہ باپ کی حالت کیا ہوگئی تھی لاٹھی کے سہارے سفید سر جھکائے دہلیز پر کھڑا کیا اس کا بابا تھا؟ فرزانہ کی آنکھوں میں دکھ کا بے آب دریا کھڑا تھا وہ اسے یوں تک رہی تھی جیسے خود کی نگاہوں پر یقین نہ ہو۔ ان دیواروں سے باہر کی دنیا کس قدر ظالم اور سنگدل تھی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں دکھائی نہ دینے والے نازیانے تھے گردنیں کاٹنے کو لفظوں کی تلوار کے ساتھ ساتھ رواجوں کے اندھے اور زہر خند ہتھیار بھی تھے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی آمد سب سے مخفی رکھی گئی تھی۔

کاش ایسا نہ ہوتا بابا...... کاش ہمارے آنگن میں وہ قیامت نہ اتری ہوتی کاش وقت کا دھارا تند اور تیز نہ ہوتا...... صاحباں نے فرزانہ کو بوڑھے باپ کے بالمقابل لا بٹھایا۔ آنکھوں کی بینائی ماند پڑ گئی تھی۔ ایک سایہ سا تھا جو کرسی پر سمٹ کر بیٹھا تھا سر پر جو نقاشی آنچل لہرا رہا تھا آنکھوں کی دھند ذرا دیر کو چھٹی اور دل کے بیچ جگہ بناتی ایک آواز ابھری۔

''فرزانہ...... میری بچی......'' جھریوں پر شبنم کے قطرے اترنے لگے تھے۔ آنکھوں کی بے نوری میں عکس جھلملانے لگے تھے۔ رنگین عکس...... جن کا ماخذ اس نے دل کے خلیوں سے نکل رہا تھا۔ بوڑھا وجود نہیں جانتا تھا کہ آس پاس دالان کے بیچ' آنگن کے اس پار کون کون کھڑا ہے لرزتے ہاتھ اٹھے اور آسمان کی طرف رخ کر کے ساکت ہو گئے۔

ہونٹ تھرتھرائے اور شبنم کی نمی میں ڈھلنے لگے۔ نہ جانے یہ دعا تھی تشکر یا خوف' شہباز نے چولہے میں لکڑیاں سلگاتی صاحباں کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا ہمیشہ کی طرح شہباز نے ماما یعقوب کے کاندھے پر خاموشی سے ہاتھ رکھ دیا محبت اور یقین کے لمس کے ساتھ......

''فرزانہ میری بہن ہے اور میں ہوں اس کا محافظ...... اب وہ میرے گھر میں...... میری پناہ میں ہے' یہ آپ کی ہی دعا کی تاثیر ہے کہ خدا نے اسے راہ کے ہر خار سے بچا کر ہم تک پہنچا دیا ہے۔'' لگتا تھا عرصے بعد دھوپ نکلی ہے بوڑھے باپ کے لب مسکرا رہے تھے۔

صاحباں چپ چاپ لکڑیوں کو سلگاتے ہوئے' پیتل کے ڈول سے دیسی گھی نکالتے ہوئے آج بھی خاموش تھی۔ اس کا دل بے سبب اداس نہیں تھا شہر بانو نے اسے دلاور کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا لیکن ہر سوال کے جواب میں شہر بانو کے خاموش لب دیکھ کر اس کا دل وسوسوں میں گھر گیا تھا۔ بابر' قیصر فیضی اور بڑی ماں...... جانے سب کیسے تھے...... اور چھوٹی ماں...... اس کے بارے میں بھی تو شہر بانو نے

کچھ نہیں کہا تھا۔
اس کے استفسار پر گزشتہ دن فرزانہ بھی تو گم صم ہوگئی تھی اور ایک نظر شہر بانو کو دیکھ کر اس نے چپ چاپ سر جھکا لیا تھا۔ جس کٹھن سفر سے وہ گزر کر آئی تھی۔ شاید اسی کی تھکن نے اس کے ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ یہ سوچ کر صاحباں نے کچھ دن کے لیے اپنے سوال پلو میں چھپا کر رکھ لیے۔ اب وہ ان کی گرہ کھولنے کو بے چین تھی ایک شب وہ بے چین ہو کر چھت پر چلی آئی۔
یہیں گارے اور لکڑی کی مدد سے شہباز نے ایک مختصر سا کمرہ کھڑا کیا تھا اور ضروری سامان کے ساتھ شہر بانو کی رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ تمام دن یہیں گزار دیتی اور کبھی کبھی سر شام آسمان تلے ایک چٹائی پر بیٹھ کر دیر تلک تسبیح پڑھتی رہتی۔ زندگی کا سفر اب اسے تمام ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ صاحباں کے قدموں کی آہٹ کو محسوس کر کے جس شام شہر بانو نے پلٹ کر دیکھا اور پھر چٹائی پر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنانے لگی۔
''مجھے کیوں لگتا ہے خانم جیسے کچھ لفظ تمہارے دامن میں سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں جنہیں ہونٹوں پر لاتے ہوئے تم یوں خوفزدہ ہو جیسے وہ سنگریزے دلوں کو زخمی کر دیں گے۔''
شہر بانو نے گہری نظروں سے صاحباں کی جانب دیکھا۔
جن سوالات کو وہ ہونٹوں پر لاتے ہوئے خوفزدہ تھی' آج ان کا بند ٹوٹنے والا تھا۔
''خانم...... تمہاری اور فرزانہ کی خاموشی سے میرا دل لرز رہا ہے جب ماں رخصت ہوئی تھی تو عرصے تک میرا دل خوف اور دکھ سے کسی چھوٹے بچے کی طرح بلکتا رہا تھا اور پھر میں نے جینا سیکھ لیا اس زندگی سے لڑنا سیکھ لیا۔ جب خان بابا کا ڈیرا چھوڑا تو جانتی تھی کہ ایک سرکش طوفان کو اپنے پیچھے بپھرتا چھوڑ آئی ہوں جانے کیا بیتا ہوگا ان دیواروں کے بیچ...... کیا حال ہے اب وہاں کا...... کیا طوفان تھم گیا ہے یا جاتے جاتے بہت کچھ بہا کر لے گیا ہے۔''
شہر بانو نے سرمئی آسماں پر نگاہیں دوڑائیں ایسا ہی دلگیر فلک اس کے وطن میں بھی نظر آتا تھا۔ جسے اس نے رشک چمن سے ریزہ ریزہ ہو کر جلتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اپنی ہستی کو بھی پل پل گھائل ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا اور اب اس کے سامنے اس سے مخاطب جو چہرہ تھا اس کی آنکھوں میں امید کے بجھتے سائے اور ان کہے سوالات کی چبھن اسے اپنے دل کے پار پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
''تو جن دروازوں کو اپنے پیچھے بند کر آئی تھی۔ ان کے اندر اب تنہائیاں اور فقط یادیں بند ہیں بچی...... ہوا کے ذروں میں شہر بانو کی آواز ٹوٹ کر گرنے لگی۔ صاحباں کے ہاتھ میں دبا اوڑھنی کا پلو گر گیا۔
''اور میرے...... بھائی...... خان بابا...... بڑی ماں...... چھوٹی ماں...... وہ سب؟''
وہ بھی یاد بن کر جنگل کے اس پار رہ گئے ہیں۔ جہاں سے تو نے رختِ سفر باندھا تھا۔
ایک گہرا سانس لے کر شہر بانو نے صاحباں کا یخ ہوتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔
''بچی تیرے بھائی محفوظ ہیں اور اب سنگین خان کے ڈیرے پر ہیں۔'' جملہ ختم ہو گیا تھا۔ لفظ خاموشی

ہم اور آپ ایک ہیں

ادارہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں طویل عرصے سے اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں صاف ستھرا ادب پیش کر رہا ہے۔ مگر کچھ عرصے سے ہمارے شمارے بنا اجازت نیٹ پر اپ لوڈ کیے جا رہے ہیں۔ کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت یہ جرم ہے اور اس کی سخت سزا ہے۔ تمام ڈائجسٹ مالکان کی آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی کے پلیٹ فارم کے تحت ڈی جی ایف آئی سائبر کرائم ونگ سے ملاقات متوقع ہے۔ اس ملاقات میں ان غیر قانونی سائٹس کی بندش اور ان مجرموں کے خلاف سخت ترین کارروائی کی پرزور اپیل کی جائے گی پر ان چوروں کے گرفت میں آنے کے بعد ان کے بارے میں تفصیلات بھی ہم اپنے پرچوں میں شائع کریں گے۔ اپنے پڑھنے والوں سے التماس ہے کہ چوروں کا ساتھ نہ دیں۔ شمارہ خرید کر پڑھیں، ثابت کریں کہ ہم اور آپ ایک ہیں۔

میں ڈوب گئے تھے۔ خاموشی جو کبھی گہرے، دبیز پردوں میں تاریکی کی صورت ابھرتی ہے اور کبھی مہین دلدوز جرس بے نوا کو خود میں سمیٹے روح سے لپٹ جاتی ہے۔

''ہمارا گنبد تو آباد تھا خانم...... بابا کے جبر کے باوجود کتنی آوازیں آنگن میں ایک ساتھ گونجتی تھیں۔ کبھی فیضی کبھی قیصر اور کبھی بابر درختوں سے لٹکتے ہوئے غلیل سے چڑیوں کا شکار کرتے کتنا شور مچاتے تھے۔ اور بڑی ماں...... بڑی ماں کیا اب تک وہیں ہیں...... حویلی میں...... چھوٹی ماں کے ساتھ......

صاحباں کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس نے پلٹ کر شہباز کو دیکھا جو چپکے سے کچھ ہی لمحے قبل چھت پر آیا تھا۔

شہر بانو نے دونوں کو ایک ساتھ چٹائی پر بٹھایا اور تسبیح کے دانے ایک طرف رکھ دیے۔ قندھاری پتھر کے یہ دانے چاندنی رات میں دمک رہے تھے۔ ایسی ہی چمک صاحباں کے چہرے پر گرتے ان قطروں کی تھی جو دل کی کسی بے قرار وادی سے نکلے تھے۔ شہر بانو کو یوں لگا جیسے یہ آنسو نہ ہوں...... تسبیح کے دانے ہوں اور بکھر کر مجسم ہو گئے ہوں۔

خاموش لبوں پر مشکل وقت تھا جنبش کرتے تو دکھ بانٹتے سکوت کرتے تو ابہام میں الجھے ہوئے بھنوروں کو رقصاں کر دیتے۔

''اُس شب جب صاحباں شہباز کے ساتھ روانہ ہوئی تھی اور موہل نے دونوں کو اندھیرے کے بیچ خاموش ہونٹوں سے الوداع کہا تھا...... شہر بانو جاگ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ماں کے زیورات سینے سے لگائے سرخ اوڑھنی میں چھپی صاحباں کیا چاہتی ہے...... کتنی خاموشی سے اس نے دردِ شکم کا عذر پیش کر کے آنکھیں موند لی تھیں۔ صاحباں اور شہباز کے قدموں کی آواز جب تک آتی رہی اُس کی آنکھیں بند رہیں اور دل دعا گو رہا۔ ان کی بہتری کا ان کے سفر کی آسانی کا اور اب وہ دونوں منزل تو پا چکے تھے لیکن اس طوفان سے بے خبر تھے جو گھر کے مکینوں کو بہا کر لے گیا تھا۔

مختصر سے لفظوں کو اس نے اپنے دامن میں سمیٹا اور دھیرے دھیرے وہ سب کہہ دیا جسے لبوں پر لاتے ہوئے وہ روزِ اول سے گریزاں تھی۔ لفظ بھی امانت ہوتے ہیں اور جذبات بھی...... یہ شہر بانو آج احساس ہوا تھا جب اس نے صاحباں سے اس کے پیاروں کے بچھڑنے کا دکھ بانٹا تھا۔

☆......☆......☆

پھولوں کا موسم گزر چکا تھا اور چاند کا چہرہ دھیرے دھیرے گھٹ رہا تھا جب ایک دوپہر لمبے ہوتے ہوئے دھوپ کے سائے میں حویلی کے بیچ علی حسن کی گاڑی کا انجن چیخ کر خاموش ہو گیا۔ شہزادی نے بے چینی سے طاقچے کے اُس پار نگاہ کی طاقچے کے ننھے سے شگاف سے اسے جو چہرہ نظر آیا وہ علی حسن کا تھا...... پہلے کی طرح ہشاش بشاش اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جو شاید اس کے مہمان تھے۔ غوث بخش حسبِ معمول سائیں کے ساتھ تھا۔

لالن نے ایک روز پہلے ہی اس کی خوابگاہ کو صاف کر کے پھول دان میں کلیاں اور گل ڈالے تھے۔ وہ کلیاں اب بھی تازہ تھیں اور خوشبو سے مہک رہی تھیں۔

شہزادی نے پلٹ کر بالی کو دیکھا اور پھر موہل کے کمرے کے بند دروازے کو...... مہر علی اور چاند محمد کچھ

دن پہلے ہی موسیٰ کے بیاہ کے بعد لوٹے تھے اور ہمراہ چولستان کی بوندی اور پھوگ مکھانے لائے تھے۔
بوندی کی پرات کو وہ اس نے دانستاً مول سے ذکر نہیں کیا تھا۔ جانے موسیٰ کو اب یہاں کب لوٹنا تھا۔ مہر علی
کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے کام ادھورا چھوڑ کر اسمٰعیل کے پاس چلی آئی۔

''سائیں لوٹ آیا ہے۔''

''ہاں...... ہاں شور سن کر اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ رونق سائیں کی وجہ سے ہے درگاہ کے کنویں میں
ڈول اور رسی پھینک کر سلام کرتے جاؤں گا۔ آج جمعرات ہے سائیں یہاں دیا جلانے آئے گا۔ اندر ج
شکار پور سے آئے نئے چراغ رکھے ہیں وہ لے آ کیسے سندر چراغ ہیں وہ سندھ کی سوہنی مٹی سے گندھے
ہوئے...... سائیں دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔''

شہزادی اسمٰعیل کو چپ چاپ دیکھتی رہ گئی۔ دل میں دبا خوف ہونٹوں پر نہ آ سکا۔ دیوار کے اس پا
مریدوں کے بچے بیٹھے تھے اور سامنے جانے کون کون، اسمٰعیل کو چھوڑ کر وہ حویلی تک آئی اور پھر وہاں
رُکے بنا پلٹ کر مول کے پاس چلی آئی۔ بچی کو پنگھوڑے میں لٹائے وہ دھیمی آواز میں لوری گنگنا رہی تھی۔
ایک ہاتھ بچی پر دھرا ہوا تھا اور دوسرے سے اس نے اوڑھنی کا کونہ تھاما ہوا تھا۔ شہزادی کو دیکھ کر اس
کے متحرک لب ساکت ہو گئے۔ شہزادی بنا کچھ کہے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس کے چہرے کو تکنے
لگی۔

جو ایک ماں کا چہرہ تھا فقط ایک ماں کا محبت اور حلاوت کے رنگوں میں دھلا ہوا جس کی ایک ایک جنبش
میں نرمی، حلاوت اور حرمت پوشیدہ تھی۔ اس کی اوڑھنی کا رنگ گو بوسیدہ ہو گیا تھا لیکن اس میں مامتا کے
دلکش عکس کی جھلک تھی۔ کبھی وہ محبوبہ رہی ہوگی، اور دلبر با بیوی بھی...... لیکن اب وہ فقط ایک ماں تھی ہر چ
سے ہر احساس ہر لذت سے عاری صرف ایک ماں......

''ادی...... سائیں لوٹ آیا ہے۔'' خشک ہونٹ سرسرائے اور پنگھوڑے کو جھلاتی ہاتھ تھم گئے۔ تھرتھرا
ہونٹوں نے کوئی لفظ، کوئی صدا بلند نہیں کی۔

''میرا دل خوفزدہ ہے...... چوکرو...... تو جانتی ہے نا کیوں...... اسی لمحے کا خوف تھا مجھے...... اور ا
موسیٰ کو بھی آنے والا سورج کیسا رنگ لائے گا...... کیسی دھوپ اڑائے گا کیا خبر...... میں، اسمٰعیل، اد
لالن ہم سب کمزور ہیں چوکرو...... تیری دیوار تیری ڈھال نہیں بن سکے۔''

''اور کیا خبر...... دیوار بنانے کی ضرورت ہی نہ پڑے ادی...... تو نے ہی کہا تھا نا کہ تیرا سائیں بہت
مہربان اور نیک دل ہے۔''

''ہاں ادی یہ سچ ہے لیکن......'' وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔

''اب میں چلتی ہوں باورچی خانے کا کام بکھرا ہوا ہے...... مہمان خانے کو کھول کر نئے بستر بچھا
ہیں باہر بادل کا من بھی برسنے کو ہے جو ہلدی سوکھنے کو پھیلائی تھی وہ ادی لالن اٹھانا بھول گئی ہے شاید......
اگر ساون برسا تو تیرے میٹھے بیروں کی نئی شاخیں پھوٹیں گی چوکرو...... نئے موسم کے نئے شگوفے......
تیری بچی کی طرح......'' وہ دروازے تک جاتے جاتے لوٹ آئی۔

''اب بچی کا نام سوچ لے...... کیا اس کے سیانا ہونے پر رکھے گی؟''

''نام......؟'' موتل نے پنکھے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ گلابی چہرہ اور سیاہ آنکھیں بچی سسی کی طرح دکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی یاد کا عکس مجسم ہو کر ننھی روح میں ڈھل گیا ہو۔ بچپن میں سسی کی ایک گڑیا تھی روئی اور کپڑے سے بنی ہوئی پھولے گالوں اور لمبے پراندے والی گڑیا جسے سسی پیار سے ماہی کہتی تھی۔

''ماہی......'' آنکھ میں جگنو چمکا یاد کا جگنو......اوس میں بھیگا ہوا۔

''یہ ماہی ہے......میری ماہی......سسی کے چہرے والی ماہی......'' شہزادی ایک لمحے کے لیے مسکرائی اور پھر خوف کا ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر لہرایا۔

''سائیں مہربانی اور حلیم صحیح لیکن مرد کی خلوت اور جلوت جدا جدا ہوتی ہے۔ الگ الگ زاویوں والی دورخی صورت کی مثل' حویلی کی جلتی بجھتی بتیوں کے بیچ مردان خانے کی رونق دیواروں کے ہر زاویے پر منعکس ہو رہی تھی۔ رسوئی سے اٹھتے ہوئے پکوانوں کے دھوئیں اور تندور کی تپش میں رنگ بدلتی گندم نے خاموش فضا کا رنگ بدل دیا تھا۔ مہر علی پچھلے دروازے سے چپکے چپکے رنگین بوتلیں اٹھا کر لے گیا تھا اور اب لالن نے چاند محمد کے کہنے پر نازک گلاسوں کو تھال میں سجا دیا تھا۔ غوث بخش جانے کہاں تھا۔ اسمعیل اسے ڈھونڈتا ہوا باہر آیا اور پھر شہزادی سے پوچھ کر پچھواڑے کی جانب چلا آیا۔ یہاں سے جو راستہ بیرونی دروازے کی جانب جاتا تھا۔ اسی کے ایک کنارے پر غوث بخش خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاسا تھا اور اس کاسے سے چھلکتے پانی پر شب کے تاریک سائے......چاند کی روشنی بادل کے بکھرے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اسمعیل چند ثانیے اسے تکتا رہا اور پھر کچھ کہے بنے لوٹ گیا۔ جانے کیوں اسے آج غوث بخش متذبذب اور بے چین دکھائی دیا تھا۔ حویلی کی رونق سے دور وہ یوں بیٹھا تھا جیسے اسے دنیا والوں کی خبر ہو نہ پرواہ......سائیں کے ساتھ جو مہمان آئے تھے وہ ایک یا دو دن کے ہی مہمان تھے علی حسن کو البتہ کچھ دن یہیں رہنا تھا۔ کاروباری معاملات کے علاوہ زمینوں کے حساب کتاب بھی تھے۔ آنے والے انتخاب کے چناؤ کا مرحلہ بھی تھا۔

حویلی کے فانوس روشن ہو چکے تھے اور راہداریوں میں بچھے لال غالیچے قدموں کی دھمک سے گونجنے لگے تھے۔ علی حسن پہلے سے صحت مند دکھائی دیتا تھا اس کی چال کی چستی اور تیزی پلٹ چکی تھی۔ عرصے کے بعد اُس نے بڑے ہال کی قد آدم الماری کی دراز سے شکاری بندوق نکال کر غوث بخش کو صفائی کے لیے دی تھی۔ شاید وہ مہمانوں کے ہمراہ شکار پر جانا چاہتا تھا۔ گو اماوس کی راتیں شروع ہونے والی تھیں لیکن اس تیرہ شبی میں بھی اس اس کا شوق مدھم نہیں ہو پایا تھا۔ بارش تھمنے تک غوث بخش وہیں بیٹھا رہا۔

حویلی کی بتیاں گل تھیں بندوق صاف کیے ہوئے گھنٹوں بیت چکے تھے۔ لیکن متذبذب دل نے نیند کو یوں پلٹا دیا تھا جیسے وہ جاگنے کا آرزومند ہو سر پوشیدہ نگاہیں بار بار پچھواڑے کی جانب اٹھتی تھیں چلتے سمے موتی خان نے اس کے ہاتھ تھام کر بند لبوں سے عہد نبھانے کی استدعا کی تھی۔

اس کی آنکھوں کی آس اور بند ہونٹوں کی اَن کہی آواز حویلی کے نشیب و فراز میں اب بھی سانس لے رہی تھی یوں جیسے اس کی گونج نہیں وہ وہاں خود موجود ہو......بکھری سوچوں کے ساتھ شب کا سفر ٹوٹا

اور شفق کی سرخ ہوتی روشنی کے اس پار اس نے خود کو وہیں پایا جہاں گزشتہ شب بارش کی پھواریں برس کر تھمی تھیں۔ اندر سے بلاوا پا کر اس کے قدم یوں اٹھے جیسے دور کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ فسق اور شر کے میل سے جب روح میں بھاری پن اترائے تو بدن بھی تھکنے لگتا ہے۔ بھٹکے ہوئے قدموں کو راست پر لانے کے لیے جس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ناتمام پست اور شکستہ ہو جاتی ہے۔ تمام دن وہ ہاں اور نہ کی کشمکش کے درمیان پریشان حال رہا کبھی دل کے بیچ سویرا ابھرنے لگتا اور کبھی گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ آج اسے علی حسن کو مہمانوں کے ہمراہ لے کر مکلی اور موہنجوداڑو جانا تھا۔ وہ بے خیالی میں یوں جیپ چلاتا رہا کہ ایک دو دفعہ مہر علی کو بیچ راہ میں رک کر راستہ بدلنا پڑا۔ پُر پیچ سڑکوں کے بیچ جو پڑاؤ آتے تھے وہاں بھی وہ چپ چاپ مٹی کی ٹھیکریوں پر بیٹھا رہا۔ زردیوں میں گھلا مومل کا چہرہ، جس کی جھلک اس نے صرف ایک بار دیکھی تھی۔

مکلی کی ٹوٹی پھوٹی قبروں کے بیچ یوں ابھر رہا تھا جیسے اس کے تمام خواب اور وہ خود یہیں مدفون ہو، ہواؤں میں اڑتے اڑتے ٹیلوں کی خاک اس کی ذات کی ہمزاد تھی۔ بے سمت، سرگرداں بےعمل زدہ خاک......

اگلے دن شکار کا سفر تھا سندھ کا گھنا جنگل اور اس کے بیچ جانوروں کا تعاقب تھا۔ ہاتھوں میں تنی بندوقیں تھیں جا بجا پڑاؤ ہو رہا تھا۔ جیپ کی پشت پر خود کو ٹکائے آج بھی وہ سوچوں کے بھنور میں لپٹا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں درختوں کے بیچ چھپے ہوئے راستے واضح نہ تھے تاہم پتوں کی سرسراہٹ تھی یا قدموں کی آہٹ کہ وہ بار بار چونک جاتا تھا یوں جیسے کسی خوفزدہ جود کی آہٹیں ان درختوں کے بیچ اب بھی باقی تھیں۔ غوث بخش کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کا وہ منظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ واضح ہو رہا تھا۔

جب دلاور خان کی چار دیواری کے بیچ سے خوف سے زرد ہوتے وجود کو اس نے درخت کی بے وقعت کمزور شاخ کی مانند اٹھا لیا تھا۔ اس کی بے قرار گھٹی گھٹی آوازیں اس لمحے یوں بلند ہو رہی تھیں جیسے صنوبر کے ان درختوں سے اس کی آہیں اب بھی لپٹی ہوئی ہوں۔ گہری ہوتی شب کے سائے میں گم گشتہ پرچھائیوں کے مٹے مٹے نقوش عریاں ہو رہے تھے۔ معاً کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا وہ چونک کر پلٹا۔

''کس خیال میں گم ہو غوث بخش چنکارہ تمہارے قریب سے گولی کی زد سے بچ کر نکل گیا اور تمہیں خبر بھی نہیں ہوئیں۔ خیر تو ہے......'' چاند محمد نے رائفل کے سرے پر انگلی پھیرتے ہوئے گرد جھاڑی اور اس کی نلکی میں گولیاں بھرنے لگا۔

''سائیں علی حسن مجھے بلا رہا ہے......اگلا پڑاؤ اب کچھ میل دور جنوب کی سمت ہوگا۔ یہاں چنکارہ کے شکار کے لیے سائیں پہلے بھی آتا رہا ہے۔''

''ہوں...... ہاں......'' غوث بخش نے اپنی رائفل کو تھام کر جوتے کسے اور اگلے پڑاؤ کی تیاری کرنے لگا۔ دو راتوں کے طویل پہروں کے بعد چنکارہ اور ہرنی کا شکار مکمل ہوتے ہی جیپیں حویلی پہنچیں تو باورچی خانے کی آگ پھر سے روشن ہو گئی شہزادی اور لالن نے چاول اور ہرن کا گوشت تیار کرنے کے لیے بڑے بڑے پتیلوں کو آگ پر چڑھا دیا تھا۔ سائیں جب بھی شکار سے واپس آتا تھا

..ن کے گوشت کو چاول اور انار دانے کے خشک بیجوں سے سجا کر تھال بھرے جاتے تھے۔ غوث بخش ..وئی کی جانب کم کم آتا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے بجائے تندور کی جانب کھلنے والے دروازے کی جانب آ گیا۔

ساگ کے ہرے پتے چنتے ہوئے شہزادی نے غوث بخش کو دروازے کے عقب میں کھڑے پایا اور اس کے متحریک ہاتھ تھم گئے۔ غوث بخش کے چہرے کا جو رنگ تھا وہ شہزادی کے لیے نیا اور اجنبی تھا۔ چند لمحے خاموشی سے وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر آہستگی سے بولی۔

''خیر تو ہے ادا......'' غوث بخش چپ رہا ہوا کے پروں پر ماہی کے رونے کی آواز ابھر رہی تھی اسی لمحے غوث بخش نے دروازے کا پٹ تھاما اور پلٹ کر پچھواڑے کی جانب دیکھا۔ بچی کے رونے کی آواز کچھ دیر تلک آتی رہی اور پھر تھم گئی۔

دروازے کا پٹ چھوڑ کر وہ اندر آیا اور لکڑی کے پیڑھے پر بیٹھ گیا۔ شہزادی کے چہرے پر ابھرنے والا سوال گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کام کے لیے ہاتھ بڑھائے اور پھر جانے کیا سوچ کر اس کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔ آنکھوں میں اب سوال سے زیادہ پریشانی ہویدا تھی۔

''کیسی ہے اب...... وہ...... دلاور کی بیوہ......'' غوث بخش نے رکتے ہوئے کہا۔ شہزادی نے پہلے اس کی آنکھوں کو دیکھا پھر چہرے کو...... اس سوال کا منبع کیسے تلاش کرتی کہ چہرے سے کچھ بھی عیاں نہ تھا۔

''بس...... جی رہی ہے ادا......'' مختصر سوال کا مختصر جواب تھا۔

''ہوں......'' غوث بخش نے سر جھکا لیا۔ خاموشی میں لپٹی ہوئی گھڑیاں بوجھ بن گئی تھیں۔ لمحوں کے بے چاپ دانے یہاں وہاں بکھرتے رہے۔ باورچی خانے کی آگ گہری ہوتی گئی۔ پتیلوں سے دھوئیں کے ساتھ ساتھ خوشبو اٹھنے لگی تھی۔ باہر دن تمام ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے ادا...... آج کیا رسوئی میں ہی ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟'' بالآخر لالن نے تندور دہکاتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شہزادی بھی اس کے جواب کی منتظر تھی۔ لیکن وہ اضطرابی کیفیت سے دور جانے کس دھیان میں تھا۔

''بھا...... کس خیال میں ہو...... کیا بات ہے جسے کہنے سے گھبرا رہا ہے تو......'' شہزادی نے ایک نگاہ چولہے کی آگ سے گریز کرتی لالن پر ڈالی۔ غوث بخش چپکے سے اٹھا اور پچھلے دروازے سے جو راستہ عقبی صحن کی جانب نکلتا تھا وہاں رکھے ایک مستطیل پتھر پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں شہزادی بھی آ گئی۔

''ادی...... کیسی ہے اب وہ...... دلاور کی بیوہ......'' ایک لمحے کے لیے شہزادی کے لب ساکت ہو گئے جیسے اب کبھی جنبش نہ کر پائیں گے۔ ایک مسکراہٹ غوث بخش کے لبوں پر کھیل گئی۔

وہ جانتا تھا کہ شہزادی کی خاموش نگاہیں کیا کھوج رہی ہیں چند لمحوں کی خاموشی اذیت ناک طوالت میں رنگی ہوئی تھی۔ لبوں پر سوال تھے...... سوال بھی وہ جن کا جواب عیاں اور عریاں تھا۔ غوث بخش کی نگاہیں مول کے کمرے پر جھکے درختوں کی ٹہنیوں سے اُلجھ رہی تھیں۔

''ایک رات میں اسے اٹھا لایا تھا اس کے آشیاں سے۔'' غوث بخش نے کمرے کی جانب نگاہ کر کے چہرہ جھکا لیا۔

''سائیں سے انعام لینے کی چاہ تھی' روپے پیسوں کا ارماں' سکوں کی چھنک بھی کیسے انسان کو پل بھر میں حیوان بنا دیتی ہے ادی...... اب سوچتا ہوں تو اس رات کی یاد سیاہی میں بھیگی ہوئی وہ یاد ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ آبلہ بن کر میرے دل کو درد اور اذیت سے دوچار کرتی ہے میری سانسیں بند کرتی ہے۔ میری روح پر بوجھ بن گئی ہے۔''

اس نے سر پر دھری ملگجی پگڑی اتار کر ہاتھ میں تھام لی۔ جاگتی راتوں کا دکھ اس کی آنکھوں کے بیچ سیاہی بن کر ابھر رہا تھا۔ چہرے پر شکستگی تھی۔ اس نے ایک نظر شہزادی کو دیکھا۔

''ادی...... میں اس کے سر پر پناہ کی چادر رکھنا چاہتا ہوں۔''

☆......☆......☆

وہ برستے ساون کی ایک خاموش دوپہر تھی جب شہر سے گوٹھ کی جانب آنے والے راستے پر ایک سرکاری جیپ دھواں اڑاتی ہوئی آئی اور تیزی کے ساتھ موڑ کاٹتے ہوئے حویلی کے دربان کے قریب آرکی۔ اترنے والا سادہ لباس میں تھا۔ خاکی رنگ کا ایک لفافہ جسے چاروں طرف سے مضبوطی کے ساتھ بند کیا گیا تھا اس نے دربان کے حوالے کر دیا۔ اندر علی حسن موجود تھا۔ اپنی آرام گاہ کی وسیع کھڑکی کے پردے ہٹاتے اس کی نگاہیں دربان پر مرکوز تھیں۔ کچھ ہی دیر قبل اسے فون پر سرکاری اہلکار کی آمد کی خبر دی گئی تھی۔ اس خبر نے اس کے دل کو پھر سے مغموم کر دیا تھا۔ دکھ اور جدائی کی دبی ہوئی چنگاریوں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اس کی پشت پر بیلا کی تصویر تھی۔ مسکراتا چہرہ...... سیاہ بالوں میں پرویا ہوا گلاب اور شانوں پر دھرا ستاروں بھرا گلابی دوپٹہ' کتنی چاہ سے علی حسن نے یہ دوپٹہ اس کے لیے لیا تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی کتنے تحائف تھے جو اس نے موسیٰ خان کے ذریعے اس تک پہنچائے تھے۔

لگتا تھا جیسے لمحہ بھر پہلے ہی کی بات تھی۔ جب بیلا نے خود کو اس کے لائے ہوئے تحائف سے سجایا تھا اور پھر ایک تصویر میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کی آہٹ تھی جب دروازہ کھلا اور علی حسن خواب سے لمحوں میں خود کو بھگوتا یوں چونکا جیسے اب تک گزرے دنوں کی دھول میں غرق ہو۔

خاکی لفافہ میز پر دھرا تھا آنے والا سرکاری اہلکار اب تک باہر تھا شاید دربان نے اسے مہمان خانے میں بٹھا دیا تھا۔ علی حسن کے ہاتھوں نے آہستگی سے خاکی لفافہ تھاما اور اسے کھولتے ہی مانند پڑتے ستاروں سے آراستہ' خاک آلود دوپٹے کا ایک کنارا اس کی ہتھیلی پر آ گرا...... ستاروں کے ساتھ ساتھ سیاہ ہوتے ہوئے خون کے چھینٹوں کے نشانات بھی تھے۔ جو دوپٹے کے گلابی پن میں ضم ہو رہے تھے۔ گو بیلا کی گمشدگی کو کئی ماہ گزر چکے تھے اور پولیس کے ساتھ ساتھ علی حسن بھی یہ جانتا تھا کہ اس کے زندہ لوٹ آنے کی اب کوئی امید باقی نہیں پھر بھی ایک آس تھی جو ٹمٹماتے دیے کی مانند دل کے کسی کونے میں دھیرے دھیرے جل رہی تھی اور علی حسن کی محبت اسے بجھنے نہیں دیتی تھی۔ ہر صبح وہ کسی خبر کا منتظر ہوتا اور ہر شب اسی امید کے ساتھ آنکھیں موند لیتا اور اب اس گز بھر کے لٹے پٹے کپڑے کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ٹمٹماتا ہوا دیا جیسے اس نے مشکل سے زندہ رکھا ہوا تھا ایک ہی پل میں کسی انجان ہوا کی سرسراہٹ سے بجھ گیا ہے کبھی نہ جلنے کے لیے...... علی حسن کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے اور خون آلود دوپٹہ اس کے قدموں میں آ گرا تھا۔ سلب شدہ قوت کے ساتھ اس کے بھاری قدم بمشکل اٹھے اور وہ قریبی

نشست پر یوں آ گرا جیسے سب کچھ ہارنے کے بعد کوئی امید' کوئی چاہ' کوئی روشنی باقی نہ رہی ہو۔

بیلا کے بے جان وجود کی باقیات شمالی جنگل کی اندرونی زمین سے ملی تھیں علی حسن کے دیے ہوئے کنگن اور دوپٹے سے اُسے پہچانا گیا تھا زرد پتوں میں لپٹی زمین کے اوپر سیاہ خون کی لکیریں اب بھی کہیں کہیں واضح تھیں اس کے سینے کے آر پار اتری گولیوں کے خول بھی قریب ہی پائے گئے تھے۔ چونکہ یہ علاقہ دلاور خان کے ٹھکانے سے قریب ترین تھا اسی لیے گمان اور یقین کے درمیان معلق سچ اس بات کا گواہ تھا کہ اس کا قاتل دلاور خان ہے۔

اس کی حویلی اب خالی تھی وہاں نہ گواہ تھے نہ ہی کوئی نشان و علامت' علی حسن نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔ کئی رتوں کی چھٹتی ہوئی دھند میں یادوں کی چاپ دل پر خون آلود قدم رکھ رہی تھی۔ یاد جو صورت آبلہ رگوں میں رواں تھی۔ پہلے کسک میں ڈھلی اور اب زخم بن گئی تھی۔ مدھم پڑتے ستاروں نے جیسے اس کی مٹھی کو جکڑا ہوا تھا خون آلود دوپٹہ پر جیسے کوئی سانس لے رہا تھا۔

بے قرار روح کی لرزش سے پرآشوب علی حسن نے آج پھر سے جام بھر لیے تھے۔ بلوریں گلاسوں کی کھنک کمرے کی بند قباؤں کے آر پار اترنے لگی تھی۔ راہداری میں اونگھتا ہوا چاند محمد سب جانتا تھا۔ مہر علی نے بھی آج یہیں ٹھکانہ کر لیا تھا۔ چاند شب بھر بادلوں میں چھپتا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

بالائی کمرے سے ابھرتی درد بھری چھنک اب تھم چکی تھی وحشت ناک سناٹے بل کھاتی سیڑھیوں سے لپٹ رہے تھے یوں جیسے باہر روشنی نہ پھوٹی ہو اور رات کا سناٹا اب بھی دیواروں کی آغوش میں سویا ہوا ہو۔ موسم کے بدلتے رنگ کے ساتھ حویلی کا مزاج بھی بدل رہا تھا۔ پھول کملانے لگے تھے۔ غنچوں کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

ایسے میں علی حسن کی خاموشی اور اس کے بالائی کمرے کا سناٹا دن کو شب میں بدل رہا تھا۔ رسوئی میں برتنوں کی کھنک اور بالی اور لالن کی مدھم آوازوں کے سوا کوئی سرسراہٹ اترنے کو تیار نہیں تھی۔

ایسے میں کبھی کبھی بچی کے رونے کی آواز بلند ہوتی تو سکوت کا نشہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یوں جیسے فقط اسی کا ایک وجود تھا۔ جو زندگی سے عبارت تھی۔ جیتے جاگتے آتے جاتے سانسوں کی علامت' ماں کو بھی تو کیسے راحت ملتی تھی اس سے کہ اب مومل کی آنکھیں کم برستی تھیں۔ چہرے کی زردیاں بھی تو اب گھلنے لگی تھیں اور حلقوں کی سیاہی مدھم پڑ گئی تھی۔ شہزادی نے ایک دو دن کے لیے حیدرآباد کا سفر باندھا تھا۔ جب لوٹی تو مومل کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''تو سندر دکھنے...... لگی ہے بالڑی...... جیسے ماہی تیری بچی نہیں' جادو کی چھڑی ہو۔ دیکھ میں تیرے لیے حیدرآباد سے چوڑیاں اور سرمہ لائی ہوں اور ماہی کے لیے رنگدار کرتا'' کچھ پھولوں کے گہنے بھی تھے۔ ایک بے رنگ ٹوکری میں جسے شہزادی نے بنا کچھ کہے دھاری دھار تپائی کے اوپر رکھ دیا۔

''یہ غوث بخش نے بھیجے ہیں چھوری......'' آہستگی سے شہزادی نے جملہ مکمل کیا۔ گہنوں سے اُلجھتی مومل کی آنکھیں تھم گئیں چہرے پر سوال تھا۔

''وہ تجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے' چھوری تیرا سہارا بننا چاہتا ہے' کچھ دن پہلے جب اس نے مجھ سے بات کی تو مجھے اس کا ہر لفظ سچ کا ماخذ لگا۔''

''لیکن وہ تو ...... وہ تو مجھے ......'' جانے کیا حروف تھے جو کانٹا بن کر اس کے حلق میں رک گئے تھے۔
شہزادی اس کے چہرے پر اترے اضطراب اور اُلجھن کا منبع جان چکی تھی۔
''جانتی ہوں چھوری ...... کہ وہ تجھے اٹھالایا تھا ...... سائیں کے لیے ...... لیکن دل بدلنے میں کہاں دیر لگتی ہے۔ یہ تو رب کی دین ہے جب چاہے دل کی طنابیں موڑ کر راست پر ڈال دے۔'' مومل نے کچھ کہے بنا سر جھکالیا۔ موسیٰ کو گئے بے شمار دن ہو چکے تھے۔ چاند بھی اپنا چکر مکمل کر کے دوبارہ سے روشن ہونے لگا تھا۔ سسی اب اس کی دلہن بن کر بہاول چاچا کے گھر کے دیے جلاتی ہوگی۔ اس نے گھوڑے کو رنگین کا غذوں اور خوشبو سے سجایا ہوگا۔ ہر شام محبت سے دہلیز پر چراغ رکھ کر اپنے مہندی والے ہاتھوں کا ہالہ بناتی ہوگی اور جب ہوا دبے پاؤں گزرتی ہوگی تو اس کے سر پر ٹکا سرخ آنچل دھیرے سے سرک کر اس کی سیاہ آنکھوں کی مسکراہٹ کو عیاں کر دیتا ہوگا۔
کتنی محبت سے موسیٰ اپنی باگڑی پر بٹھا کر مزار پر لے گیا ہوگا اور راستے میں دراوڑ کے عقب میں رک کر سسی نے کس چاہت سے چوڑیاں چھلکاتے ہاتھوں سے پیاسے ہونٹوں کو پانی پلایا ہوگا۔ چولستان کی ریت کا ہر ذرہ دونوں کی محبت کا گواہ بن کر اندھیرے میں چمکتا ہوگا۔ یوں جیسے اس کے سینے پر آسمان سے ستارے آگرے ہوں گو آنکھوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی ہر منظر واضح ہو کر مومل کی نگاہوں کے سامنے اتر آیا تھا۔
اس کے چہرے پر ملال تھا نا دکھ، بس خاموشی تھی گہری گھمبیر خاموشی، شہزادی خاموشی سے اسے تکتی رہی اس قید میں آئے اسے 12 ماہ سے زیادہ عرصہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جی رہی تھی۔ ہر دن نادم ہو کر بیت جاتا تھا۔ لیکن وہ اگلی صبح کا تعاقب کرتے ہوئے، تھکتے ہوئے دل کو سنبھال لیتی تھی۔ خاموشی کے ساتھ وہ اپنے اندر اترنے والا ہر آنسو دل میں جذب کر لیتی تھی جیسے دل نہ ہو ریت کا صحرا ہو، ہزیمت، شکستگی، درد اور اشک اپنے اندر سمونے والا صحرا ......
''سوچ لینا بالڑی ...... پھر فیصلہ کرنا ...... ہر اچھا برا تیرے سامنے ہے، آنے والے وقت کی بھی تجھے مجھ سے بہتر آگاہی ہے۔ غوث بخش عمر میں تجھ سے دوگنا سہی ماضی میں تیرا مجرم سہی لیکن اب اس کا دل صاف اور ہمدردی سے عبارت ہے۔'' صرف ایک آنسو مومل کی آنکھوں میں جھلملایا اور اس نے شہزادی کی طرف دیکھا۔
''یہ گہنے اچھے ہیں ادی ...... پھول بھی خوش رنگ ہیں لیکن مجھے کچھ بھی راس نہیں، نہ رنگ، نہ پھول نہ رشتے نہ چاہت، جب سکینہ ماں نے میری چولی پر ستارے ٹانکے تھے اور میرے ہونٹوں کو لالی سے رنگ دیا تھا۔ تب کتنی انجان تھی میں کہ گردوں جو میرے تعاقب میں ہے میری ہنسی کو خس کی طرح بکھیر دے گا۔''
''اب ...... اب کوئی احساس، کوئی ارمان نہیں میرے پاس ......'' ایک سسکی بلند ہوئی اور کمرے در و بام سے ٹکرانے لگی۔
شہزادی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا نہ دلاسا نہ تسلی نہ وعدہ نہ دعا، وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔
(جاری ہے)

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

ستمبر 2020 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''ڈھول'' تحریم امان اللہ

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ

اکتوبر 2020

عنوان: ________________________

قلم کار: ________________________

نام: ________________________

پتا: ________________________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

ناولٹ

سیدہ وجیہہ بخاری

ہاں تم......!

ارے اس کو نظر ہی تو نہیں آتا کم بخت اگر نظر آتا تو بیٹی سے نشے کے لیے پیسے مانگنے کے بجائے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتا اس منحوس انسان کو یہ فکر نہیں کے بیٹی گھر بیٹھی تیس کا ہندسہ کراس کر رہی ہے اور یہ عقل کا اندھا گھر بیٹھ کر اسی کی کمائی ٹھونس رہا ہے سکینہ جب بھی بولتی......

شام کی دھند اور یخ بستہ ہواؤں میں بھی وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پر بیٹھنے سے بھی باز نہیں آتی تھی اسے ٹیرس سے نظر آنے والے منظر سے عشق تھا وہ ان اندھیروں میں ڈوبے پہاڑوں کی محبت میں بری طرح گرفتار تھی روح میں اترتی خاموشی اور شام کے خوفناک اندھیروں میں گم بڑے بڑے پہاڑ......

قدرت کے ایسے نظارے اُسے بہت عزیز تھے ہاتھوں میں بھاپ اڑاتا گرم کافی کا مگ لیے وہ آج بھی اپنی سوچوں میں مگن سامنے نظر آتے دلفریب نظارے آنکھوں کے راستے دل میں اترنے میں گم تھی اسے پورے دن میں بس انہی کچھ پلوں میں اپنے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کے ان پلوں میں کوئی بھی دل دکھانے والی سوچ کو خود سے کوسوں دور رکھے۔

لیکن وہ سوچیں ہی کیا جن پر کبھی کسی کا اختیار رہا ہو گرم کافی کا کڑوا گھونٹ حلق سے اتار کر ٹھنڈی ہوا کو لمبا سانس لے کر اپنے اندر اتارا کیوں کے روز کی طرح آج پھر اس کی سوچیں اس کی لگائی گئی پابندیاں توڑ کر بے قابو ہو چکی تھی۔

کیوں خود اپنے ساتھ اور میرے ساتھ ظلم کر رہی ہو آخر کیوں؟ میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ یہ تمہیں سچی نہیں لگتی؟ کبھی اپنی آنکھوں میں جھانک کر بتاؤ کیا اِن میں میرا عکس بن کر نہیں ابھرتا؟ پھر اتنے پہرے کیوں؟ اتنی ضد کیوں؟؟

وہ اس کے سوالوں پر ہمیشہ کی طرح ایک بے بس سی نظر اس پر ڈال کر اس کے راستے سے ہٹ جایا کرتی تھی ہاں وہ بھی تو دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

لیکن دل کی اُس خوشی کا کیا کرنا تھا جس میں اپنوں کی رضا ہی شامل نہ ہو۔

نہیں دیکھوں گی میں کبھی اِن آنکھوں میں تمہارا عکس میں نوچ لوں گی اپنی آنکھوں سے تمہارے خواب بس۔

وہ منہ میں بڑبڑائی اس کی آنکھوں سے برسات شروع ہو چکی تھی تھک ہار کر سر اس نے کرسی کی پشت سے ٹکا دیا گرم کافی کا کپ اب ٹھنڈے کڑوے مشروب میں بدل گیا تھا اور اس سے اُڑتی بھاپ

کڑوی ملائی میں بدل چکی تھی اسے اداس دیکھ کر سامنے کے پہاڑ پہلے سے زیادہ سیاہ اور بوڑھے لگنے لگ گئے۔

وہ بیدردی سے آنسوں صاف کرتی اور اپنی شال کو مظبوطی سے اپنے گرد لپیٹ کر جلدی سے اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ سردی حد سے سوا ہونے لگی تھی۔

آپی آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے جو ہڈیوں کا گودا تک جمانے والی سردی میں بھی آپ اتنی دیر باہر ٹیرس پر بیٹھی رہتی ہیں اور جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اس کا پندرہ سالہ بھائی اُسکو کمرے میں آتا دیکھ کر ہر بار کی طرح حیران ہو کر کہنے لگا وہ شرارتی انداز میں اس کے بال بکھیر کر زخمی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتی اندر بڑھ گئی ابھی اسے اپنے جذبات کو الفاظ میں ڈھال کر ڈائری پر لکھنا تھا تا کہ وہ سکون سے سوسکتی۔

☆......☆......☆

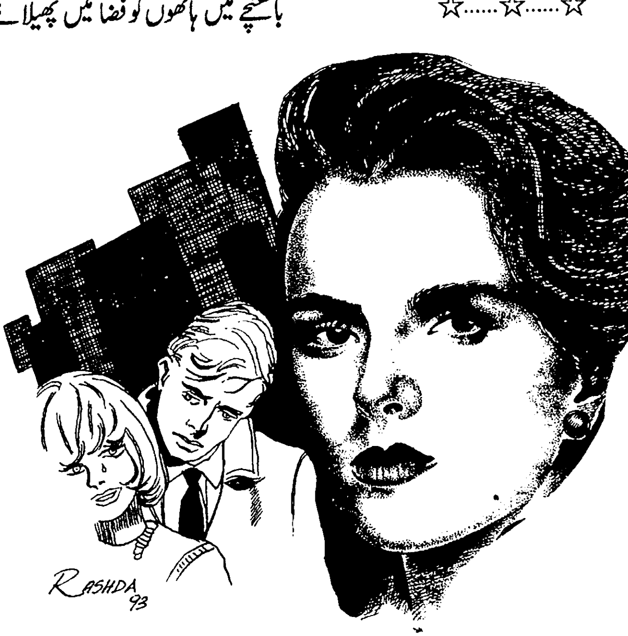
مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کے تم یہاں ہی پائے جاؤ گے۔

تم انسان ہو یا فولاد تمہیں سردی نہیں لگتی ؟؟ اس وقت برستی برف میں تم مزے سے کھڑے ہو جیسے تمہیں کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا ہو۔

افففف توبہ......عنایا نے اپنے بھائی کو دیکھتے ہی ایک لمبی سی دہائی دے ڈالی تھی عنایا کوٹ پر شال لیے سر کو اونی ٹوپی سے مکمل ڈھانپ کر ہاتھوں میں داستانے پہنے چھت پر بھائی کو بلانے آئی تھی۔

دوسری طرف اس کا بھائی بس ایک شال کندھے پر ڈالے کھڑا برف باری دیکھ رہا تھا۔

مجھے چھوڑو آپی سامنے دیکھ کر بتاؤ کیا اس حسین نظارے کو دیکھتے سردی یا گرمی کا احساس ہو سکتا ہے؟؟؟ عنایا نے شاہ ازل کی آنکھوں کے تعاقب میں دیوار کے اس پار ذرا سے پاؤں اٹھا کر دیکھا جہاں وہ حسب توقع اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں ہاتھوں کو فضا میں پھیلائے بال کھولے



گول گول گھوم کر برف کو خود پر برسنے دے رہی تھی وہ بھی محض ایک سویٹر اور ایک گرم شال کندھوں پر ڈالے ہوئی تھی۔

''اف یک نہ شد دو۔'' اس لڑکی کا بھی دماغ خراب ہے اس ہڈیوں کو جما دینے والے موسم میں بھی پاگلوں والی حرکتیں کرنے سے باز نہیں آتی۔

ویسے تم دونوں ہو ہی ایک جیسے پاگل...... عنایا اب باقاعدہ زچ ہو کر بولی تھی۔

آپی کیا خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو......

شاہ ازل دائیں آنکھ کا کونہ دبا کر بولا۔

بیٹا اِن ازل سے پاگل دیوانوں کا ایک ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اتنا اونچا مت اڑو......

شرافت سے نیچے آؤ چپ چاپ میں اور امی کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں مجھ سے نہ تو یہ سردی برداشت ہو رہی ہے اور نہ بھوک عنایا یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

شاہ ازل نے آخری نظر اُس پر ڈالی جو اب برف اکھٹی کر کے سنو مین بناتے ہوئے اس حسین منظر کا ایک حسین حصہ لگ رہی تھی شاہ ازل کے لیے نظر ہٹانا مشکل ہو رہا تھا اچانک اس پری پیکر کی نظر شاہ ازل پر پڑی جہاں شاہ ازل کھڑا اسے دیکھ رہا تھا وہ ایک دم جامد ہو کر رہ گئی نظریں بھی کہیں اوپر اٹک گئی تھوڑی ہی دیر میں وہ سنبھل کر اپنے ہاتھ جھاڑتی اندر کی طرف بڑھ گئی دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا جانے وہ کب سے وہاں کھڑا بس اسے ہی تک رہا تھا اُسے سخت کوفت ہوئی جب کے شاہ ازل اسے یوں بھاگتا دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیا پھر سر کو جھٹکتے ہوئے نیچے کی طرف جانے لگا نتھیا گلی کے برف باری کے موسم سے دونوں کو عشق تھا وہ تو شروع سے ہی برف کی دیوانی لڑکی اور شاہ ازل کو یہ موسم شائد اس لیے بھی زیادہ پسند تھا کے وہ یہاں جب بھی آتا اس کو یہ لڑکی ہمیشہ برف کے ساتھ کھیلتی ملتی تھی شاہ ازل کے دل نے جب سے اس لڑکی کے لیے دھڑکنا شروع کیا تھا اس کو دیکھ کر ہر دفع ایک نئی خوشی ملتی تھی۔

ہائے یہ محبت کے مارے لوگ...... محبوب کی ایک جھلک کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے اور اس نظر کے بعد بھی دل بے چین ہی رہتا ہے۔

حسین مورت کہوں یا پھر کہوں کہ چاند جیسی ہو۔
سنو تم جو بھی ہو جانم مجھے تم سے محبت ہے۔

نتھیا گلی کے پہاڑوں پر اب بھی برف برس رہی تھی اور حسین منظر دیکھنے والوں کا انتظار کر رہے تھے لیکن اس کے اندر جاتے ہی شاہ ازل کے لیے یہ حسین منظر اب ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

☆......☆......☆

بیٹی ذرا مجھے کچھ پیسے تو دے دو سگرٹ کی ڈبی ختم ہو گئی ہے آج جا کر لے آؤں گا۔

مشتاق کے لہجے کی شیرینی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے واقعی پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔

زہرہ جو اس وقت اپنی چھوٹی سی جنت جو کے دو کمروں کچن اور باتھ روم چھوٹے سے باغیچے پر مشتمل تھی کی صفائی میں مصروف تھی کہ باپ کی آواز پر چونک گئی۔

سوری ابو میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں مجھے ابھی تنخواہ نہیں ملی ابھی طحہ کی کالج کی فیس بھی دینے والی رہتی ہے، آج جاؤں گی تو مل جائے گی۔

بکواس کرتی ہو؟ آج جب پڑھا لکھا کر اس قابل کیا ہے اور آج باپ کو پیسے دیتے موت آتی ہے؟

چلو نکالو پیسے وہ ایک دم اتنے غصے میں آگئے

زہرہ سہم کر پیچھے ہوئی وہ بچپن سے باپ کے غصے سے ڈرتی تھی۔

ارے او کم بخت تو مر کیوں نہیں جاتا مسلسل ہماری جان کا عذاب بنے ہوا ہے کمینے انسان...... کس منہ سے بیٹی سے مانگتا ہے وہ بھی نشے کے لیے...... شرم تو تمہیں چھو کر نہیں گزری ہاتھ پیر سلامت ہیں جا مر کما اور پھر جتنا مرضی نشہ کر کوئی پوچھنے نہیں آئے گا۔

یا اللہ اس مسلسل عذاب سے ہماری جان چھڑا سکینہ جھولی اٹھا اٹھا کر اپنے نشئی شوہر کو بددعا دے رہی تھی۔

اے بد ذات عورت میں تمہاری شکل بگاڑ دوں گا اگر مجھے بددعا دی مشتاق سکینہ کو مارنے کے لیے بڑھا اور اس کی بیساکھی لے کر زمین پر پھینک دی طحہ جو کمرے سے ناشتہ کر کے نکل رہا تھا بھاگ کر ماں کو سنبھالا۔

ابو کیا کر رہے ہیں نظر نہیں آتا کے امی بیساکھی کے بنا نہیں چل سکتی طحہ غصہ سے باپ سے بولا اور ماں کو ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھا دیا۔

ارے اس کو نظر ہی تو نہیں آتا کم بخت اگر نظر آتا تو بیٹی سے نشے کے لیے پیسے مانگنے کے بجائے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتا اس منحوس انسان کو یہ فکر نہیں کے بیٹی گھر بیٹھی تیس کا ہندسہ کراس کر رہی ہے اور یہ عقل کا اندھا گھر بیٹھ کر اسی کی کمائی ٹھونس رہا ہے سکینہ جب بھی بولتی اس کو چپ کروانا مشکل کام تھا۔

میں کہتا ہوں بکواس بند کر مشتاق یہ کہہ کر زہرہ پر جھپٹا اور اس کے ڈوپٹے سے بندھے ہزار روپے لے کر اُن سب کو ہکا بکا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔

اللہ کرے باہر پڑی تین فٹ کی برف میں غرق ہو کر مرے کم بخت......

سکینہ روتے ہوئے پھر سے اس کو کوسنے لگیں۔

زہرہ کے لیے یہ سب باتیں نئی نہیں تھی وہ چپ چاپ آنسو پیتی کمرے کی جانب بڑھ گئی وہ یوں خود کو اندر سے مارتے مارتے تھک گئی تھی وہ گھر والوں کے لیے اپنی زندگی کو اندھیروں میں ڈالتے ڈالتے تھک گئی تھی مگر حاصل کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

یار گل میرے ساتھ آج بازار چلو گی پلیز؟؟ میرے سسرال والے آ رہے ہیں تو کچھ خریدنا تھا آنی اسٹاف روم میں آتے ہی بولنا شروع ہو گئی تھی۔

اِس وقت اسٹاف روم میں آنی اور گل کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔

گل کھڑکی میں کھڑی باہر کے موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی آنی کی بات پر پلٹ کر آنی کو دیکھا۔

عقل ہے تم میں آنی؟ میں تو اس موسم میں نہیں جا رہی بازار اور موسم سے لگ رہا ہے رات تک برف ایسے ہی برسے گی میری مانو اپنے سسرال والوں کو بھی منع کر دو ابھی نہ آئیں......گل نے الٹا اس کو مشورہ دے دیا۔

ارے ہاں میرے ذہن سے کیسے نکل گیا کے آج کل تو کسی بھی وقت برف باری شروع ہو جاتی ہے ایسے میں ان کا آنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا آنی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

بے عقل لڑکی میرا شکریہ کرتی رہا کرو میں نہ ہوں تو تم تو گئی کام سے گل سامنے پڑی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔

گل جانے تم پر یہ وقت کب آئے گا جب تم مجھے اپنے سسرال والوں کے قصے سنایا کرو گی۔

آنی کی بات پر گل کی مسکراہٹ سمٹ کر رہ گئی اور اس کے خوبصورت چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔

آنی تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کچھ جانتی نہیں سب تو جانتی ہو اس سب میں میرا قصور کہاں نکلتا ہے گل میز پڑے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

آنی نے گل کی بات پر غور سے گل کو دیکھا تیکھے نقوش پر گلابی کھلتی رنگت، وہ واقع پہاڑوں میں رہنے والی دوشیزہ لگتی تھی۔

میں حیران ہوں اتنی تم پیاری ہو اس حساب سے رشتے بھی تو بہت آتے ہوں گے لیکن پھر بھی تمہارا کنوارا ہونا ایک بڑا اہم سوال ہے...... آنی نے گل کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے پھلجھڑی چھوڑ دی اور گل ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

گل ہنستے ہوئے نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی آنی نے دل میں سوچا۔

بکواس بند کرو جب جو ہونا ہوگا ہو جائے گا فلحال تو تم اپنے سسرال کا سناؤ جعفر بھائی کا اور باقی سب؟

ہاں یار سب ٹھیک ہیں وہ لوگ شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے تھے اور میں چاہ رہی تھی کہ ہاں ہاں میں جانتی ہوں زیادہ ہی جلدی ہے تو کچھ کرو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے کیا ہوگا۔

گل تم دعا کرنا میں، جس مقصد میں لگی ہوئی وہ پورا ہو جائے آنی نے اب کی بار سنجیدگی سے کہا۔

کیا مطلب آنی کیسا مقصد؟؟ گل چونکی تھی بس یہ وقت آنے پر بتاؤں گی ابھی بس تم بس دعا کرو اور اٹھو بریک ختم...... تم بھی کلاس میں جاؤ۔

گل اداسی سے کندھے اچکاتی وہاں سے اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

آج پورے دو ہفتوں بعد دھوپ نکلی تھی سب کچھ ہی چمک رہا تھا پہاڑ دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے دودھ سے نہلا دیا ہوں ان دودھ سے دھلے پہاڑوں پر پڑتی دھوپ ان کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی وہ ٹیرس پر کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا اور سوچیں ایک اسی کے گرد گھوم رہی تھی دماغ اس کے علاوہ کسی کو سوچتا ہی نہیں تھا۔

شاہ ازل بیٹا آج تو تمہاری واپسی ہے لاہور آؤ مجھے بتا دو کیا پیک کرنا ہے میں کر دیتی ہوں راحت بیگم ڈوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ٹیرس پر آ گئی تھی شاہ ازل کو وہ عنایا کے ساتھ آتی نظر آئی لیکن وہ کون سا اندر آتی تھی باہر سے ہی چلی جاتی تھی۔

امی اب تو میں کماؤ پوت ہوں میری شادی کا کب تک سوچیں گی آپ...... وہ اب شرارت سے ماں سے پوچھ رہا تھا۔

ارے شریر ایسی بھی کیا جلدی ہے کر لیں گے تمہاری شادی بھی راحت بیگم وہیں کرسی دھوپ میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

امی وہ نا......شاہ ازل اب کی بار ذرا جھجک کر ماں سے بول رہا تھا جب راحت بیگم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

سب سمجھتی ہوں میری جان تمہاری ماں ہوں پسند نا پسند جانتی ہوں لیکن تم ہی بتاؤ کسی انسان کے اپنے ہی اس کے لیے اذیت بنیں...... اسے سمجھیں ہی نا تو دوسرا کوئی کب تک اس کی بھلائی کا سوچ سکتا ہے؟؟ میری خود بہت بڑی خواہش ہے لیکن اس آدمی نے آج تک ہر کسی کو بے عزت ہی کیا ہے ایسے میں کوئی کیسے وہاں سوالی بن کر جائے راحت بیگم نے حقائق کو سامنے رکھ کر بات کی۔

امی ایسے بے حس لوگ بھی دنیا میں ہیں میں تو بس حیران ہوں اس کے لہجے کی بے بسی عیاں تھی۔

بس میری جان تم دعا کرو اللہ تمہارے لیے

کوئی آسان راہ نکال دے میرے لیے تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے تمہارے ابو کے جانے کے بعد تم اور عنایا ہی تو میری زندگی کا حاصل ہو بات کی آخر میں راحت بیگم نے اپنی نم آنکھوں سے اٹھ کر بیٹے کا ماتھا چوما اور وہ بھی ماں سے لپٹ گیا۔

ماں کا لمس بھی کیا لمس ہے جب کہیں سکوں نہ ہو تو ماں کے سینے سے لگ کر ہر درد خوف بے چینی سب ختم ہو جاتا ہے......

☆......☆......☆

سورج کی شعاعیں جب زمیں پر پڑتی تھی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے چاندی کے تار چمک رہے ہوں کہیں کہیں برف پگل کر کورے کی شکل اختیار کر گئی تھی اور کہیں برف سخت ہو گئی تھی اور کہیں ریت کی طرح بھربھری...... من چلے ڈونگا گلی کے مقام پر برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارنے میں مصروف تھے۔

اس کا بھی دل کیا کے واپس جانے سے پہلے ایک بار ڈونگا گلی کی سیر کر آئے اب آگے اس کی جاب کی نوبت ایسی تھی کے وہ اگلی سردیوں میں ہی واپس آ سکتا تھا موٹا کوٹ پہنے سر پر اونی ٹوپی جمائے ہاتھوں میں دستانے پہنے وہ باہر نکل آیا باہر نکلتے ہی اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

جیسے ٹھنڈی ہوا کو اپنے اندر اتارنے کی سعی کر رہا ہو ابھی گھر سے باہر نکلا ہی تھا کے اچانک نظر سامنے آتے شخص پر پڑی اور اس کی ساری دنیا بس اس ایک انسان پر محیط ہو گئی۔

دنیا کی ہر چیز شاہ ازل کے لیے بے وقعت ہو گئی تھی وہ چہرہ نقاب سے ڈھانپے چلتی آ رہی تھی اس کی آنکھوں میں یاسیت کا الگ ہی جہاں آباد تھا اداس آنکھوں کا حسن کیا ہوتا ہے وہ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی سمجھ آ سکتا تھا وہ سامنے شاہ ازل کو دیکھ کر چونک گئی لیکن جلد ہی سنبھل کر اس سے آگے چلی گئی جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو شاہ ازل کے دل میں جانے کیا آیا کے وہ اس کا پیچھا کرنے لگ گیا۔

میری بات سنو پلیز دو منٹ رک جاؤ مجھے تم سے بات کرنی ہے تھوڑا آگے جا کر وہ اس سے مخاطب ہوا تھا اسے بالکل بھول چکا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا شاہ ازل کی آواز کو سن کر اس کے پاؤں زنجیر ہو گئے وہ اس کی طرف مڑے بنا سڑک کنارے پڑے سے پتھر کے پاس رک گئی جس کے پاس برف کا ڈھیر موجود تھا یہاں جگہ جگہ برف کے ایسے ڈھیر موجود تھے کیوں کے رات کی برف باری سے سڑک پر گزرنے والے برف سڑک کنارے جمع کر دی جاتی تھی مجھے تم سے ایک سال پہلے پوچھے گئے سوال کا جواب چاہیے کیا کوئی کسی کو اتنا بھی ستاتا ہو گا جتنا تم مجھے ستا رہی ہو وہ اس کے قریب ہی جیب میں ہاتھ ڈالے اس پر نظر جماتے ہوئے بول رہا تھا وہ اس کی نظروں کے حصار سے خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی آنکھیں جھکی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ سے نقاب کا پلو پکڑ رکھا تھا۔

میرے پاس آپ کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے شاہ ازل کیوں سب جانتے ہوئے بھی یہ سب کر رہے ہیں نہ چاہتے ہوئے بھی آخر میں اس کا گلہ رندھ گیا تھا اس نے آنکھیں اٹھا کر شاہ ازل کی طرف دیکھا گندمی چہرے پر اس کی پر کشش آنکھیں ایسے اداس ہوئی تھیں جیسے کسی نے ان سے متاع حیات مانگ لی ہوں۔

کیا مجھ میں کوئی کمی ہے کیا تم مجھے اپنے قابل

نہیں سمجھتی شاہ ازل کا سوال بہت بے تکا تھا وہ تڑپ کر رہ گئی۔

کمی آپ میں نہیں میرے نصیب میں ہے شاہ ازل اور میں نہیں چاہتی کے میرے نصیب کی کالک آپ پر پڑے جانے کیوں اس کے آنسوں روانی سے بہہ نکلے تھے نقاب کا پلو ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا وہ روتے ہوئے الٹے قدموں گھر کی طرف بھاگ گئی وہ بے بسی کی تصویر بنے اسے دیکھتا رہا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر اپنی محبت کا اظہار کرے تا کہ نتھیا گلی کے سارے پہاڑ اس کی محبت کے گواہ بن جائیں وہ بے بسی کی انتہا پر کھڑا تھا اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا بس مینے اب اور نہیں اب میں تمہیں اور نہیں رونے دوں گا شاہ ازل نے خود سے باتیں کرتے ہوئے زمین سے برف اٹھا کر گولہ بنا کر پتھر پر مارا جیسے اپنے اندر کے ہیجان کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی جانے وہ کس کام کے لیے گھر سے نکلی تھی اور اسے اس کی وجہ سے واپس جانا پڑا تھا اک دم اسے خفت نے گھیر لیا تھا وہ بھی گھر کی طرف چل پڑا تھا اسے آج رات لاہور کے لیے جانا تھا اور اس کے دل میں بے بسی اور بے چینی کا ایک جہاں آباد تھا
۔

میں لیٹ بھی چلا گیا تو خیر ہے لیکن اس دفع میں ایک حتمی فیصلہ کر کے ہی جاؤں گا اب وہ اس کو ایسے روتا ہوا نہیں چھوڑ کر جا سکتا تھا وہ اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑے زمیں پر بیٹھتا چلا گیا وہ ہر طرح سے اپنی بے بسی کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بے چینی اور بے بسی تھی کے حد سے سوا ہو رہی تھی کبھی کبھی کسی پہاڑ جیسے انسان کو تسخیر کرنا انتہا ہی مشکل کام ہوتا ہے لیکن یہ محبت یہ کام آسانی سے کر لیتی ہے یہ محبت بھی نا' جب تک تگنی کا ناچ نہ نچوا لے آرام سے نہیں بیٹھتی۔

☆......☆......☆

جب انسان کے اندر کی بے چینی اور اذیت کو اس کے اپنے بھی نہ سمجھ پائیں تو انسان کا دنیا سے زندگی سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے زندگی کی ہر رونق اور رنگ بے معنی ہو جاتا ہے بس ایک کسک ایک ٹھیس سی دل میں اٹھتی ہے کے کاش کوئی تو دل کا حال بنا کہے جان لے کوئی تو اس دکھ کا مداوہ کر دے لیکن یہ کاش، کاش ہی رہ ہی جاتا ہے۔

امی کیوں ابو ہمیں نہیں سمجھتے وہ کیوں اتنے بے حس ہیں ابھی تازہ تازہ گزرنے والی واردات کی وجہ سے زہرہ بار بار اپنی ماں کے پاس شکوہ کرنے آ جاتی تھی۔

زہرہ میں روتی ہوں اُس وقت کو جب میں نے اِسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی حامی بھری تھی پھر روتی ہوں کہ آخر میں نے تمہیں جنا ہی کیوں کم از کم یہ دکھ تو نہ ہوتا کے بیٹی گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہے وہ منحوس مارا تو گھر بیٹھ کر کھانے والوں میں سے ہے کوئی خیال نہیں اس کو کسی کا' امی آپ نہ کریں میری میں ساری زندگی آپ کے ساتھ گزار لوں گی لیکن یہ تکلیف یہ اذیت اب نہیں سہی جاتی امی اب میں تھک گئی ہوں کیا میں اس لیے محنت کرتی ہوں کے جب ساری مہینے کی کمائی لے کر آؤں تو ابو ساری اپنے نشے پر لگا دیں ابو کو اتنا خیال نہیں کے طحہ بڑا ہو رہا ہے اس کی کلاس بھی بڑھ رہی ہے اس کی فیس اس کے خرچے بھی بڑھ جائیں گے۔

وہ نم آنکھیں لیے ماں سے دلاسہ لینے آئی تھی۔

کم بخت تیرا نصیب ہی کھوٹا ہے اب میں کیا کر سکتی ہوں سکینہ بیگم جب منفی سوچنے لگتی تو زہرہ

کے نصیب کو بھی کوسنے لگتیں۔
تیرے جتنے بھی اچھے رشتے آئے تیرا باپ کفرانِ نعمت کرتا رہا کے اس کو بیاہ دیا تو گھر کون چلائے گا اور میں جب جب اس کو راضی کرنے کی کوشش کروں مجھے مارنے کو دوڑتا ہے تو خود بتا زہرہ میں اس عمر میں طلاق لے کر کہاں جاؤں تجھ سے تیرے باپ کا نام چھین کر تجھے کہاں چھپا کر رکھوں گی میری دھی طحہ کی مجھے فکر نہیں ہے وہ لڑکا ہے رہ لے گا کیسے بھی میں اور تم رل جائیں گے جو بھی ہے دنیا والوں کی نظروں میں تم باپ والی ہو رشتے داروں کے نام پر کوئی ایسا نہیں ہے جس کے پاس جا سکیں اور اگر ہوتا تو بھی نہ جاتے اپنی چھت اپنی چھت ہوتی ہے ساری زندگی میں نے بھی آس پر گزار دی ہے بس دعا کر اللہ کوئی اسباب بنا دے مجھے اب بس تمہاری فکر ہے میں مرگئی تو تمہارا کیا ہوگا آخری بات منہ میں بڑبڑاتی ہوئی اپنی بیساکھی سنبھال کر کمرے سے باہر چلی گئی زہرہ تکیے میں منہ دے کر رونے لگ گئی آج ہی وہ تنخواہ لے کر آئی تھی اور آدھی سے زیادہ لے گئی تھی کیوں کے اس کا نصیب ہی ایسا تھا کے سارے مہینے جان مار کر کمانا اور پھر ساری کمائی اپنے باپ کے نشے میں لگا دینا اگر ذرا بھی مزاحمت کرتی تو اس کا حق اس سے چھین لیا جانا تھا۔

☆......☆......☆

لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی اس بچی کا کیا قصور ہے جو تو اس کو بھی نہیں بخش رہا میں تجھے کسی صورت یہ ظلم نہیں کرنے دوں گا سکینہ کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اپنے مجازی خدا کو گولیوں سے بھون کر رکھ دے مشتاق نے سکینہ کو بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور چہرا اس کے قریب کر کے غرا کر بولا۔

اب اگر ایک بات بھی منہ سے نکالی تو اس عمر میں طلاق دینے میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا مجھی زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے خود ہی سر کھا رکھا تھا کے بیٹی کی فکر نہیں اب اپنے گھر والا کرنے لگا ہوں تو نواب زادیوں کے نخرے نہیں ختم ہونے میں آرہے درد کی ایک بھرپور لہر سکینہ کے جسم میں دوڑ گئی لیکن وہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی ماں تھی ایسے چپ چاپ تھوڑی بیٹی کو بیچ دیتی۔

ارے بے غیرت انسان یہ شادی کر رہا ہے یا سودا وہ بھی بیٹی سے دوگنی عمر کے ذلیل انسان سے بکواس بند کر لے سکینہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں تمہیں، جتنی اس کی عمر ہے ایسے ہی رشتے ہونے ہیں اب اس کے لیے شہزادہ گلفام تو آنے سے رہا مشتاق نے جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے اور جانے کس کو کال کرنے لگا۔

آنٹی گل زہرہ ہے؟ عنایا تھوڑی دیر بعد ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی جہاں سکینہ بے حال سی چارپائی پر پڑی تھی اور مشتاق کسی کو فون کر رہا تھا اس سے پہلے سکینہ کوئی جواب دیتی وہ خود گل کو آواز دیتے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

آنی آنی پلیز یار یہ سب رکوا دو پلیز آنی میں تو کسی پر بوجھ بھی نہیں ہوں کماتی ہوں سب کو دیتی ہوں پھر بھی ابا میرا سودا کر رہا ہے یار مجھے بچا لے کبھی کچھ نہیں مانگا تم سے بس مجھے آج بچا لو میں نے نہیں جانا اس آدمی کے ساتھ گل نے عنایا کو دیکھتے ہی اس سے لگ کر رونا شروع کر دیا جیسے ساری دنیا سے چھپ جانا چاہتی ہو۔

ریلکس گل کوئی نہیں لے کر جا رہا تمہیں پگلی ایسے تھوڑی نہ جانے دیں گے تمہیں کوئی ہاتھ تو لگائے اس کا حلیہ بگاڑنے کے لیے میرا اکیلا بھائی ہی کافی ہے عنایا کی اس بات پر گل کے رونے میں

اور زیادہ روانی آ گئی تھی' ہاں ہوتا ہے نہ ایسا جب انسان بہت بڑی مصیبت میں ہو اور جس سے سب امیدیں وابستہ ہو وہ اچانک سے آپ کی ڈھال بن کر سامنے آ جائے انسان کو خود اپنے آنسوں پر اختیار نہیں رہتا گل کو بھی شاہ ازل کا نام سن کر یہی محسوس ہوا تھا شاید یہ تشکر کے آنسو تھے۔

اب تم یہاں بیٹھو میں انکل سے بات کر کے آتی ہوں عنایا نے گل کو شانوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا اور خود باہر چلی گئی۔

انکل وہ آپ کی بیٹی ہے لیکن معذرت کے ساتھ کہتی ہوں' ہم آپ کو اس کی زندگی برباد نہیں کرنے دیں گے نہ آپ کو کوئی حق ہے۔ عنایا نے موقع دیکھتے ہی بات شروع کر دی۔

اچھا تو یہ کل کی چھوری مجھے بتائے گی کے میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں مشتاق نے بھنویں سکیڑ کر جیب سے سگریٹ نکالی اور جلا کر منہ میں رکھی پھر ایک ٹانگ چارپائی پر رکھ کر جھکا اور عنایا کو غور سے دیکھنے لگا۔

جی انکل میں آپ کو بتاؤں گی کے کیا کرنا ہے کیوں کے جب اپنے جیتے جی انسان کو مارنے پہ تل جائیں تو کسی غیر کو اپنا بننا پڑتا ہے کیا سمجھتے ہیں آپ اس کے ساتھ جو کچھ کریں گے کوئی کچھ نہیں کہے گا آپ کو وہ کوئی جانور ہے یا بھیڑ بکری جسے آپ کسی بھی کھونٹی سے باندھ دیں گے اور ہم سب بس تماشہ دیکھتے رہیں گے اس کے بھی احساسات ہیں آپ نے کبھی اس سے پوچھا ہے وہ کیا چاہتی ہے کیا محسوس کرتی ہے میں بچپن سے اس کے ساتھ ہوں چھوٹی سی عمر میں اس نے ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اپنی پڑھائی مکمل کی ہے اور آپ سب کو پالا ہے اب تک پال ہی رہی ہے جہاں باپ بیٹیوں کو پالتا ہے لیکن۔۔۔۔اور آپ مجھے یہ بتائیں آپ نے سوائے اس کو باپ کا نام دینے کے علاوہ کیا ہی کیا ہے۔عنایا سانس لینے کو رکی۔

اس کے لیے میں اگر نہ چاہتا تو یہ اس قابل کبھی نہ ہوتی کے پڑھ لکھ کر اپنا بوجھ اٹھائے مشتاق اپنا احسان گنوانا نہیں بھولا۔

اچھا تو یہ آپکا احسان ہے اور اور بتائیں ذرا کیا کیا احسان کیے ہیں آپ نے اس پر عنایا نے طنزیہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

اور اب دوسرا احسان کر رہا ہوں اس کی شادی ایک لکھ پتی سے کر کے انہوں نے بھی دو بدو جواب دیا۔

میں تمہیں اس کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گی مشتاق یہ تم یاد رکھنا پہلے مجھے مار پھر جو جی میں آئے کرنا سکینہ بیگم چیخ کر بولی ٹانگوں سے بے بس تھی ورنہ تو شاید اس کا سر ہی پھاڑ دیتی اللہ کا واسطہ ہے میرے گناہوں کی سزا میری بیٹی کو نہ دے اپنے ماں باپ کے خلاف جا کر تم سے شادی کرتے وقت مجھے موت کیوں نہیں آئی ساری زندگی کے دکھ اپنے ہاتھوں سے میں نے اپنے لیے خریدے اور یہی سزا کافی ہے کے میں نے معذروں والی زندگی گزاری پھر تجھے نشے کی لت لگ گئی تجھے تو اپنے بیٹے کی فکر نہیں تو احمد کی بیٹی کی کیسے ہو سکتی ہے سکینہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا احمد سے شادی کر کے لگتا تھا میرے ماں باپ نے میرے ساتھ زیادتی کی اور زہرہ کو جنم دے کر لگتا تھا میری سب سے بڑی غلطی ہے لیکن آج یہی بیٹی تمہارا میرا اور تمہارے بیٹے کا سہارا بنی ہوئی ہے احمد سے طلاق لے کر تم سے شادی کر کے مجھے لگتا تھا ہواؤں میں اڑ رہی ہوں لیکن انہی ہواؤں نے مجھے زمین پر ایسا لا پٹخا کے درد ابھی تک محسوس ہوتا ہے۔

بھلا میں تجھ سے کیسے شکوہ کروں کے تو زہرہ کا خیال نہیں رکھتا تیری اپنی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی تم کیسے نہ اس کی خوشیوں کی خاطر اپنی ذات قربان کرتا ؟ سکینہ بیگم بولتے ہوئے رونے لگیں عنایا ان کو کاندھوں سے تھامے بیٹھی تھی اور زہرہ چوکھٹ پکڑے حیران نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔

انکل خدا کا واسطہ ہے آپ گل کے ساتھ اتنا بڑا ظلم مت کریں ہم اس کو کسی کے ساتھ نہیں جانے دیں گے عنایا نے آخر میں ذرا سخت لہجے میں کہا مشتاق نے عنایا کو ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

بس ہوگئی تم دونوں کی تقریر ختم اب اٹھو اور گل کو تیار کرو ملک صاحب آنے والے ہوں گے میں ذرا مولوی کو لے آؤں۔ مشتاق پر ان سب کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ سگرٹ کو پاؤں کے نیچے مسل کر باہر نکلنے لگا' روک جائیں انکل میری بات سن کر جائیں آپ کو بس یہ فکر ہے کے زہرہ کے لیے اب کوئی اچھا رشتہ نہیں آئے گا میں یہاں کھڑے کھڑے گل زہرہ کا رشتہ اپنے بھائی شاہ ازل کے لیے مانگتی ہوں کیا آپ کو قبول ہے عنایا کی بات نے مشتاق کے قدم روک دیے۔

لڑکی میں حیران ہوں باپ اس کا میں ہوں اس کی زندگی کا فیصلہ میں کروں گا تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ اس کی بار مشتاق نے طنزیہ انداز اپنایا اب کی بار عنایا اور سکینہ کی زبان کو چپ لگ گئی تھی کہنے کو کچھ بچا ہی نہ گل میری دوست ہے بچپن سے اور میں نے سوچ رکھا تھا کے گل کی شادی میرے بھائی سے ہی ہوگی۔ گل بھی ایک جیتی جاگتی انسان ہے اس کے پاس بھی دل ہے اس کی بھی جذبات ہیں اس کی بھی کچھ خواہشات ہیں وہ کیا چاہتی ہے کیا آپ کے لیے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی؟

گل نے خود سنا ہے کے وہ مرد گل کے بدلے آپ کو 50 لاکھ دے رہا ہے کیا آپ کو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں آتا انکل گل کی جگہ آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو کیا آپ تب بھی ایسا ہی کرتے؟؟ اس کے ساتھ بھی دہرا گناہ کرر ہے ہیں پہلا یہ کہ اس کے لیے مناسب وقت میں نہیں سوچا اور اب سر سے بوجھ کی طرح اتار رہے ہیں وہ بہت بے زرر اور مخلص لڑکی ہے انکل وہ ان سب کی مستحق نہیں ہے جب اسلام لڑکیوں کی پسند کی قدر کرتا ہے حکم ہے کے لڑکی کا فیصلہ اس سے پوچھ کر کرو تو ہم کون ہوتے ہیں ان کا حق ان کی خوشی ان سے چھین لینے والے وہ آپ کے لیے آپ کے بیٹے کے لیے انٹی کے لیے دن رات جان مار کر کماتی ہے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کیا وہ اس قابل ہے جانے وہ آدمی کیسا ہے گل کو لے جا کر جانے کیا سلوک کرے کیا آپ نے سوچا ہے انکل خدا کے لیے اتنا بڑا ظلم مت کریں اب کی بار عنایا آنسوؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ جوڑ کر مشتاق صاحب کے سامنے کھڑی ہوگئی اس معصوم پر اتنا ظلم مت کریں کے روز محشر آپ کو اللہ کے سامنے جواب دیتے ہوئے شرمندگی ہو۔

گل کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا وہ وہیں گرتی چلی گئی طحہ جو جانے کب سے دروازے کی اوٹ میں کھڑا سب سن رہا تھا گل کی طرف لپکا۔

مشتاق نے بیٹے کو یوں لپکتے دیکھا تو پلٹ کر زہرہ کی جانب دیکھا جو فرش پر پڑی تھی اسی لمحے شاہ ازل بھی پولیس کے ہمراہ پہنچ گیا۔

مشتاق کے لیے ساری صورتحال بہت غیر یقینی ہوگئی تھی اس کو یہی مناسب لگا کہ وہ خاموشی سے پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے کبھی واپس نہ آنے کے لیے......

افسانہ

حاجرہ ریحان

انگوٹھی

وہ اپنے ماں باپ کو کھو چکی تھی مگر پہلی بار شدت سے دل چاہا کہ اس کا بھی خاندان ہو......

تینوں نے پستول چلنے کی آواز سنی تھی۔ گولی زناٹے سے نکلی تھی اتنی تیز رفتاری سے کہ کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا نہ سیم کو پستول کا رخ بدلنے کا موقع مل سکا تھا نہ ہی پاپا کو ندا کو اپنے سامنے سے ہٹانے کا ہی موقع ملا تھا یہاں تک کہ ندا کو بھی اپنے دائیں طرف سینے کے عین اوپر ایک گرم سلاخ کے اندر تک گھس جانے کے احساس نے ہی یاد دلایا تھا کہ وہ ابھی تک سیم اور پاپا کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی اور پھر وہ گرتی ہوئی دیوار کی ہی مانند اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی ڈھیر ہوگئی تھی۔

پاپا نے اُس کو قالین پر گرنے سے بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ سیم دو چار قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر سیدھا ہو چکا تھا۔ پاپا اب ندا پر جھکے اسے باقاعدہ روتے بلکتے ہلکے ہلکے آوازیں دے رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بکھرے اُس کے چمکیلے سنہری بال سمیٹ رہے تھے۔ خون کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی لہریں ندا کے سینے سے برآمد ہو کر اپنی مرضی کی جگہ بناتی ٹپا ٹپ قالین پر گر رہی تھیں۔ سیم نے چند لمحوں تک نا سمجھنے والے انداز میں دونوں کا جائزہ لیا تھا اس کے قدم جم کر رہ گئے تھے حالانکہ وہ آگے بڑھ کر ندا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی آنکھیں بند تھیں سر پیچھے کو لڑھک گیا تھا اور ایک ہاتھ قالین پر پڑا خون کی فوار میں نہا رہا تھا۔

اس سے پہلے ندا کو اپنے مرنے کے بارے میں کبھی خیال نہیں آیا تھا ہر طرح کی تکالیف اور تنہائی کے باوجود اس نے اس دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہاں تک کہ کئی روز کی بھوک اور فوسٹر ہاؤس میں لڑکے لڑکیوں سے بے تحاشہ مار کھانے نے بھی اسے مرنے پر نہیں اکسایا تھا۔ مگر ابھی اس لمحے اس کے دل و دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی 'مرجائے' بس اسی طرح وہ پاپا کی بانہوں میں جان دے دے' پاپا اسے محبت سے پکارتے رہ جائیں۔

وہ اس محبت کے اپنے اردگرد مضبوط احاطے میں آخری سانس بھرے کتنا حسین ہے ایسا مرنا' وہ اکیلی تنہا کسی اندھیری انجان گلی کے بیچ میں بے یارومددگار یتیم لاوارث کی طرح نہیں بلکہ اپنے باپ کے ہاتھوں میں جان دے رہی تھی۔

اسے سنائی دے رہا تھا ہلکے ہلکے اسے آواز دی جارہی تھی۔ پاپا اسے ندا کے بجائے ہیرا کہہ کر پکار رہے تھے اب وہ اسے اٹھا کر کہیں لے جارہے تھے وہ مسلسل اس سے سرگوشیاں کررہے تھے۔

''تم کو میں زندہ رکھوں گا میری بچی' میری ہیرا' اب میں تم کو کسی قیمت پر نہیں کھوؤں گا میری بچی' میری پیاری ہیرا' بس ذرا سا انتظار کرو' اپنے باپ پر رحم کرو میری بچی۔'' پتہ نہیں وہ واقعی پاپا کی ہی سرگوشیاں تھیں یا ندا کا مرتے ہوئے دماغ اور رُکتے ہوئے دل کا کارنامہ مگر وہ ان سرگوشیوں سے سرشار ہوچکی تھی۔ اس نے ہوش وحواس کو خیر باد کہنے سے پہلے خدا کا شکر بھی ادا کردیا تھا اور پھر گہرا .ر اچھانے پر اس کے ذہن نے مووی کی طرح سب کچھ دوبارہ سے دکھانا شروع کردیا تھا ابھی چار دن پہلے کی ہی تو بات تھی جب وہ سیم سے التجاؤں میں مصروف تھی۔

''وعدہ کرو کہ تم اس انگوٹھی کو نہیں بیچو گے پلیز..... کرلو وعدہ' اتنا تو کما چکے ہو اس انگوٹھی کے نہ بیچنے سے کون سا بہت بڑا نقصان ہوجائے گا تمہارا' پلیز سیم' مت بیچو اسے پلیز مان جاؤ ناں' دیکھو سیم یہ پاپا کی انگوٹھی ہے ان کو ان کے پاپا نے دی تھی یہ خاندانی انگوٹھی کئی نسلوں سے چلی آرہی ہے اور اب اس پر بھائی کا حق ہے' وہ اسے اپنی بیوی کو پہنائے گا پھر اس کا بڑا بیٹا اپنی بیوی کو' سمجھا کرو سیم' یہ ظلم تو نہ کرو پلیز......'' وہ بری طرح گڑگڑا رہی تھی محبت سے پاپا اور بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی اور سیم شاہانہ انداز میں صوفے پر دراز اس کی التجاؤں اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے باقاعدہ لطف لے رہا تھا۔

''پاگل ہو تم بالکل...... سچ میں پاگل ہو' پتہ



نہیں تمہیں اتنا انوکھا کیوں سوجھتا رہتا ہے اور یہ' یہ لوگ...... یہ پاپا اور بھائی کب سے بن گئے تمہارے ہیں؟ پتہ ہے انگوٹھی کتنی قیمتی ہے' اس کی قیمت اس کے ہیرے نہیں بلکہ اس کی عمر ہے' یہ دیکھو اس کے پیچھے اس کے چھلے کے اندرون میں کون سے تاریخ لکھی ہے؟ 1644' پتہ ہے اتنی پرانی ہے یہ انگوٹھی' یار اس کی بہت قیمت لگے گی اس کو بیچنا تو جیسے بہت ضروری ہے یار' سمجھا کرو ناں۔''

سیم جیسے پہلے سے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ یہ انگوٹھی بیچ کر ہی رہے گا اس نے آج تک ندا (جس کو وہ نڈ کہتا تھا) کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی اکثر ہی اس کی ایسی بچکانہ باتوں پر وہ خوشدلی سے حامی بھر لیا کرتا تھا مگر پتہ نہیں اس انگوٹھی پر ان دونوں کا فیصلہ اپنی اپنی جگہ قائم تھا چار دن گزر چکے تھے صرف اس ایک انگوٹھی کے حق میں نہ تو ندا سیم کی مان رہی تھی اور نہ سیم ندا کو مطمئن کر پا رہا تھا۔

اور اب تو ایک دو دن میں ان دونوں کو اس گھر کو چھوڑ ہی جانا تھا ان چار دنوں میں ہی دونوں کی زندگی نے کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ بالکل بدل گئے تھے۔

شکل وصورت تو دونوں کی ہی اچھی تھی اب جو چار دن سے کھانے پینے کی فراوانی اور رات دن کا آرام میسر آیا تھا تو ندا کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل کر گلاب جیسا ہو گیا تھا اور سیم کے ڈیل ڈول میں وجاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ چار دن ہوئے وہ دونوں اس گھر میں جب داخل ہوئے تو خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ تھا اور اب جبکہ یہ دونوں کوچ کر رہے تھے تو روکنے والا بھی کوئی سامنے نہیں آیا تھا' ان چار دنوں میں جہاں ندا ڈرائنگ روم میں بیٹھی گھریلو فلمیں دیکھتی رہتی' سیم پورے گھر میں موجود مختلف چیزیں بلیک میں بیچ کر آتا رہا تھا پہلے دن اس کی جیب پھولی دوسرے دن پونڈز رکھنے کے لیے ایک جوتے کا ڈبہ لے لیا گیا اور تیسرے دن جوتے کے ڈبے کی جگہ ایک بڑے گتے کے کارٹن نے لے لی...... کہاں تو یہ لوگ چند پونڈز کے سکوں پر ہفتہ ہفتہ گزارتے تھے اور اب کہاں پونڈز نوٹوں کی صورت میں ہی چلے جا رہے تھے۔

''یار یہاں کی صفائی کے لیے ایک ہفتہ بہت کم ہے یار......'' اکثر سیم جب رات گئے تھکا ہارا گھر آتا تو ندا کو اُسی طرح ٹی وی پر گھریلو مووی دیکھتے دیکھ کر اس کی توجہ اپنے اصل مقصد کی طرف منتقل کرنے کے لیے کہتا...... کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ندا بھی اس کے ساتھ اس کے کام میں مدد کرے' صبح اٹھتے ہی سیم گھر میں موجود چیزوں جیسے مختلف اقسام کے گملے...... سجاوٹ میں جگہ جگہ رکھی ہوئی کرسٹل کے عجیب وغریب پیس اور دیواروں پر لٹکی مہنگے فریموں والی نایاب تصاویر ڈرائنگ روم میں لا کر ڈھیر کرتا اور پھر شام تک گھر کے وسیع گیراج میں کھڑی ہوئی تین چار جدید ماڈل کی کسی گاڑی میں بھر کر بلیک مارکیٹ نکل جاتا۔

وہ جانتا تھا کہ ندا کو اس سے زیادہ ان تمام چیزوں کی سمجھ تھی وہ سمجھتا تھا کہ اگر ندا اس کام میں دلچسپی لے تو اسے ان چیزوں کی صحیح قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب یہی کہ کل جو وہ ایک عدد تصویر بیچ رہا تھا تو اسے خریدنے والے دکاندار کی مسکراہٹ سے سیم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ تصویر اس قیمت سے کہیں زیادہ تھی جو دکاندار اسے پکڑا رہا تھا مگر سیم کیا کرتا بلیک مارکیٹ میں سب ہی جانتے تھے کہ

چوری کے سامان پر بھاؤ تاؤ نہیں کیا جاتا مگر پھر بھی اتنا تو سیم کر سکتا تھا کہ قیمت کے حساب سے ہی اپنی ڈیمانڈ رکھتا...... مگر ندا تو جب سے آئی تھی ٹی وی سے جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اصل میں اس میں بھی سیم کا ہی قصور تھا۔

پہلی رات جب وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو پہلے تو دونوں نے خوب جی بھر کر فریج سے کھانے پینے کا سامان نکال کر کھایا' اتفاق سے دونوں کے ہم عمر بھی اصل مالکین میں شامل تھے لہٰذا پیٹ بھرنے کے بعد ندا اور سیم نے وسیع و عریض علیحدہ غسل خانوں میں نہا دھو کر اپنی پسند سے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔ سیم تو ہر سامان اور چیز ایسے استعمال کر رہا تھا جیسے صدیوں سے اسی گھر میں رہتا آیا ہو بلکہ وہ تو ندا کو باقاعدہ ہدایات دیتا رہا تھا کہ دیکھو ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیوم ہوگا استعمال کر لینا اور گیلے بالوں میں کنگھی کرنے سے پہلے ڈرائیر لگانا نہ بھولنا...... ارے ہاں تم ایسا کرو کہ جامنی رنگ کا جوڑا پہن لو۔

جبکہ ندا سہمی ڈری ہر ایک آہٹ سے دبکی چلی جارہی تھی اور بضد تھی کہ اتنا کافی ہے اب یہاں سے نکل جانے میں عافیت ہے مگر سیم کا مقصد تو کچھ اور تھا اور اسی لیے ندا کی جھجک کو ختم کرنے کے لیے سیم اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا جہاں دونوں نے کچھ دیر بیٹھ کر خوبصورت مگوں میں گرم کافی پی تھی اس کے بعد سیم نے ٹی وی آن کر کے ریک میں سجی ہوئی بہت سی سی ڈیز میں سے ایک گھریلو مووی لگا دی تھی۔

مووی میں ایک اچھی صحت اور متناسب قد کے جاذبِ نظر ادھیڑ عمر صاحب شاید اپنی دس یا گیارہ سالہ بچی کو سائیکل چلانا سکھا رہے تھے۔ وہ پاپا تھے جبکہ بچی کا نام حرا تھا...... انگریزی تلفظ میں مل کر حرا کو ہیرا کہہ کر پکارا جارہا تھا۔ دوسری طرف سائیکل کے کیریئر سے ذرا پیچھے بچی سے کچھ سال بڑا لڑکا ہوشیار خبردار بنا بہت دلجمعی سے باپ بیٹی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ حرا کا بڑا بھائی تھا جس کو حرا بھائی کہتی تھی۔

یہاں تک کہ پاپا بھی اسے بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ کیمرہ شاید ایک جگہ رکھ دیا گیا تھا جس کے باعث کبھی یہ لوگ مووی میں نظر آتے کبھی سائیکل کے چلائے جانے پر غائب ہو جاتے۔ یہ ایک نہایت معمولی سی مووی تھی بقول سیم نہایت بورنگ اور جب اُس نے مووی بدلنا چاہی تو ندا نے منع کر دیا تھا جس کے بعد سیم ندا کو مصروف دیکھ کر اطمینان سے چند ہی منٹوں میں ایک صوفے پر ٹانگیں پسارے سو گیا تھا اور تب سے ہی ندا کو جیسے چسکا لگ گیا۔

وہ ایک کے بعد ایک کر کے تمام گھریلو موویز دیکھتی چلی جارہی تھی پتہ نہیں وہ ان گھریلو فلموں میں کیا تلاش کر رہی تھی ہر مووی جیسے اس کے دل پر اثر کر رہی تھی کبھی کسی مووی میں پاپا بھائی کو جو کہ اُن کا بیٹا تھا پیار کرتے نظر آتے' کسی میں دونوں باپ بیٹا کھانا پکاتے نظر آتے...... کسی مووی میں حرا باپ اور بھائی کے درمیان بیٹھی کیک کاٹتے نظر آتی جبکہ کسی مووی میں حرا اپنی خوابگاہ میں باپ کے ساتھ بستر پر بیٹھی ہوتی اور پاپا کتاب سے اُسے پڑھ کر کوئی کہانی سنا رہے ہوتے۔

یہ بات بھی واضح تھی کہ اُن تینوں کے علاوہ گھر میں کوئی نہ تھا کیونکہ فلم میں ہمیشہ یا تو باپ بیٹا یا بہن بھائی یا باپ بیٹی ہی نظر آتے تھے۔ یقیناً تیسرا مووی بناتا یا پھر کیمرہ کہیں مستقل رکھ دیا جاتا۔ ندا جیسے انجانے میں ان کے گھر کا چوتھا فرد

بنتی جارہی تھی ہر مووی کے بعد وہ گھر میں اُس حصے میں ضرور جاتی جہاں پر وہ مووی بنائی گئی ہوتی۔

کبھی حرا کے بستر پر بیٹھی کبھی کچن میں جاکر برتنوں کو ٹٹولتی، کبھی گیراج میں جاکر حرا کی چھوٹی سائیکل دیکھتی، اور اکثر ہی وہ حرا کے دراز سے کہانیوں کی کتاب نکال کر پڑھنے لگتی۔ یہ سب کرتے اُس کی آنکھیں بھیگتی رہتی تھیں۔ یہ بات بھی سمجھ آرہی تھی کہ یہ تمام مووی پرانے وقتوں کی تھیں اور ہر مووی کے ساتھ حرا' بھائی بڑے ہوتے نظر آرہے تھے۔ ندا بھی جیسے آہستہ آہستہ حرا کے ساتھ بڑی ہورہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ بھی ہر مووی کے بعد جیسے قد میں اور عمر میں بڑھ رہی تھی۔

اور اندر ہی اندر وہ ان تینوں کو اپنے بہت پاس محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے سیم کے پیسے جمع کرنے اور نت نئی چیزوں کے بیچے جانے پر اس کی کمائی میں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ فریج میں اتنا کھانا بھرا پڑا تھا کہ وہ دونوں چاہ کر بھی ایک ہفتے میں ختم نہیں کرسکتے تھے اس پر سیم آتے ہوئے اپنی پسند کا کیک' پیزا یا پھر نوڈلز لے آتا اور پھر اُن دونوں کو اتنا کھانے کی عادت بھی کہاں تھی۔ ندا تو جو صبح سیم کے ساتھ تھوڑا بہت ناشتہ کرتی اُس میں ہی اتنی لبریز رہتی کہ جب تک سیم لوٹ کر نہ آتا وہ کچن کا رخ نہ کرتی۔

ان چار دنوں میں وہ کسی روبوٹ کی طرح مووی پر مووی دیکھ رہی تھی۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی تھی۔ سیم اُسے کتنی ہی ہدایات کرکے جاتا مگر وہ پورا دن ایک الگ ہی طرح کی سوچ میں گزار دیتی۔ کبھی کبھی وہ خود سے ناراض ہوجاتی۔ وہ یہاں کیوں آئی' ٹھیک ہے سیم نے ایسا چاہا تو وہ منع بھی تو کرسکتی تھی ناں......آخر کیا ضرورت تھی اسے اس طرح کسی کے گھر میں بلا پوچھے گھسنے کی اور اب جو وہ اس قدر ان تینوں میں غائبانہ گھل مل گئی ہے......کس طرح خود کو ان تینوں سے الگ کرے گی' کیسے ممکن ہوگا خود کو سنبھالنا جب ان تینوں کی یاد آئے گی پھر اسے سیم پر غصہ آنے لگا۔

یہ سیم ہی تھا جس نے ندا کو اچانک اس گھر میں لاکھڑا کیا تھا پہلے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ لوگ دروازہ کھٹکھٹا کر بھیک مانگیں گے اپنے مسلمان نام بتا کر اور اپنی مظلومیت جتا کر ہمدردی حاصل کریں گے اگر خاتون خانہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہوئیں تو ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اگلے وقت کے کھانے کے پیسے بھی مل جائیں۔ اُن دونوں کی زندگی کئی مہینوں سے اسی طرح مسلمان خاندانوں سے بھیک مانگتے گزر رہی تھی۔

سیم (یعنی سلیمان) اور نڈ (یعنی ندا) نام کے مسلمان تھے۔ سیم کے والدین کسی زمانے میں پاکستان سے برطانیہ آئے تھے۔ سیم شاید کوئی چار یا پانچ برس کا تھا جب اُس کے والد کا حادثے میں انتقال ہوگیا۔ سیم کی ماں کسی طرح بھی پاکستان واپس جانا نہیں چاہتی تھی اس نے چند ہی مہینوں میں اپنے خاوند کے ایک انگریز لاأبالی اور نشئی دوست سے اس شرط پر شادی کرلی کہ جیسے ہی اس کو یہاں کی مستقل رہائش کا ویزہ مل جائے گا وہ اسے چھوڑ دے گی۔

اصولاً دونوں کو الگ الگ رہنا تھا مگر انگریز کی نیت خراب ہوگئی اور سیم کی ماں کو اُس کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا۔ جس کے بعد انگریز سوتیلے باپ کا سیم کے ساتھ ایسا رویہ ہوگیا

کہ سیم جب تک اٹھارہ سال کا نہ ہوا تھا تو صرف سونے کے لیے گھر جاتا اُسے نہ تو اسکول بھیجا جاتا تھا اور نہ ہی وہ پڑھنے میں کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔

اس کا سوتیلا باپ جس علاقے میں رہائش پذیر تھا وہ کوئی شریفوں کا محلّہ نہیں تھا لہٰذا سیم کا چوری اور جوا سیکھنا ایک عام سی بات تھی۔ سیم کی ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی وہ جیسے تیسے انگریز کے ساتھ گزارا کر رہی تھی۔ مگر چار پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی سیم کی ماں کو اپنے نام کے شوہر سے الگ ہونے کا خیال نہیں آیا تھا۔ لہٰذا سیم اپنی ماں سے بھی مایوس ہو کر مستقل ہی گلیوں اور سڑکوں پر رہنے لگا تھا۔ اکثر کئی دن وہ باہر ہی کسی گلی یا محلے کے پارک میں سو کر گزار دیتا۔ کھانے کے لیے وہ کسی بھی اسٹور میں جا کر چوری کر لیا کرتا اور زیادہ ہوتا تو بھیک مانگ لیتا۔ مگر اسے بھیک کم ہی ملتی تھی۔

کیونکہ اب وہ ہٹا کٹا انیس سال کا نوجوان ہو چکا تھا ایسے میں خوش قسمتی سے اسے ندا مل گئی تھی۔ ندا اسے ایک مسلم فوسٹر ہاؤس کے باہر ملی تھی۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں نے اسے مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ فوسٹر ہاؤس کے لڑکیوں کی تیزی اور چالاکیوں سے سیم اچھی طرح آگاہ تھا۔

یہاں آنے والی جتنی بھی معصوم اور نادان ہو چند ہی مہینوں میں مکار اور بے ہودہ ہو جاتی تھی۔ مگر ندا میں اسے وہ چالاکی اور بے ہودگی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے نرم اور چمکیلے سنہرے بال بری طرح کھینچے جانے پر اس کے نازک کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے پرانے کپڑے کھینچا تانی میں کئی جگہوں سے پھٹ گئے تھے اور سر گھٹنوں میں دیے بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔ اس فوسٹر ہاؤس میں سیم کا ایک دوست رہا کرتا تھا جس کی بلیک مارکیٹ میں کافی جان پہچان تھی سیم اُس سے ہی ملنے گیا تھا مگر ندا کو باہر سیڑھیوں پر روتا دیکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

ندا کو جیسے کسی ساتھ کی بہت ضرورت تھی چند ہی منٹوں میں سیم نے اس سے اس کے بارے میں سب کچھ ہی اگلوا لیا تھا۔ ندا اپنے ماں باپ کے انتقال پر اس فوسٹر ہاؤس میں چند سالوں پہلے بھیجی گئی تھی اس کے ایک چچا اپنے بال بچوں کے ساتھ دوسرے شہر میں رہتے تھے مگر انہوں نے ندا کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ندا کے والدین برطانیہ کے باقاعدہ شہری تھے لہٰذا اُن کے انتقال کے بعد ندا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل تھی لہٰذا اُس کا ٹھکانہ فوسٹر ہاؤس بن گیا تھا۔ یتیم لاوارث اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کے لیے حکومت کی مدد سے یہ فوسٹر ہاؤس ایک مسلمان خاتون نے بنایا تھا۔

یہاں تقریباً ڈیڑھ درجن مختلف عمروں کے لاوارث یا پھر بن ماں باپ کے مسلم خاندانوں کے بچے رہتے تھے۔ حکومت کی طرف سے اس فوسٹر ہاؤس کو بھی اچھی خاصی رقم مہیا کی جاتی تھی مگر اُس میں کچھ ہی بچوں پر لگائی جاتی تھی۔ ہر فوسٹر ہاؤس کی طرح یہاں کا بھی آوا بگڑا ہوا تھا گھر میں کوئی کسی کا نگہبان نہیں تھا کھانا پکا کر کچن میں ہی چھوڑ دیا جاتا جو جتنا طاقتور ہوتا اتنا ہی کھانا نکال کر کھا لیتا...... ایسے میں چھوٹے بچے زیادہ تر بھوکے ہی رہتے تھے۔

اس پر بھی بڑے لڑکے لڑکیاں اُن سے اپنے چھوٹے چھوٹے کام کرواتے ...... جب غصہ آتا تو مار پیٹ کرتے ...... نہانے دھونے کے لیے

لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ایک ہی غسل خانہ تھا مگر اس میں بھی زیادہ تر طاقتور کا قبضہ رہتا۔ اسکول کی کوئی باز پرس نہ تھی۔

کپڑوں کے نام پر ہر چھ مہینے پر ایک جوڑا وہ بھی خیراتی ادارے سے مل جایا کرتا تھا۔ جو مار پیٹ میں چند ہی ہفتوں جسم پر سلامت رہتا۔ سونے کے لیے ایک ہال جیسا بڑا سا کمرہ تھا جس میں سب کے بستر لائن سے لگے ہوئے تھے۔ سردیوں میں بچت کی خاطر کم ہی ہیٹر چلایا جاتا جس کے باعث اکثر ہی ایک دوسرے کے اوڑھنے کے کمبل چوری کر لیے جاتے یوں فوسٹر ہاؤس میں جیسے تیسے دن گزار کر بچے اٹھارہ سال کے ہوتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔ ندا داخلے کے وقت گیارہ سال کی اور سیم کو ملنے کے وقت سولہ سال کی تھی مگر ابھی اسے اسی جہنم میں دو سال اور گزارنے تھے جبکہ ندا کی معصومیت کا اندازہ اس سے بڑھ کر کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سولہ سال کی ہو کر بھی مار ہی کھا رہی تھی۔

دوسری طرف اس سے ایک دو سال کم عمر یا اس کی ہم عمر لڑکیاں اب تک طاقتور کی لسٹ میں شامل ہو چکی تھیں۔

دبلی پتلی مدقوق شرمائی گھبرائی لڑکھڑاتی زبان میں بات کرنے والی ندا، سیم کو بہت پسند آئی اور اُس نے اُسی دن ندا کو اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی۔

ندا کو شدید بھوک لگ رہی تھی اور سیم کی پیشکش میں رات کا کھانا بھی شامل تھا لہٰذا وہ چوں چراں کیے بغیر اُس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی۔ سیم پہلے اسے ایک گھٹیا سے مسلم ریسٹورنٹ لے گیا جہاں دونوں نے کھانا کھایا کہ دونوں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ مسلمان حلال کھانا کھاتے ہیں۔ وہ دونوں اپنے ماں باپ سے نام کے علاوہ بس ایک یہی تعلیم حاصل کر سکے تھے۔

اس کے بعد ندا سیم کے ساتھ بلیک مارکیٹ گئی جہاں پر جب سیم نے چوری شدہ ایک پرانی گھڑی کاؤنٹر پر رکھی تو ندا نے جھٹ اس کے بارے میں کافی ساری معلومات دے دیں جس کے باعث سیم کو اس کی قیمت مانگنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ بعد میں معلوم چلا تھا کہ نایاب اور نادر چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی ندا حد سے زیادہ شوقین تھی جس کے باعث وہ اکثر ہی کسی نہ کسی میوزیم کے چکر لگاتی رہتی تھی اور اس کی معلومات سیم کے مطابق اتنی اچھی تھیں کہ ناقابلِ یقین تھیں سیم کے برعکس ندا اسکول جانے کی بھی شوقین تھی لہٰذا فوسٹر ہاؤس میں ہر طرح کی مشکلات میں بھی وہ اسکول باقاعدگی سے جا رہی تھی۔

ندا کا اپنی زندگی کے لیے سیم کی ہی طرح کوئی معیار یا لائحہ عمل نہیں تھا مگر وہ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے اپنا دماغ بنا چکی تھی اور کسی نہ کسی طرح اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے مختلف یونیورسٹی میں درخواستیں بھیج چکی تھی۔

جن میں سے چند ایک نے اُسے حوصلہ افزا جوابات بھی ارسال کر دیے تھے۔ پھر بھی ابھی دو سال باقی تھے۔ اٹھارہ سال ہونے پر ہی وہ نوکری کی تلاش شروع کر سکتی تھی۔ ایسے میں سیم اس کے لیے رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا کم از کم اب ندا کو دو چار دن میں پیٹ بھر کر ایک وقت کا کھانا تو میسر تھا۔

ٹھیک ہے سیم اُسے جگہ جگہ بھیک مانگنے کے لیے استعمال کرتا کیونکہ ندا پڑھی لکھی تھی وہ اکثر بھیک مانگتے کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال کرتی

کہ سامنے والا پسیج جاتا۔ اس کی سچائی پر فوراً یقین کرلیتا۔ وہ دونوں زیادہ تر انڈین یا پاکستانی مسلم کے ہاں بھیک مانگنے جاتے تھے۔ اُن دونوں کی سانولی پیلی رنگت ایسے میں اُن کا بہت ساتھ دیتی تھی وہ اپنے خاندان اور اُن پر گزرنے والی بپتا سنانے سے کبھی پرہیز نہ کرتے اور ایسے ہی ایک دن معمول کے مطابق اسکول کے دروازے پر ہی سیم نے ندا کو اس گھر کے بارے میں بتایا۔

یہی کہ ایک ایسے گھر جا رہے ہیں جہاں کے لوگ اتنا دیالو ہیں اتنے دیالو ہیں کہ مانگے بنا ہی اپنا پورا گھر دے دیں گے۔ اُس وقت ندا صرف مسکرا کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ وہ سیم کو اچھی طرح جانتی تھی۔ سیم اکثر اُسے خوش کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ گو کے ندا نے اپنے انداز سے کبھی ظاہر ہونے نہیں دیا تھا مگر جیسے سیم کو اس کے چہرے پر بھیک ملنے کے بعد کی اداسی اور شرمندگی صاف نظر آجاتی تھی لہٰذا وہ اکثر ہی ندا کو کسی بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے دو چار مذاق کرلیا کرتا تھا مگر پھر اس گھر کے سامنے یعنی مین گیٹ پر جانے کے بجائے سیم نے پچھلے چھوٹے دروازے (جو کہ زیادہ تر ایسے بڑے گھروں میں کام کرنے والے ملازمین کے زیر استعمال رہتے ہیں) کی طرف قدم بڑھائے اور پھر دروازے کے باہر آٹومیٹک لاک کے چند بٹن دبا کر وہ بڑے سکون اور اطمینان سے گھر میں داخل ہوگیا۔

اس دروازے سے وہ لوگ گھر کے کچن میں داخل ہوئے تھے اور چند ہی لمحوں میں ندا کو محسوس ہوگیا تھا کہ گھر مکمل طور پر خالی ہے۔ پھر سیم نے اس کو پوری کہانی سنائی تھی کہ کس طرح وہ ایک سپر اسٹور میں کچھ چرانے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا کہ ایک صاحب اپنے فون پر اپنی میڈ (ملازمہ) کو ایک ہفتے کی چھٹی کرنے کا کہہ رہے تھے۔ پھر سیم نے جانا کہ وہ صاحب ایک ہفتے کے لیے پاکستان جا رہے ہیں اور ملازمہ کو ہدایات تھیں کہ اُن کے واپس آنے سے ایک دن پہلے وہ گھر کی صفائی کے لیے چلی جائے۔

پھر صاحب نے ملازمہ کو اپنے گھر کے سکیورٹی لاک کا نمبر بتایا تھا۔ یہ سب باتیں وہ بہت ہلکی آواز میں کر رہے تھے مگر سیم کیونکہ کان کھڑے کر چکا تھا لہٰذا ایک ایک بات کو ذہن نشین کرتا گیا تھا اُس وقت ہی سیم نے اُن صاحب کا پیچھا کرنے کا سوچ لیا تھا مگر پھر اتفاق سے جب صاحب کیش کاؤنٹر پر پیسے دینے کے لیے اپنا بٹوہ نکال رہے تھے تو اُن کی جیب سے ایک پرچہ گر پڑا جو کہ کسی الیکٹرانک مارکیٹ سے ریکارڈر خریدنے اور بک کرانے کی رسید تھی اور رسید پر ریکارڈر پہنچانے کے لیے گھر کا مکمل پتہ لکھا تھا۔

سیم نے وہ پرچہ اچک لیا تھا اور اپنی اتنی بڑی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ دوسرے دن سیم پتے پر پہنچا اور جب کئی بار بیل بجانے پر کوئی نہ آیا تو پچھلے دروازے سے وہ گھر میں داخل ہو کر مزے میں پورے گھر کا چکر کاٹ کر سیدھا ندا کو لینے پہنچ گیا تھا۔ ندا کو بھی فوسٹر ہاؤس میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا اور سیم تو تھا ہی ہمیشہ کا آزاد دونوں مزے میں گھر میں تین چار دن سے قیام پذیر تھے سیم پہلی رات سے ہی گھر کی چیزیں بیچ کر آرہا تھا اور پھر دوسرے دن اس نے جو گھر کا خفیہ لاکر ڈھونڈ کر کھولا تو اس میں چند تصاویر، ایک عدد چھ گولیوں والی پستول، کچھ کاروباری کاغذات کے ساتھ اُسے یہ انگوٹھی بھی ملی تھی۔ اس وقت ان دونوں کو اس انگوٹھی میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوئی

تھی مگر پھر ندا نے ہی ایک گھریلو مووی میں پاپا کو اس انگوٹھی کے بارے میں بچوں کو بتاتے سنا تھا۔

یہ انگوٹھی ان کے خاندان میں کئی سالوں سے چلی آرہی تھی اور اب یہ انگوٹھی ان کے بیٹے کے حصے میں آنی تھی۔ اس انگوٹھی کو ہمیشہ گھر کا سب سے بڑا لڑکا اپنی شادی کے موقع پر اپنی بیوی کو پہناتا تھا اور پھر جب تک بیوی حیات رہتی اس انگوٹھی کی حفاظت کرتی' اس مووی کو دیکھنے کے بعد جہاں ندا اس انگوٹھی کو بیچنے سے انکاری تھی وہیں سیم بضد تھا۔

اس کا خیال تھا کہ جو معلومات صاحب نے اس انگوٹھی کے بارے میں دی ہیں وہ بھی اگر بلیک مارکیٹ میں بتائے گا تو انگوٹھی کی قیمت کافی زیادہ ہو جائے گی۔ مگر ندا کی بار بار کی تنبیہ سے وہ ابھی تک اسے بیچ نہیں سکا تھا بس دونوں روزانہ رات کو ایک دوسرے کو سمجھاتے تھے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے بجائے سو جاتے مگر سیم کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ ندا کو اس معاملے پر راہ پر لانا ناممکن ہے کیونکہ وہ کچھ اسی طرح اس گھر کے باسیوں سے جڑتی چلی جارہی تھی۔

اور ان کے بارے میں بات کرنے لگی تھی جیسے وہ بھی اس خاندان کا جزو ہو...... یہاں تک کہ ایک دن سیم نے رات گئے واپسی پر ڈرائنگ روم میں اسے جائے نماز بچھاتے نماز پڑھتے دیکھا۔

اس کے سامنے چھوٹی سی تپائی پر ایک ڈائری میں کچھ آیتیں لکھی رکھی تھیں جن کو بار بار آگے بڑھ کر جھک کر پڑھتی پھر واپس جائے نماز پر نماز پڑھنے لگتی۔

کافی دیر کے اس تماشے کے بعد آخر کار ندا نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی تو اس نے فخریہ سیم کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ مار کر آ گئی ہو پھر وہ ہمیشہ کی طرح خوشی اور مسرت سے اسے بتانے لگی کہ کس طرح اس نے مووی میں پاپا کو اپنے بچوں کو نماز پڑھاتے دیکھا اور کس طرح انہوں نے مردوں اور عورتوں کے نماز پڑھتے ہوئے کچھ فرق کو نمایاں کیا۔

کس طرح انہوں نے حرا کو دوپٹہ پہننا سکھایا اور پھر کس طرح وہ تینوں ایک ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

جس میں پاپا اونچی آواز میں تمام آیتیں پڑھتے جاتے اور بچے ان کی پیروی میں بولتے جاتے۔

ندا نے اسے بتایا کہ وہ اسکول جاتی رہی ہے جہاں پر مذہبی پیریڈ میں اسے کچھ اسلامی کتب دے دی جاتی تھیں جبکہ دوسرے مذاہب کے بچوں کو بھی ان کے مذہب کے مطابق کتب فراہم کی جاتی' اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مسلمانوں کی عبادات میں کیا کیا شامل ہے اور کون سے فرائض روز کی بنیاد پر ادا ہونے ضروری ہیں مگر آج تک اس نے کبھی کوشش نہیں کی کہ نماز پڑھنے کے لیے کسی مسجد میں چلی جاتی (وہاں اکثر ہی مساجد میں خواتین کے لیے نماز پڑھنے کی علیحدہ جگہیں ہوتی ہیں) نہ ہی اس سے ان سب کے بارے میں فوسٹر ہاؤس میں کبھی پوچھا جاتا تھا مگر اب ندا کا فیصلہ تھا کہ وہ ضرور مسجد میں جاکر وہاں کی کسی معتبر خاتون سے قرآن شریف پڑھنا سیکھے گی اور ساتھ میں نماز کی پابندی کرنے کی کوشش کرے گی۔

جہاں سیم گھر کا سامان بیچ کر آگے کے دنوں کے لیے پونڈز جمع کررہا تھا اسی طرح ندا بھی روز کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھ کر آگے جاری رکھنے کے

بارے میں بتاتی، سیم کو ندا سے ابھی تک کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی وہ اسے گھر پر چھوڑ کر اسی لیے جاتا تھا کہ اگر پیچھے کچھ ہو تو ندا کم از کم اس کو خبردار کردے مگر ایک دن سیم کو ندا پر شدید غصہ آنے لگا۔

اُس دن وہ گھر پر آیا تو خوش تھا کیونکہ اس نے گیراج میں رکھی ایک مہنگی اسپورٹس کار کی بہت ہی زبردست ڈیل کرلی تھی اور فیصلہ ہوا تھا کہ وہ دوسرے دن جا کر پیسے لے کر گاڑی خریدنے والے کے حوالے کردے گا، خریدنے والا ایک نامی گرامی بلیک مارکیٹ کا غنڈا تھا جو احتیاطاً اُسی دن گاڑی لینے سے انکاری تھا لہٰذا یہی بات ہوئی کہ آج قیمت پر سمجھوتا کرلیا جائے اور ڈیلیوری کل رکھی جائے۔

سیم واپسی پر ندا کے لیے بہت مہنگا سا پھولوں کا گلدستہ اور اعلیٰ معیار کی چاکلیٹ کا ڈبہ لے کر آیا تھا مگر گھر پہنچنے پر اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی تھی کیونکہ ندا زار و قطار رو رہی تھی۔ پہلے تو سیم ڈر گیا سمجھا کہ کوئی نہ کوئی گھر پر آ کر جا چکا ہے اور ندا اور اس کی چوریاں پکڑی گئی ہیں مگر پھر ندا نے اسے روتے روتے بتایا کہ آج جو اس نے مووی دیکھی اس میں پتہ چلا کہ حرا جس کے لیے پاپا اور بھائی دل و جان ایک رتے تھے کسی حادثے کا شکار ہو کر مرگئی۔

مووی میں دونوں باپ اور بیٹے حرا کی برسی پر افسردہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں اور دونوں حرا کو یاد کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔

باتوں سے معلوم چلا کہ حرا اسکول سے واپس آرہی تھی کہ اس کی سائیکل کو کوئی نشئی گاڑی والا زوردار ٹکر مارتا اور روندتا نکل گیا۔ جس کے بعد حرا موقع پر ہی ہلاک ہوگئی، ندا جو اب تک حرا کے کمرے میں رہتی رہی تھی اور اس کی الماری سے مختلف کپڑے اور جوتے بے دھڑک استعمال کررہی تھی سب کچھ واپس لے جا کر اس کی الماری میں ویسے ہی سجا چکی تھی اور اب اپنے اُن ہی کپڑوں کو پہنے بیٹھی تھی جس میں وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی پھر سیم نے اسے کتنا ہی سمجھایا اسے کتنا ہی دلاسہ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس بات پر بضد ہوگئی کہ وہ اس خاندان کی اس پونجی کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گی اس نے اب تک جو بھی حرا کے کمرے میں کیا تھا سب کے نشان بھی مٹا چکی تھی۔

بستر بنا کر اور چیزیں ویسے ہی سلیقے سے سجا کر وہ اُس کمرے کو پہلے کی طرح بند کر کے اب ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

تھوڑی دیر میں سیم نے بھی ہار مان لی تھی۔ ویسے بھی وہ کل یا پرسوں یہ گھر چھوڑنے ہی والے تھے مگر وہ چاہتا تھا کہ ندا تھوڑی سی عقلمندی کا مظاہرہ کر کے کچھ کپڑے تو حرا کے لے ہی لے کہ جن کپڑوں میں وہ تھی وہ حد سے زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ جب ندا نہ مانی تو سیم نے اسے پونڈز دینے چاہیے اُسے پیشکش کی کہ وہ اب اس قدر مالی طور پر مستحکم ہے کہ اسے ایک دو جوڑے دلا بھی سکتا ہے مگر ندا نہ مانی......

وہ اب اس گھر میں ایک منٹ بھی گزارنے پر تیار نہ تھی اور نہ ہی اس گھر کے سامان بیچے جانے کی کمائی سے کچھ حصہ لینے پر راضی تھی۔ جیسے ہی سیم آیا وہ اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ بس اس نے جانے سے پہلے ایک بار پھر سے سیم کو انگوٹھی کے بارے میں منایا تھا اور آخر کار اپنی دوستی کا واسطہ دے کر سیم کو راضی کرلیا تھا کہ وہ انگوٹھی بیچنے سے گریز کرے گا۔ ندا مطمئن ہو کر گھر

سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

جبکہ سیم نے دوسرے دن گاڑی لے جانے کے بعد خود بھی کوچ کا سوچ رکھا تھا۔ ندا فوسٹر ہاؤس پہنچی تو اس کی غیر موجودگی میں اس کا بستر اور اوڑھنے کا پھٹا پرانا سا کمبل دونوں پر ہی قبضہ ہو چکا تھا بہر حال ابھی اسے اس جگہ اپنے دو سال مکمل کرنے تھے اور وہ ہر طرح کی زیادتی برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ مگر اب اس کے پاس ایک بہت ہی مضبوط سہارا آ گیا تھا' خدا سے دعا مانگنے کا...... اس نے حرا اور حرا کے گھر والوں سے سیکھا تھا کس طرح دکھ اور تکلیف میں خدا کو پکارا جاتا ہے کس طرح خوشی میں سرشار ہو کر خدا کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اس نے پاپا کو کئی بار اپنے بچوں سے کہتے سنا تھا کہ جن کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا خدا ہوتا ہے اور جن کا خدا ہوتا ہے اُن کا ہر کوئی ہوتا ہے' حیرت ہے اتنی سی بات آج تک کسی نے ندا کو کیوں نہیں بتائی تھی۔ تسلی کے یہ چند بول جو کہے تو کسی اور سے گئے تھے مگر جیسے ندا کو سر سے لے کر پاؤں تک مکمل کر گئے تھے۔ اب اُسے اپنا آپ اس قدر اکیلا تنہا نہیں لگ رہا تھا جس طرح پہلے لگتا تھا۔

صابر تو وہ پہلے بھی تھی مگر اب اسے صبر کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ جیسے اُس کے اندر صبر اور خدا کی رحمت کا اعتبار پہلی بار جاگا تھا۔ جہاں ندا نے اس گھر میں فقط چار دن گزار کر بہت کچھ سیکھا تھا۔

دوسری طرف سیم نے خوب کمایا تھا۔ وہ پہلے ہی اسے بتا چکا تھا کہ اتنی ساری چیزیں بیچنے کے بعد جب پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں ہو گی تو بلیک مارکیٹ میں ہر کوئی اس کا ہی نام لے گا لہٰذا اس سے پہلے ہی وہ یہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر ٹھاٹ سے جا بسے گا' اس نے کئی بار ندا کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تھی مگر ندا کو اپنی منزل سے سے بہت جدا نظر آنے لگی تھی اور واپس آنے کے بعد سے اس نے بہت ہمت اور صبر سے وقت گزارنے کا نئے سرے سے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھی تھی کہ اب سیم اس سے ملنے کبھی نہیں آئے گا مگر حیرت انگیز طور پر پانچویں ہی دن سیم اسے اسکول کے گیٹ پر اُس کا منتظر نظر آیا...... ندا کو دیکھتے ہی سیم شروع ہو گیا تھا۔

''یار میں بری طرح پھنس گیا ہوں' تمہارے جانے کے بعد دوسری رات حسب وعدہ مجھے گاڑی دینے جانا تھا مگر دوپہر تک میں سو کر اٹھا تھا کہ نیچے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید ملازمہ ایک دن پہلے ہی صفائی کرنے آ دھمکی تھی اور اپنے ساتھ دو چار اور بھی کام کرنے والے لے آئی تھی۔ بس یار میں بڑی مشکلوں سے پونڈ کا ڈبہ ہی ساتھ لا سکا۔'' سیم نے ندا کے ساتھ چلتے ہوئے جلدی جلدی بتایا۔

''تو اب تک تم یہاں کیا کر رہے ہو تمہیں تو جلد از جلد شہر سے نکل جانا تھا؟'' ندا نے ساری بات سن کر جلدی سے جواب دیا۔

''یار تم سمجھ نہیں رہیں وہ غنڈہ...... ان لوگوں کا پولیس سے زیادہ تیز نیٹ ورک ہوتا ہے' میں کہیں بھی چلا جاؤں وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا...... اسے تو گاڑی چاہیے جیسے بھی ہو یار اس کے دو غنڈوں نے کل رات مجھے ڈھونڈ نکالا اور دھمکا کر گئے ہیں کہ میں گاڑی لاؤں یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں میں تو پھنس گیا ہوں یار...... اب تک تو گھر کے اصل مالک بھی آ چکے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ چوری کی اطلاع پر اُن کے گھر پر پولیس کے بھی چکر لگ رہے ہوں۔'' سیم نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر کیا کرو گے تم سیم ایسا کرو تمام باتیں پولیس والوں کو بتا دو..... ٹھیک ہے ہوسکتا ہے تم کو کچھ سالوں کی جیل ہوجائے مگر کم از کم اس غنڈے سے تو نجات مل جائے گی ناں؟'' ندا نے اپنی طرف سے مشورہ دیا۔

''پاگل ہو تم ندا...... ہمیشہ کی طرح پاگلوں والی باتیں کرو گی مجھے پتہ تھا'' سیم نے جھنجلا کر ندا کو جھڑک دیا تھا اور تھوڑی دیر خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد وہ پھر بولا تھا۔

''دیکھو تم میرے ساتھ چلو' کیونکہ تمہارے ہونے سے دروازے جلدی کھل جاتے ہیں' تم کسی بھی یونیورسٹی کے کسی اخبار یا تھیس یا کسی سروے کا بہانہ بنا کر بس اندر داخل ہوجانا پھر باقی کام میرا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح گاڑی ہتھیانے کی کوشش کروں گا اور یقیناً تم سے بعد میں پولیس باز پرس کرے گی تو تم آرام سے کہہ دینا کہ میں تمہیں گن پوائنٹ پر گھر میں داخل ہونے کے لیے آمادہ کرکے لایا تھا...... کیا سمجھیں...... تم بھی بچ جاؤ گی اور میں تو گاڑی کمینے غنڈے کو پہنچا کر اس شہر سے بھاگ ہی لوں گا...... ٹھیک ہے؟''

ندا کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ حامی بھرے یا انکار کردے کیونکہ اب تک سیم نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اسے اس طرح مایوس نہیں چھوڑ سکتی تھی اور اتنا تو ندا کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اگر واقعی سیم گاڑی نہ دے سکا تو غندہ اسے قتل کرکے ہی دم لے گا اس ملک میں ان جیسے غنڈوں کے ہاتھوں کئی مارے جاچکے ہیں اور آج تک کسی کے بارے میں پولیس کچھ نہیں کرسکی پھر سیم کا ہے ہی کون جو پولیس والوں پر قاتل کو پکڑنے پر زور دے......

ندا کو سیم سے محبت نہ سہی مگر اس کی دوستی کی پرواہ ضرور تھی۔ آج تک اس بھری دنیا میں ایک سیم نے ہی تو اسے اپنی دوستی اور ساتھ کے قابل سمجھا تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی سیم کے ساتھ ہولی تھی جس میں ایک طرف ندا کا بھی مقصد تھا اسے پاپا کی بہت یاد رہی تھی۔ جب سے اس نے حرا کی موت کی خبر مووی میں دیکھی تھی اسے پاپا پر بڑا ہی ترس آنے لگا تھا۔

بھائی بھی پڑھنے کے لیے اعلیٰ ترین یونیورسٹی آکسفورڈ چلا گیا تھا اور مہینوں میں ہی چکر لگاتا تھا۔ ایسے میں پاپا کتنا اکیلا محسوس کرتے ہوں گے۔ ندا اپنی ہی طرف سے اس خاندان کی حالیہ صورت حال پر سوچتی رہی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح پاپا سے جاکر لپٹ جاتی۔ حرا کی طرح ان کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ جاتی اور ڈھیروں فضول باتیں کرتی اور پاپا اسی طرح اس کی باتوں سے لطف لیتے مسکراتے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہتے جیسے وہ حرا کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے...... وہ دونوں تیز تیز قدموں سے اسی گھر کی طرف جارہے تھے جہاں سے ندا اور سیم دونوں کو اپنی اپنی طلب کے مطابق خزانے ہاتھ لگے تھے۔

سیم نے ندا کو صرف اتنا ہی سمجھایا تھا کہ وہ کسی یونیورسٹی کی طالبہ بن کر اپنے کسی کیس سروے کے لیے صاحب کا انٹرویو لینے کا کہے...... بس کسی طرح دروازہ کھل جائے بس پھر سارا کام سیم کا تھا وہ تو یہی سمجھے تھے کہ گھر میں اتنی بڑی واردات ہونے کے بعد اب کسی کے بھی دروازے کی گھنٹی بجانے پر کئی طرح کے انٹر کام پر سوال جواب کیے جائیں گے مگر اس کے برعکس ابھی ندا نے بیل بجائی ہی تھی کہ جھٹ آٹو میٹک

آہنی مین گیٹ اُن دونوں کے لیے کھل گیا تھا۔ مین گیٹ کے بعد وسیع وعریض گول صورت میں پورچ تھا جس کے بیچ میں ایک فوارہ لگا ہوا تھا جو اپنی آب وتاب سے چمکدار پانی چھلکا رہا تھا۔

اس گھر میں ندا اور سیم نے پورے چار دن گزارے تھے مگر آج تک دونوں نے دیکھے جانے کے ڈر سے پورچ میں آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ لہٰذا وہ دونوں ہر چیز کو دلچسپی سے دیکھتے آگے بڑھ رہے تھے۔ پورچ سے گزر کر تین سیڑھیوں پر چڑھ کر وہ لکڑی کے دروازے تک آ گئے تھے اور یہاں بھی دونوں کو حیرت ہوئی کہ اُن کے سیڑھیاں چڑھتے ہی دروازہ کھل چکا تھا۔ جو کہ پاپا نے ہی کھولا تھا' ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جہاں ندا اور سیم اس طرح بغیر سوال جواب کے اندر بلائے جانے پر حیران تھے دوسری طرف پاپا بھی حواس باختہ نظر آ رہے تھے۔

''آؤ...... آؤ بچوں...... اندر آجاؤ......'' پاپا نے ہمیشہ کی طرح شفقت اور محبت سے ان دونوں کو اندر بلا لیا تھا' سیم کے لیے موقع مناسب تھا مگر پھر بھی وہ پہلے تمام طرح سے اطمینان کر لینا چاہتا تھا...... دونوں پاپا کے پیچھے چلتے ڈرائنگ روم میں آ چکے تھے جہاں پر اب سیم کے پھیلائے ہوئے کھانے پینے کے بیکار ڈبے اور قالین پر گرائی گئی کافی کے داغ دھبے صاف کر کے اسے پھر سے شاندار کر دیا گیا تھا۔

پھر بھی جو چیزیں سیم ڈرائنگ روم سے لے جا کر بیچ چکا تھا ان تمام کی جگہیں خالی تھیں...... پاپا نے محبت اور شفقت کے ہی لہجے میں ان دونوں سے کچھ کھانے کچھ پینے کے بارے میں پوچھا تھا اور منع کرنے پر بھی وہ جلدی سے بولے۔

''ارے ایسے کیسے...... ندا تو اسکول سے ابھی ہی آئی ہے' اور تم سیم تم بھی تو بھاگتے دوڑتے ہی رہتے ہو یقیناً تم دونوں کو بھوک لگ رہی ہوگی دیکھو تو ندا کا چہرہ کیسا مرجھایا سا لگ رہا ہے میں لاتا ہوں کھانے کے لیے کچھ......''

پاپا یہ کہتے ڈرائنگ روم سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ سیم نے جھپٹ کر ان کو کندھے سے پکڑ کر واپس صوفے پر دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ جبکہ ندا ڈر کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''اولڈ مین' زیادہ چالاکی نہیں' یہ بتاؤ ہمارے بارے میں تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' سیم نے اب اپنی جیب سے اسی گھر سے حاصل کی گئی پستول نکال کر پاپا پر تانتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ندا پستول دیکھ کر ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اور ہذیانی ہو کر سیم کی منت کرنے لگی۔

''نہیں سیم' ایسا نہیں کرنا' نہیں سیم' پلیز...... پاپا کو نہیں مارنا' پھر بھائی تو بالکل ہی اکیلا رہ جائے گا' نہیں سیم ایسا ظلم نہ کرنا۔'' جہاں سیم کی بدتمیزی پر پاپا ہونٹ بھینچے اسے سنجیدہ نظروں سے تک رہے تھے اب ندا کی التجا سن کر مسکرانے لگے تھے۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا' فضول انسان' ہو ہی پاگل تم' وہاں جا کر چپ کر کے بیٹھ جاؤ' چلو ورنہ واقعی مار دوں گا بڈھے کو......'' سیم نے ندا سے پیچھا چھڑانے کے لیے دھمکی دی جس پر ندا نے فوراً عمل کیا اور ننھی بچی کی طرح گھٹنوں میں سر دیے پاپا کے برابر والے صوفے پر چڑھ بیٹھی۔ ہاں اولڈ مین میرے پاس وقت نہیں ہے...... کہاں سے پتہ لگا تمہیں ہمارے بارے میں بولو؟''

''آخر کو تم دونوں بچے ہی ہو کیا اتنا بھی نہیں معلوم تم دونوں کو کہ اس ملک میں ایسے بڑے گھروں میں ہر کمرے اور ہر جگہ سی سی ٹی وی

نئی کار

ڈاکٹر نے مریض سے کہا۔ ''تمہارا مرض اتنی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے کہ آپریشن کے بغیر تم ہرگز صحت یاب نہیں ہو سکتے۔''

''آپریشن پر کیا خرچ آئے گا؟''

''دس، پندرہ ہزار ڈالر!''

مریض نے کہا۔ ''پندرہ ہزار ڈالر لیکن میرے پاس اتنی کثیر رقم کہاں ہے؟''

ڈاکٹر بولا۔ ''دیکھو تم میری اس ترکیب پر عمل کرو۔ آٹھ ہزار ڈالر مجھے ابھی دے دو اور باقی سات ہزار ڈالر مجھے اس وقت تک دیتے رہنا جب تک تم صحت یاب نہ ہو جاؤ لیکن یاد رکھو ہر ماہ باقاعدگی سے ادائیگی کرتے رہنا۔''

مریض نے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص نئی کار خریدنے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے آج ہی نئی کار خریدنے کا منصوبہ بنایا ہے۔''

مرسلہ: بسمہ نعمان۔ کراچی

کیمرے لگے ہوئے ہوتے ہیں، تب ہی تو ہم اطمینان سے اپنے ملازموں کو گھر میں ہماری غیر موجودگی میں بھی آنے دیتے ہیں۔''

پاپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ پھر انہوں نے سکون سے ندا کی طرف ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ندا اور سیم ان کی بات سن کر ایک دوسرے کو سراسیمگی سے دیکھ رہے تھے...... تو کیا ان تمام دنوں میں ان دونوں نے جو کچھ بھی کھایا پیا استعمال کیا بیچا یہاں تک کہ جو باتیں آپس میں کیں وہ سب کچھ ریکارڈ ہوتا رہا تھا، سیم کا پستول والا ہاتھ کانپ رہا تھا اور ندا بالکل گم صم پاپا کو تکے جا رہی تھی، پاپا پھر گویا ہوئے۔

''میں ان چار دنوں کی تم دونوں کی تمام باتوں اور حرکتوں کو دیکھ سن چکا ہوں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ کس دریا دلی سے سیم گھر کی تمام مہنگی چیزیں ایک ایک کر کے بلیک مارکیٹ میں بیچ آیا، اور ندا کو بھی اس کے اس کام میں مدد دینے کے لیے اکساتا رہا...... میں نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح یہ معصوم ندا نے مجھ سے میرے بچوں سے انسیت محسوس کی، نماز پڑھنا سیکھی، حرا کے انتقال پر کیسے بلک بلک کر پورا دن روتی رہی اور کس طرح اس نے میری حرا کی مووی دیکھ کر گھر میں چل پھر کر حرا اور مجھے محسوس کیا، سیم کو انگوٹھی بیچنے سے روکا، میں نے سب دیکھا بچوں سب سنا......'' پاپا بولتے بولتے روہانسے ہو گئے تھے۔ وہ اب مسلسل ندا کے سر پر ہاتھ پھیرتے چلے جا رہے تھے۔

''اور تم نے یہ سب کچھ پولیس کے حوالے کر دیا کیوں؟'' سیم کو جیسے ہوش آیا۔

''نہیں بچوں...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا...... اور میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے سارے ثبوت پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیے...... میں نے تم دونوں کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی پولیس پر یہ راز کیوں نہیں کھولے، میں چاہ کر بھی یہ نہ کر سکا، پولیس کتنی ہی بار مجھ سے سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ کا پوچھ چکی مگر میں نے اُن سے ہمیشہ جھوٹ بول دیا کہ کیمرے ناکارہ کر دیے گئے تھے۔ لہٰذا کچھ بھی ریکارڈ نہ کر سکے، میں نہیں جانتا میں تم دونوں کو...... ندا کو کیوں بچانا چاہتا ہوں۔'' پاپا اچانک غمزدہ سے ہو کر جھک گئے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا...... اس لیے کہ تم جانتے تھے کہ میں گاڑی لینے آؤں گا تمہیں معلوم تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح گاڑی حاصل کرنے کے لیے یہاں آنا ہی پڑے گا اور اسی لیے تم انتظار کررہے تھے کہ ہم دونوں ایک بار پھنس جائیں تو تم پولیس کو پیش کرو' کیوں؟' بولو تم پولیس کو ہمارے آتے ہی کال کر چکے ہوں نا...... وہ آتے ہی ہوں گے کیوں؟'' سیم نے دانت پیستے ہوئے پاپا کو لتاڑا اور اب وہ ایک بار پھر مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پستول تھام کر پاپا پر تان چکا تھا۔

''نہیں بیٹا یقین کرو...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے...... مین...... میں تو...... آہ......'' پاپا کی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی سیم اُن کے سر پر پستول کے ہتھے سے ضرب لگا چکا تھا۔ جس سے پاپا کراہ کر صوفے پر بیٹھے بیٹھے نڈھال سے ایک طرف لڑھک گئے۔

''کیا کررہے ہو سیم...... مت کرو جب وہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا تو نہیں کیا انہوں نے' پہلے تم ان کا سامان بیچ آئے اب تم ان کو اس طرح تکلیف دے رہے ہو...... مت کرو ایسا...... سیم معاف کردو ان معصوم لوگوں کو......'' اب کی بار ندا نے بلبلا کر سیم سے پاپا کو بچانے کی خاطر کھڑے ہو کے اُن کو بانہوں میں بھرتے ہوئے جواب دیا' وہ پاپا اور سیم کے درمیان میں دیوار سی حائل ہوگئی تھی۔

''ندا تم ہٹ جاؤ سامنے سے...... یہ بڈھا ہمارے بارے میں سب جان چکا ہے...... اس بڈھے نے سب کچھ پولیس کو بتا دیا ہے...... تم اب تک کن ہواؤں میں رہتی ہو پاگل لڑکی...... ہم جیسوں پر کسی کو رحم نہیں آتا...... یہ ہم سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے' پاگل ہٹو سامنے سے...... مجھے اس سے اگلوانے دو ابھی سب صاف صاف بتا دے گا۔'' سیم نے ایک ہاتھ میں پستول اسی طرح تانے رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ندا کو اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے غصے سے کہا مگر ندا کسی طرح بھی اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔

اچانک پاپا نے اپنے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا...... وہ ندا کو سامنے سے ہٹا کر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے سیم سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھو بیٹا...... یہ پستول اندر رکھ لو...... یہ بہت گھناؤنی چیز ہے بیٹا...... یہ صرف نقصان پہنچاتی ہے...... تم جو پوچھو گے میں......'' پاپا سیم کو بہت ہی نرمی سے سمجھاتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ سیم ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا اس کا پستول والا ہاتھ بری طرح لرزا تھا اور پھر تینوں نے پستول چلنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد مووی ختم ہوگئی تھی اور مووی کے ختم ہونے پر ندا کی آنکھ کھل گئی تھی ہر سو سفیدی سی طاری تھی۔

صاف ستھری نکھری نکھری...... تو کیا واقعی وہ مرگئی ہے...... اس نے ہمت کر کے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کے نیچے ہی بستر پر ایک فائل رکھی تھی جس پر وہ سائن کررہی تھی۔ اب اس کو واضح طور پر اپنے ارد گرد کا احساس ہو چلا تھا وہ مری نہیں اسپتال میں تھی اس کے دائیں طرف ایک پولیس مین جیبوں میں ڈالے اسے آنکھ جھپکائے بغیر تک رہا تھا۔

جبکہ بائیں ہاتھ کی طرف جہاں وہ کانپتے ہاتھ سے فائل پر دستخط کررہی تھی فوسٹر ہاؤس کی مالکن مسز شاہ کھڑی تھیں اور مسز شاہ مسکرا رہی تھیں۔ وہ کسی سے ہاتھ ملاتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

پاپا اب مسز شاہ پاپا سے ہاتھ ملا کر ندا کے ہاتھ کے نیچے سے دستخط شدہ فائل لے چکی تھیں۔ اور اب وہ پاپا سے باتیں کر رہی تھیں۔ مگر ندا کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا اس کا دھیان تو کسی اور ہی طرف تھا ندا کو ابھی صرف دو ہی دکھ ستا رہے تھے۔

پہلا یہ کہ وہ مری نہیں زندہ تھی اور دوسرا یہ کہ شاید سیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پاپا نے تمام معلومات لے کر ہی اُسے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ اس کو ایک بار پھر اپنا دل رُکتا ہوا محسوس ہوا تھا...... اب کی بار اور شاید زندگی میں پہلی بار اس نے خدا سے گڑگڑا کر دل کھول کر باتیں کی تھیں۔

''میں جانتی ہوں کے تو میرا ہے' میرے مالک اور تو میرا ہے تو مجھے کسی اور کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر یہ ماں اور باپ جیسے رشتے بھی تو تیری ہی دین ہیں' تیری محبت اور عنایت کا مظہر' میں تجھ سے بھلا کیسے مانگوں جبکہ میں اپنے حصے کے ماں باپ پہلے ہی گنوا چکی ہوں' پھر بھی میرے دل کا حال تجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

اس سے پہلے تو ندا کو کبھی اس طرح کا شوق نہیں ہوا تھا' وہ کب سے اکیلی زندگی گزار رہی تھی اس نے ماں یا باپ کی کمی کو محسوس تو کئی بار کیا تھا مگر آج تک اس کے دل میں کبھی نئے ماں باپ حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا تھا مگر پھر......

سیم اسے اُس گھر میں لے آیا تھا۔ جہاں اس نے باپ کی شفقت اور بھائی بہن کی محبت کو محسوس کیا تھا اور اس کا دل جو اتنے سالوں سے خود پر جبر کیے بیٹھا تھا بری طرح مچل گیا تھا۔ اس نے اچانک پاپا کو کہتے سنا تھا۔

''وہ مسز شاہ کو سیم کے ندا پر غلطی سے گولی چلانے کے بعد بھاگنے کا بتا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیم بلا وجہ ڈر گیا تھا حالانکہ ان کا ارادہ کبھی بھی ان دونوں کے اوپر کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی کرنے کا نہیں تھا۔ پھر وہ بھاگم بھاگ گیراج میں کھڑی مطلوبہ اسپورٹس کار لے اڑا تھا۔

اس وقت ان کے دماغ میں بھی صرف ندا کو بچانے کا خیال تھا لہٰذا انہوں نے سیم پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مسز شاہ نے پاپا کے ندا کو باقاعدہ اڈاپٹ یعنی گود لینے پر شکریہ ادا کیا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ اتنے بڑے بچوں کو کم ہی لوگ گود لیتے ہیں کیونکہ ایسے بچے اکیلے رہ رہ کر عادتوں میں پکے اور باتوں میں کافی بے باک ہو جاتے ہیں۔ جس پر پاپا نے ہنس کر یہی کہا تھا کہ وہ ندا کو اُن سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مسز شاہ چند ایک بات کر کے کمرے سے نکل گئی تھیں اور ان کے پیچھے ہی پولیس مین بھی کمرے سے نکل گیا تھا۔ ان کے نکلتے ہی پاپا نے ندا کو آنکھیں کھولے دیکھ کر اس کو محبت سے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے اور ندا کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے اور پاپا اس کی پیشانی پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''نہ رو میری بچی' ہیرا...... بیٹا ندا...... خداوند نے مجھے نئی ہیرا دے دی ہے۔ اب میں تمہارا پہلے سے زیادہ خیال رکھوں گا۔ اف میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا' کے مجھے ہیرا پھر سے مل جائے گی۔ میں تو اپنے حصے کی بیٹی گنوا چکا تھا' کھو چکا تھا' مگر مجھے خداوند نے پھر سے بیٹی عنایت کر دی ہے' میری ندا دے دی ہے' نہ رو میرا بچہ' آؤ میرا بچہ' ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔

□□......❁......□□

افسانہ

شگفتہ سہیل

یوں بدلی رُت کہ

ضروری نہیں کہ زندگی میں ہر فیصلہ درست کیا جائے مگر
غلط فیصلوں کو درست کرنے کی ہمت ضرور ہونی چاہیے......

زندگی کے مسائل تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے شادی کے نام پر ایک عذاب تھا جو وہ جھیل رہی تھی شادی کیا تھی سچ پوچھو تو خانہ بربادی تھی جس نے اس کی زندگی کے چاند کو گرہن لگا چھوڑا تھا۔ سعید سے شادی کر کے وہ ایک بند گلی میں آ کھڑی ہوئی تھی جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

شمائلہ تین شریف اور خوبرو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی مگر ابا کی انتہائی سادہ اور غیر محتاط سوچ نے ان سب کی زندگیوں سے خوبصورتی چھین لی تھی۔ پڑھے لکھے بیٹے جب شادی کے لائق ہوئے تو رشتے داروں کی محبت میں ابا کے خون نے وہ جوش مارا کہ اپنے چچازاد بھائی کی دونوں بیٹیاں جو کسی طور اس کے بھائیوں کے قابل نہ تھیں دو بڑے بیٹوں کے لیے بیاہ لائے اور اس کی اماں صابرہ بیگم اپنے نام کے عین اسمِ بامسمیٰ مجازی خدا کے سامنے بس سجدہ کرنے کی دیر۔ کچھ بول ہی نہ سکیں دراصل ابا نے ابتدائی دنوں میں ہی اپنی غضیلی طبیعت کے ذریعے چاروں خانوں ایسا چت کیا کہ شریف سیدھی سادی سی خاتون اپنی زبان پر قفل مسلسل ہی لگا بیٹھیں اور ساری حسرتیں دل میں دبائے شوہر کی تابعداری کا میڈل پیشانی پر سجائے قفسِ عنصری سے ہی پرواز کر گئیں۔

تیسرے بیٹے نے اپنی عمر سے تقریباً نو سال بڑی خاتون سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور شادی کر کے گویا ماں کی کمی پوری کر لی۔ گھر میں بھابیوں کا راج ہو چلا تھا اور بھائی بیچارے ہمہ وقت بچوں کی خاطر ماؤں سے نباہ پہ کمربستہ دکھائی دیتے۔ بھابیاں آئے دن بظاہر طور ہمدردی میں دِن ماں کی اکلوتی نند کے لیے ایک سے ایک جی بھر کے غیر مناسب رشتے لاتیں اور ابا کے سامنے سرخرو ہونے کا ڈھونگ رچانے کی تگ ودو میں مصروف رہتیں۔ بالآخر بڑی بھابی ہی راہ چلتے کسی پرانی جان پہچان کے توسط سے سعید کا رشتہ لے آئیں اور ابا کے بارے میں اس کی شرافت کے بارے میں وہ قصیدہ گوئی کی اور زمین وآسمان کے وہ قلابے ملائے کہ بھتیجی کے آگے

ابا قائل ہوئے بنا نہ رہ سکے۔شمائلہ ایک تعلیم یافتہ ‘خوش شکل‘سلجھی ہوئی اور باصلاحیت لڑکی تھی۔شمائلہ نے جھجکتے ہوئے جب سعید کی انتہائی معمولی تعلیم کی طرف توجہ دلانے کا نوٹس پیش کیا تو ابا کا جواب کچھ یوں موصول ہوا۔’’بیٹا تمہارے سر سے ماں کا سایہ اٹھ چکا ہے بن ماں کی بچی کو میں زیادہ گھر میں نہیں بٹھا سکتا اور مرد میں شرافت نہ ہو تو اس کی تعلیم کس کام کی‘ نہ پان کا شوقین ہے نہ سگریٹ کا (واہ! ابا کے نزدیک شرافت کا معیار اتنا ہی تھا) اور پھر میں نے تم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔تعلیم یافتہ لوگ کبھی پریشان نہیں ہوتے (گویا تعلیم دلوا کر وہ ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے تھے) بے فکر رہو ہمارے گھر کے سب کام اچھے ہی ہوئے ہیں اب بھی اللہ بہتر کرے گا‘‘ جانے گھر میں وہ اچھے کام کون سے ہوئے جن کا علم شمائلہ کو نہ ہو سکا۔ بہرحال وہ یہ مژدۂ جاں فزا سناتے ہوئے ساری ذمہ داری اوپر والے پر ڈال کر پُرسکون ہو گئے‘اس بات سے قطع نظر کہ اوپر والے نے ہی عقل وتدبیر جیسی صلاحیت بھیجے میں بھیج کر بھیجا ہے دنیا میں‘ جس کا استعمال کر کے اچھے اور بُرے میں تمیز صحیح اور غلط کی پہچان اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مناسب فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔لیکن ابا اس بات سے بالکل نابلد ہوتے ہوئے جلد ہی اپنا اتنا بیش قیمت ہیرہ سعید کی جھولی میں ڈال بیٹھے۔

’شمائلہ چھوٹی آپا اور بڑی آپا دونوں میری ماں کی جگہ ہیں ان کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے تم بھی ان کی مرضی کو اپنانے کی عادت ڈال لو وہ خوش ہیں تو سمجھو میں خوش ہوں اور والدین کے بعد میرا گھر ہی ان کا میکہ ہے لہٰذا میرا دل جیتنے کے لیے تمہیں ان دونوں کا دل جیتنا ہوگا۔‘‘اس خوبصورت مہکتی ہوئی دلفریب رات میں جو زندگی میں صرف ایک بار وقوع پذیر ہوتی ہے۔لڑکی اپنے جیون ساتھی کی زبان سے محبت کا یقین اور وفاداری کی قسموں سے بھرپور نقطوں کے آبشار کی گنگناہٹ اپنی سماعتوں میں اترتا محسوس کرنا چاہتی ہے جبکہ سعید کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایٹم بم کی صورت میں شمائلہ کے آس پاس پھٹتے



ہوئے محسوس ہورہے تھے وہ تو کوئی ہی راگ الاپ رہا تھا۔اورشمائلہ سوچتی رہی کہ ''دل تو اس کا جیتنے کی خواہش ہوتی ہے جو ہمارا دل پہلے ہی جیت چکا ہو اس کا دل جیتنے کی کیا جدوجہد کی جائے جو پہلے ہی اپنا دل گروی رکھوا چکا ہو۔میں نے تو اپنی تمام تر ایمانداری سے دل کا دروازہ وا کرکے تمہیں اندر آنے کا حق دیا تھا مگر تم نے میرے دل کی جانب آنے والے راستے پر چلنے کی بجائے کسی اور ہی منزل کی طرف سفر کرنے کا اعلان کر دیا۔''

شادی کی تقریب ختم ہونے کے دوسرے دن ہی چھوٹی آپا اور بڑی آپا نے نئی نویلی بھاوج کو گھر کی ذمہ داری کا بھرپور درس از بر کرایا اور اپنے میکے کے وجود کی خوب اہمیت اجاگر کی اور پلنگوں پر بیٹھ کر مہمانوں کا روپ دھارلیا۔شمائلہ نے ایک سمجھدار لڑکی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے سنبھال لیں بہر حال یہ اس کا اپنا گھر تھا۔خدا خدا کرکے پندرہ دنوں بعد دونوں بہنیں شوہروں کے ازحد اصرار پر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئیں جبکہ جاتے جاتے سعید نے جلد آنے کا وعدہ بھی لیا۔

بہت جلد شمائلہ یہ حقیقت عملی شکل اختیار کر گئی تھی کہ سعید ادنیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کے سبب شعور کی منازل طے نہ کرپایا تھا اور انتہائی بدعقل اور چھوٹی سوچ کا مالک تھا دونوں کی ذہنی یگانگت میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر وہ تقدیر کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے سرگرم عمل ہوگئی۔سعید معمولی تعلیم کی بنیاد پر ایک چھوٹی سی نوکری پر فائز تھا۔حد درجے دولت کی تو شمائلہ نے بھی خواہش نہ کی تھی ،مگر سکون اور عزت کی زندگی گزارنا چاہتی تھی جسے وہ ڈیزرو بھی کرتی۔سعید کی قلیل آمدنی کے ساتھ وہ اپنی سلیقہ شعاری کی بدولت گزارا کرتی رہی، مگر مسائل نے سر ابھارنا شروع کیا جب وہ دو بچوں کی ماں بن گئی اور ہر وقت گھر داری، مہمان داری، بچوں کی ضروریات اور اسکول کی فیسیں، بلوں کی ادائیگی اور زندگی دوسرے سو بکھیڑوں میں الجھی دوا اور دو چار میں غلطاں و پیچاں رہنے لگی۔وہ سعید کو اکثر دوسری ملازمت کی صلاح دیتی جبکہ اس نے اپنی سستی اور کاہلی کی بنا پر ترقی کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔والدین کے گھر خواب وخیالوں میں ہمہ وقت خوش رہنے والی لڑکی کو جب انتہائی تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی شخصیت کملا کے رہ گئی، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ سعید کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔شمائلہ نے ٹھان لی کہ آج اسے سمجھائے گی اُسے اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلائے گی۔

''سعید!'' (ہونہہ' اس نے ہنکارا ابھرا۔کم از کم نام ہی افسانوی سا ہوتا آنکھیں بند کرکے پکارتی اور چند سیکنڈ کے لیے خوش ہو لیتی)

''بولو!'' وہ ہنوز ٹی وی پر نظریں جمائے شاہانہ انداز میں بولا۔اس کا یہی معمول تھا شام کے وقت وہ اپنی ڈیوٹی سے واپس آتا تو ٹانگیں پھیلا کر ٹی وی کے سامنے یوں بیٹھتا جیسے وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سے اٹھ کر سارے ملکی معاملات سدھار آیا ہو۔

''تمہیں گھر کے حالات کا کچھ اندازہ ہے کچھ سوچا ہے آگے کے بارے میں'' وہ کلس ہی تو گئی۔

''گھر کیا ہوا' اچھا بھلا چل تو رہا ہے''۔''اس کی عقل پر پڑا پردہ کیسے چاک کروں۔

''چل نہیں رہا بلکہ دوڑ رہا ہے مگر پیچھے کی جانب۔ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں سعید ان کی ضروریات اور تعلیمی اخراجات کیسے پورے ہوں گے' آخر تم کوئی بہتر ملازمت تلاش کیوں نہیں کرتے' کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے' کچھ تو سوچو۔''

''کرتو رہا ہوں ملازمت' خالی تو نہیں بیٹھا مجھ سے جتنا ہوگا اتنا ہی تو کروں گا ناں میرے پاس جادو کی چھڑی تو نہیں ہے کوئی تم تو ہو ہی ناشکری عورت ......اب کیا بھیک منگواؤ گی مجھ سے' اس کی مووی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

''بھیک مانگنی ہوتی تو تمہیں زحمت نہ دیتی۔ لوگ کیا نہیں کرتے بچوں کی خاطر' محنت مشقت کرتے ہیں' چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک تم ہو' آدھا دن اپنا شوق پورا کرنے میں گزار دیتے ہو۔ یہ وقت کچھ کمانے کی جدوجہد میں گزارا جا سکتا ہے۔ بچوں کو اچھی تعلیم کیسے دلوائیں گے انہیں کسی قابل بنانا ہے۔ آخر تم کیوں نہیں سمجھتے سعید'' وہ بے حد فکر مند تھی۔

''دیکھو جو کام مجھے آتا ہے وہی کروں گا ناں اور تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں کسی قابل نہیں ہوں طنز کر رہی ہو مجھ پر اپنی تعلیم کا زیادہ رعب مت جھاڑو مجھ پہ'' وہ تنک کر بولا۔

''تم پر طنز کرنے کا کیا فائدہ ہوگا مجھ پہ' بچوں کی ضروریات اور جائز خواہشات کو پوری کرنا اچھی تعلیم و تربیت دینا والدین کا فرض ہے ورنہ وہ دنیا میں پیچھے رہ جائیں گے'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''ضروری ہے کیا دنیا میں سب لوگ ایک جیسے ہوں میں اتنا کر سکتا ہوں۔ اس ملک میں غریب لوگوں کے کروڑوں بچے تعلیم سے محروم ہی ہیں لیکن زندہ ہی ہیں ناں'' مجال ہے جو وہ دانشمندی کی بات سننے کو تیار ہو۔

''غریب باپ کے بچے نہیں ناقص العقل باپ کے بچے۔ اور زندہ رہنے میں......اور باعزت زندگی جینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ زندہ تو جانور بھی رہتے ہیں مگر عقل و فہم اور شعور و آگہی کے بغیر گزارتے ہیں۔ خدا نے انسان کو ان خصوصیات سے نواز رکھا ہے جس کے ذریعے وہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے کوشاں رہ سکتا'' شمائلہ کے لہجے میں متانت تھی۔

''اُف تمہاری یہ مشکل زبان میری سمجھ میں نہیں آتی کیا اول فول بول رہی ہو۔ اب جاؤ یہاں سے' ساری مووی کا مزہ خراب کر دیا۔ کل بڑی آپا سے بات کروں گا وہی کچھ کریں گی'' وہ سر پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دو دن بعد اس نے کچھ رقم شمائلہ کے ہاتھ پہ لا رکھی تو اس نے حیرت سعید کو دیکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''پیسے ہیں بھئی' بڑی آپا نے دیئے ہیں تم بچوں کی فیس وغیرہ کے لیے پریشان تھیں ناں'' اپنے قدرے زردی مائل دانت نکوستا خوش تو یوں ہو رہا تھا جیسے اپنی محنت کی کمائی بڑی آپا کے پاس رکھ چھوڑی تھی۔

''ہاں' لیکن بڑی آپا سے تم نے کیوں لیے پیسے'' شمائلہ کو ہاتھ میں پکڑی رقم حقیر معلوم ہونے لگی۔

''تم ہی تو شور مچاتی رہتی ہو پیسوں کی ضرورت ہے کچھ کرو۔ اب کر رہا ہوں تو اس پر بھی اعتراض ہے۔ کسی حال میں خوش نہیں ہو تم تو یار'' اس نے بیڈ پر ٹانگیں پسارتے ہوئے کہا۔

''اُف سعید کیسے انسان ہو تم' میں نے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کو تو نہیں کہا تھا۔''

''تو کیا ہوا! وہ میری بہنیں ہیں اتنا پیسہ ہے ان کے پاس کچھ بھائی کے بچوں پر لگا دیں گی تو کوئی کمی تھوڑی ہو جائے گی'' وہ بے شرمی کی حد پھلانگ گیا۔

''تو کیا خدانخواستہ تم معذور ہو۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں صحت مند ہو' ایک کی بجائے دو نوکریاں بھی کر سکتے ہو اور محنت کش انسان کی نیت دیکھ کر اللہ

اس کا مددگار بن جاتا ہے'' شمائلہ کی عزت کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔

''کوشش کرتا ہوں یار تمہیں کیا پتہ اب اچھی نوکری نہیں ملتی تو کیا کروں۔ دیکھ لو ملک کے حالات کس قدر خراب ہیں''

''حالات صرف تمہارے لیے خراب ہیں کیا تمہارے ساتھ کے لوگ کوشش کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئے' میرا نہیں تو اپنی اولاد کا ہی کچھ خیال کرلو'' شمائلہ اس کی ڈھٹائی کے آگے خود کو بے بس تصور کرتی۔

''اولاد کے لیے تو سب کچھ کر رہا ہوں جبھی تو آپا سے پیسے لیے تمہیں کیا پتہ کتنی مشکل اٹھانی پڑی مجھے' تم تو جانتی ہو بھائی جان اکثر دوسری بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر گھومنے پھرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آپا اپنے گھر کے سارے کام مجھ ہی سے تو کرواتی ہیں' دو چار کام چھوٹی آپا بھی کہہ دیتی ہیں۔

''سعید تم کیوں نہیں سمجھتے کوئی اپنی غرض کے بغیر کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا' اگر کرتا ہے تو اپنے آگے کم تر محسوس کرتا ہے اس طرح تم اپنی عزت کبھی نہیں کرواسکو گے'' وہ رسان سے بولی۔

''کیسی بات کر رہی ہو شمائلہ' وہ میری بہنیں ہیں تم لوگ بھی ذرا ان کے آگے پیچھے رہا کرو' اکثر میری مالی مدد کر دیتی ہیں۔ میری شادی کا سارا انتظام بھی آپا ہی نے کیا تھا ورنہ میرا ہاتھ اتنا کہاں کھلا تھا کہ گھر بسا سکوں'' اس نے اپنے رفیقِ سفر ٹی وی ریموٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''یہ گھر تو نہ ہی بستا تو اچھا تھا۔ دراصل دونوں بہنوں نے سعید کی عزتِ نفس پر اپنی دولت کی وہ کاری ضرب ماری ہوئی تھی کہ وہ ان کے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہی کہاں رہا تھا ان کے آگے پیچھے گھوم کر انہیں یہ باور کرانے کی سعی میں مصروف رہتا کہ وہ اور اس کے بیوی بچے ان کے زر خرید غلام ہی تو ہیں اور بَری کے نام پر وہ ستّر کی دھائی کے فیشن زدہ وہ چار جوڑے جسے وہ شادی کا سارا انتظام گردان رہا تھا خوب بے وقوف بنا رکھا تھا بھائی' دونوں بہنوئی رشوت خوری کے مثالی محکموں میں ملازمت پیشہ تھے جہاں چور بازاری کا بازار گرم تھا لہٰذا بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو عار نہ سمجھا جاتا بیویاں دونوں ہاتھوں سے اپنی غرض کی خاطر حرام کا مال لٹا رہی تھیں' وہ ادراک کے مرحلے میں تھی۔

''اب کیا سوچنے لگیں بیگم' تمہارا میاں تھک کے گھر آیا ہے اب کھانا تو کھلادو'' اس نے ٹی وی کی آواز بڑھاتے ہوئے لمبی جمائی لی' شمائلہ کا دل چاہا کھانے کے بجائے ایک من زہر اس کے منہ میں بھر دے' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' قصہ ہی ٹمک جائے اس کا'

سعید کی بے ضمیری کے ہاتھوں بچوں کی خاطر شمائلہ نے انا اور خودداری کا گلا کیسے گھونٹا' یہ وہ جانتی تھی یا اس کا خدا...... اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ہمیشہ گھر کی ضروریات کے لیے تگ و دو میں مصروف پایا۔ ایسا نِکھٹو مرد تو اس کے خاندان میں دور دور تک نہ گزرا تھا۔ شمائلہ بہت کھینچ تان کے گزارا کر رہی تھی۔ سر ڈھکتی تو پیر کھل جاتے' پیر ڈھکتی تو سر...... اس کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ جب عید کے تہوار قریب آتے یا خاندان میں کسی تقریب کا انعقاد ہوتا۔ ملنے جلنے والوں کے یہاں تو اس نے جانا ہی چھوڑ رکھا تھا' کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی...... اب بھی ایسا ہی ہوا سعید کے انتہائی قریبی عزیزوں میں ہفتہ بھر بعد ہی شادی کا فنکشن تھا اور بیٹی نے شور مچایا ہوا تھا کہ پہنے گی تو نئے کپڑے ورنہ شریک نہیں ہوگی۔ آخر بچے ہی تو تھے دس

ضروریات تھیں تو چار خواہشات بھی شمائلہ ماں تھی اس کا دل تڑپتا۔

اس دن سعید معمول سے بھی کچھ پہلے گھر آ گیا تھا شمائلہ روزمرہ کے کام نمٹا کر کمرے میں آئی تو دیکھائی وی آن تھا سعید بیڈ پر دراز کوئی ایکشن مووی دیکھنے کے دوران ہی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگا خراٹوں کی صدائیں تھیں کہ چھت پھاڑ رہی تھیں اور چہرے پر بلا کا وہ اطمینان کہ جیسے آج ہی سات نسلوں کے لیے مشقت کر آیا ہو۔ اس کی بے حسی پر شمائلہ کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور تہہ شدہ کپڑے رکھنے کے لیے الماری کا ہینڈل زور سے کھولا جس کے شور سے سعید ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

''ارے یہ ٹی وی کیوں بند کر دیا میں دیکھ رہا تھا۔'' اس نے آس پاس ریموٹ ٹٹولا۔

''یہ ٹی وی جیسی خرافات کے لیے بجلی استعمال ہوتی ہے جس کا بل میں اپنا پیٹ کاٹ کر دیتی ہوں ورنہ جو چند نوٹ تم مہینے کی پہلی تاریخ کو میرے ہاتھ میں تھما کر دنیا جہان سے بے فکر ہو جاتے ہو ناں ان میں اتنی طاقت نہیں کہ یہ تمہارا شاہانہ شوق پورا کر سکیں'' آج وہ بے تحاشا ذہنی دباو کا شکار تھی۔

''ہاں تو اس کے علاوہ کوئی تفریح ہے میری۔

''ایک تو میری نیند خراب کر دی

''آخر اتنے کڑے وقت میں تمہیں نیند کیسے آ جاتی ہے۔'' وہ وہیں بیٹھ گئی۔

''اب کیا مصیبت آ گئی'' اس نے قریب پڑی چھوٹی سے تھیلی سے بھنے چنے کے چند دانے پھانکے۔

''مصیبت یہ ہے کہ تمہارے خالہ زاد کی شادی ہے سعید اور بچے نئے کپڑوں کی ضد کر رہے ہیں۔ کئی بار کے پہنے ہوئے کپڑے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے کہاں سے دلواؤں انہیں کپڑے'' وہ ازحد دکھی تھی۔

''ایسا کرو اپنے بھائیوں سے اُدھار لے لو پھر کچھ دنوں بعد واپس کر دینا'' واہ بے غیرتی تیرا ہی آسرا ہے' جن بھائیوں میں اسے سو سو کیڑے نظر آتے تھے ان ہی سے مانگنے کی بات کر رہا ہے۔

''کیا! پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے مانگنے کی عادت نہیں اور دوسرے یہ کہ کچھ دنوں بعد قارون کا خزانہ تو ہاتھ لگنے سے رہا' کہاں سے واپس کرو گے'' حیرت کی انتہا تھی۔

''تو نہیں کرنا واپس' بہن کی مدد کر دیں گے تو یا قیامت آ جائے گی''

''میں اب اُن کی نہیں' تمہاری ذمہ داری ہوں بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنا ہر مرد کا فرض ہے' تم کو ذرا سی شرم نہیں آتی' اور اگر مجھے اپنے باپ بھائیوں سے ہی لینا ہوتا تو یہ شادی کا ڈھونگ گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنے ہی گھر میں بہت خوش تھی'' وہ فرطِ جذبات سے کانپنے لگی۔

'تو چلی جاؤ ناں جہاں تمہیں سب کچھ ملے میرا سر مت کھاؤ' مگر یاد رکھو تمہاری بھاوجیں دو منٹ تم کو برداشت نہیں کریں گی۔ باہر نکال دیں گی تمہیں۔ پوچھتا کون ہے''...... وہ اکثر اس کا دل اس کے گھر والوں کے خلاف کر کے اسے تنہا ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔

''غلط فہمی کا شکار ہو تم 'میرے خاندان میں عورت کی عزت کی جاتی ہے اِسے یوں زندہ در گور نہیں کیا جاتا' میرے بھائی آج بھی مجھے عزت کی روٹی کھلا سکتے ہیں اور خدا کا شکر میں خود بھی اس قابل ہوں بوجھ نہیں کسی پر'' وہ اس پر تاسف بھری نگاہ ڈال کر باہر نکل گئی۔

اگلے دن بڑی آپا ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھیلے اٹھائے چلی آئیں۔

"السلام علیکم آپا! کیسی ہیں آپ؟ شمائلہ کو ان کے سامنے کندھے جھکتے محسوس ہو رہے تھے۔

"وعلیکم السلام، ٹھیک ہوں، سعید نہیں آیا اب تک؟"

"آتے ہی ہوں گے۔ آپ سنائیں مارکیٹ گئی تھیں کیا؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لہجہ نرم کرنا پڑا۔

"ہاں بھئی اپنے بھائی کے بچوں کے لیے کچھ کپڑے وغیرہ خریدے ہیں ایک سوٹ تمہارا بھی ہے۔ لو دیکھو۔" انہوں شاپنگ بیگز بھتیجی کے آگے بڑھائے۔

"دیکھو میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ اور خوب بالائی ڈالنا"۔

"ویسے ایک چینی کہاوت ہے آپا روز مچھلی کھلانے سے بہتر ہے کہ مچھلی کا شکار کرنا سکھا دیا جائے" شمائلہ سخت بیزار تھی۔

"ہیں! کیا مطلب" ان کے چہرے کا رنگ یوں بدلا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ سعید کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں کہ وہ کوئی اچھی نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ آخر کب تک ایسا چلتا رہے گا کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔"

"نوکری کر تو رہا ہے بے چارہ۔ اور کیا کرے تھک بھی جاتا ہے" انہوں نے صاف نظریں چرائیں۔

"آدھا دن تو ٹی وی کے آگے بیٹھ کر گزارتے ہیں یا پھر سوتے ہیں۔ بیوی بچوں کا کوئی احساس ہوتا تو اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارتے، اللہ دس راستے کھول دیتا ہے۔ معاف کیجیے گا آپا انتہائی سست الوجود ہے آپ کا بھائی۔ کب تک بہنوں سے مانگ کر گزارہ کریں گے" شمائلہ کا خون کھول رہا تھا ان کی کم ظرفی پر۔

"ارے بی بی تم بھی تو خاصی پڑھی لکھی ہو نوکری کیوں نہیں کر لیتیں۔ میرے جاننے والوں میں تو کئی عورتیں ایسی ہیں جو ملازمت کر کے اپنے میاں کا بازو بنی ہوئی ہیں۔ آج کل مہنگائی کتنی ہے ایک آدمی کے کام کرنے سے گزارا تھوڑی ہوتا ہے"

"ہاں تو آپا ایسے مرد کو شادی کرنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے کہ وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں، ورنہ خدا کے آگے کیا جواب دے گا۔ مرد تو عورت کے سر کا سائبان ہوتا ہے، مگر میں تو ایک عرصے سے کڑی دھوپ میں جل رہی ہوں"

شمائلہ جان چکی تھی کہ وہ دونوں بہنیں چاہتی ہی نہیں ہیں کہ انگلیوں پہ ناچنے والا غلام آزاد ہو جائے۔ آخر اپنے شوہروں پر تعویز گنڈے کروانے کے لیے انہیں اسی کی مدد تو درکار تھی۔ سعید چاہتا تو اپنے لیے ترقی کی راہیں کھول سکتا تھا مگر وہ ایک غلام ذہنیت کا ایک بے ضمیر مرد تھا۔

رات بیڈ پہ لیٹی جب وہ اپنے شادی سے پہلے بیتے دنوں کو یاد کر رہی تھی تو سعید نے اس کے اعصاب پر ایک اور زبردست وار کیا۔

"بیگم سو گئیں کیا" سعید کو جب اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا مقصود ہوتا تو بڑے رچاؤ سے بیگم کہہ کر مخاطب کرتا۔

"نہیں۔ میرے نصیب سو گئے" وہ مضمحل تھی۔

تم اتنی پریشان لگتی رہتی ہو ایک حل یہ ہے میرے پاس تمہاری پریشانی کا" سعید نے چہرے پر فکرمندی کا تاثر ابھارنے کی کوشش کی۔

"میری پریشانی، تو یہ سارے حالات تمہارے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہیں ٹھیک کہا تم نے، اگر

ہوتے تو تمہاری کوششیں تمہارا احسان مجھے نظر آتا کم از کم مجھے یہ فخر تو ہوتا کہ میرا شوہر بیوی بچوں کے نصیب میں اپنی پُر خلوص محنت کا حصہ ڈال رہا ہے۔

''تمہیں کیا پتہ میں کتنی کوشش کر رہا ہوں' اچھی نوکری ملتی ہی نہیں۔ بڑے بڑے لوگ اپنے کاروبار بند کر کے باہر جا رہے ہیں ملک کے حالات ہی اتنے خراب ہی ہیں۔ میرا خیال ہے تم تلاش کرو تمہیں اچھی ملازمت مل جائے گی گھر کی حالت بہتر ہوگی'' یقیناً بہنوں کی پڑھائی ہوئی پٹی بول رہا تھا۔

''اچھا! گھر اور بچے سب کیسے ہوگا؟'' بظاہر تو وہ مرد ہی نظر آتا ہے مگر جو شخص بیوی بچوں کی ذمہ داری سے نہ چرائے اس کی جنس پر شک ہونا لازمی ہے۔ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

''تم فکر نہ کرو بیگم ہمارے بچے بھی اب بڑے ہو رہے ہیں اللہ کرے گا کسی نہ کسی کام پر وہ بھی لگ جائیں گے تو تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شائلہ نے چونک کر اسے دیکھا کس قدر ڈھیٹ بے حس انسان تھا...... وہ اپنے بچوں کو تعلیم کی دولت دے کر پیروں پہ کھڑا دیکھنا چاہتی تھی جبکہ باپ اولاد کو تعلیم سے محروم کرنے کے لیے زمانے کی ٹھوکروں کے سپرد کر دینا چاہتا تھا...... باپ تو بچوں کی خاطر اپنا آپ بیچ دیتے ہیں۔ وہ نہ تو اچھا باپ ثابت ہوا تھا اور نہ ہی اچھا شوہر۔

گھر کے مالی حالات شدید زبوں حالی کا شکار تھے شائلہ کو اندازہ ہو چلا تھا کہ سعید کو مزید سمجھانا بے سود ہے اس کے برعکس بھینس کے آگے بین بجانے سے کچھ فائدے کا امکان ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے 'مرتی کیا نہ کرتی' کے مصداق ملازمت اختیار کر لی۔ شائلہ کو شروع ہی سے نوکری کا کوئی شوق نہ تھا وہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر اسے سجانا سنوارنا چاہتی تھی اپنے شریکِ حیات کی مضبوط پناہوں میں خود کو محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ مگر دونوں میں ذرّہ برابر بھی ذہنی مطابقت نہ تھی۔ نوکری کی بھرپور ذمہ داری نے شائلہ پر کئی گنا زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔ زندگی دھکا اسٹارٹ ہو ہی گئی تھی' لیکن جو برکت مرد خدا نے مرد کی حلال کمائی میں رکھی ہے' وہ عورت کی کمائی میں نہیں...... ابا نے تو ساری عقل و دانائی بالائے طاق رکھ کر اسے ایک بے جوڑ رشتے سے منسلک کر کے زندگی جہنم بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ بیٹی سے محبت کرتے اس کی حالتِ زار کا دُکھ بھی کرتے' مگر اب کیا فائدہ۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت...... ابا کی کمزور حکمتِ عملی اور جلد بازی کے باعث زندگی کی رعنائیوں کی جگہ اِک جہدِ مسلسل نے لے لی تھی۔ ابّا کو کون سمجھاتا کہ میری ماں مری تھی' میں تو زندہ تھی' میرا دل تو دھڑک رہا تھا' میرے خواب تو سانس لے رہے تھے۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا' وہ اکثر دل ہی دل میں مسوس کر رہ جاتی۔ سعید کی زندگی کا ہلی' غیر معیاری سوچ' سستی تفریحات اور اپنی آپاؤں کی یرغمالی میں بخوبی بسر ہو رہی تھی...... وقت دھیرے دھیرے کچھ سرکا تو مناسب رشتہ ملتے ہی شائلہ نے بیٹی کو یہ سوچ کر جلد ہی اس کے گھر کا کر دیا کہ کہیں وہ باپ کی بخشی ہوئی صعوبتوں کی چکی میں پستی ہی نہ رہ جائے اور ساتھ ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بیٹے کو بھی اچھی تعلیم دلوانے میں کامیاب ہو ہی گئی جو مختلف شہروں میں ٹریننگ کے سلسلے میں مصروفِ عمل رہتا۔ شائلہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی۔ چند ایک سال پہلے ابا بھی ابدی نیند جا سوئے تھے۔ بھائی اکثر و بیشتر خیریت دریافت کر لیتے آخر اس کے ماں جائی تھے

☆......☆

آج بھی شام تک کام کرنے کے بعد جب شائلہ نے رِسٹ واچ پر نظر ڈالی تو آفس ٹائمنگ ختم

ہونے کے قریب تھے مگر اس کا گھر جانے کو ذرا دل نہ چاہا وہاں اس کا منتظر تھا ہی کون' ایک خود غرض شوہر جو اپنی دنیا میں مگن تھا اور ضرورت پڑنے پر اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا' کافی دیر سے وہ یونہی کرسی سے ٹیک لگائے پین کا پچھلا سرا ہونٹوں میں دبائے اَدھ کھلے دروازے سے کوریڈور میں آتے جاتے لوگوں کو تک رہی تھی' آج اس کو اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اس کا دل چاہا وہیں بیٹھے بیٹھے عمر تمام ہو جائے۔لیکن یہ ممکن کہاں تھا اسے چار و ناچار اٹھنا پڑا شمائلہ نے اپنا ہینڈ فون بیگ میں ڈالا سامنے پڑی فائلز الماری میں منتقل کر کے باہر کا رُخ کیا وسیع و عریض ہال کراس کر کے گلاس ڈور کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے اسے پکارا۔

''شمائلہ'' وہ رکی تو ایک' شاندار شخصیت والا شخص ایک جھٹکے سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''شمائلہ یہ تم ہو ناں'' عین سامنے کھڑے انسان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں یا خوشی سے وہ سمجھ نہ پائی۔

''جی میں شمائلہ ہی ہوں' مگر آپ؟''

''ارے تم نے مجھے پہچانا نہیں میں ابتہاج ہوں۔ ہم نے یونیورسٹی کا دور ساتھ گزارا ہے بھئی'' وہ بہت ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔

''اوہ ابتہاج'' وہ آنکھوں میں شناسائی کی لہر لیے اسے تک رہی تھی۔

''ہاں بھئی میں' تم تو ایسے دیکھ رہی ہو جیسے کئی صدیاں بیت گئی ہوں'' وہ کیا جانے کہ ان چند ماہ و سال میں اس نے زندگی کے کتنے ادوار گزار دیئے۔

''تم ٹھیک ہو ناں اور یہاں کیسے؟ کیا کر رہی ہو آج کل؟'' ابتہاج نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''میں ٹھیک ہوں بالکل۔تم سناؤ کیسے ہو!'' وہ مسکرائی۔

''فائن' بیٹھ کے بات کریں۔

''ہاں ضرور'' وہ ہال میں پڑے صوفے کی جانب بڑھے۔

''اب بتاؤ کہاں تھیں۔یونیورسٹی کے بعد نظر ہی نہیں آئیں۔یہ تو دوستوں سے پتہ چلا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے''

''بس ٹھیک ہی ہے' تم تو باہر چلے گئے تھے ناں'' شمائلہ نے بیگ کندھے سے اتار کے سائیڈ پہ رکھا۔

''ہاں' ہائر اسٹڈیز کے لیے دو سال باہر رہا واپس آیا تو کافی کچھ بدل گیا تھا۔لیکن تم یہاں کیسے ''

''میں یہاں جاب کرتی ہوں'' شمائلہ نے مختصر جواب دیا۔

''جاب اور تم' لیکن تمہیں تو جاب میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا تم تو کافی خلاف تھیں جاب کرنے کے۔اب کیسے؟'' وہ حیران ہوا۔

''ضروری تو نہیں زندگی میں وہ سب ہو جو انسان چاہتا ہو''

''رئیلی زندگی میں اکثر وہ نہیں ہوتا یا ویسا نہیں ہوتا جو یا جیسے ہم چاہتے ہیں لیکن اوپر والے کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہو گی۔آئی بلیو' ابتہاج نے اوپر کی جانب نظر ڈالی۔

''اور یہاں کیسے؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا'' شمائلہ بولی۔

''اس فرم کے مالک عبید رضا سے کچھ عرصے پہلے ہی دوستی ہوئی۔اب کام کے سلسلے میں اکثر ملاقات رہتی ہے' باقی دوستوں سے بھی کہیں نہ کہیں

ملاقات رہتی ہے لیکن تم تو کبھی نظر ہی نہیں آئیں اور تمہارے ہزبینڈ کیسے ہیں؟ ملواؤ بھی'' اس نے لہجہ نارمل رکھنے کی سعی کی۔

''تم تو کافی بدل گئے ہو میں تو پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکی'' وہ بات بدل گئی۔

''کچھ زیادہ تو نہیں مگر تم بہت چینج ہوگئی ہو۔ یہ وہ شمائلہ تو نہیں جو یونیورسٹی میں فُل آف لائف ہوا کرتی تھی۔ خوش تو ہوناں زندگی سے'' جانے وہ کیا جاننا چاہتا تھا۔

''ابتہاج میں چلتی ہوں دیر ہو رہی ہے'' وہ نروس سی ہوتی اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ دوستوں سے رابطے میں رہنا چاہیے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے'' وہ لہجہ خوشگوار بناتے ہوئے بولا۔

''او کے اللہ حافظ'' شمائلہ نے مسکراتے ہوئے کارڈ تھاما۔ وہ کھڑا اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

☆......☆

شام کا اندھیرا چھانے کو تھا جب شمائلہ اپنے بیگ میں موجود چابی سے دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا ٹی وی چل رہا ہے اور سعید بیڈ پر دراز گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا اس کے سیدھی جانب کھانے کی پلیٹ دھری تھی شمائلہ نے چاروں طرف ایک یاسیت بھری نگاہ ڈالی آہستہ سے ٹی وی بند کر کے چھوٹی موٹی بکھری ہوئیں چیزیں سمیٹ کر رکھیں اور چائے کا کپ لے کر چھوٹے سے صحن میں گملوں کے پاس پڑی کرسی پہ آ بیٹھی...... کاش وہ ابا کے سامنے ڈٹ جاتی تو آج سعید کا طوق اس کے گلے میں نہ ڈالا گیا ہوتا مگر وہ توئموں کے باعث کچھ بول ہی نہ سکی جس کے نتیجے میں آج سزا بھگت رہی تھی۔ اس نے کچھ خواب سجائے تھے کہ ایک تعلیم یافتہ اچھی سوچ کا مالک عورت کا احترام اور حفاظت کرنے والا اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنے والا ایک انسان اس کا جیون ساتھی بنے۔ یہ سوچ آتے اس کی چشم تصور میں چھم سے ابتہاج کا وجود آ ٹھہرا۔

''خوش تو ہوناں زندگی سے'' یہ کیا پوچھ لیا تھا ابتہاج نے۔ اس بات کی فکر تو اس کے شریکِ حیات کو ہونی چاہیے تھی، وہ تو ہر بندھن سے آزاد تھا۔

☆......☆

سگریٹ کا سفید دھواں گہرے مرغولوں کی صورت آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا جس کے پیچھے ابتہاج اداس دل اور خالی آنکھیں لیے رات کے اس پہر جانے کس سوچ میں غرق تھا پچھلے چند گھنٹوں سے وہ اسی طرح لان میں بچھی کرسی پہ بیٹھا اپنے پُردرد ماضی کے تانے بانوں میں الجھا ہوا تھا اس کے تمام زخم شمائلہ کو دیکھ کر تازہ ہوگئے تھے۔ اس کو وہ وقت یاد تھا جب اتنی بڑی یونیورسٹی میں ایک شمائلہ اسے بھا گئی تھی حالانکہ وہ سال بھر جونیئر تھی مگر نوٹس کے لین دین اور مشترکہ تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے ملنا جلنا رہتا۔ وہ اس سادہ پُروقار شمائلہ پر فریفتہ تھا۔ یہ بات وہ خود سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا چہ جائیکہ اسے اپنا مقصد حاصل نہ ہوجائے۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا اور ذہین بیٹا۔ ہائر اسٹڈیز کے لیے دو سال کے لیے باہر جا رہا تھا۔ اس کا مصمم ارادہ تھا کہ واپس لوٹتے ہی سب سے پہلے ممی کو پنی پسند کے بارے میں بتائے گا اور شمائلہ کو عزت سے اپنی زندگی میں شامل کرلے گا...... کاش یہ بات اتنی ہی آسان ہوتی مگر جب لوٹا تو پتہ چلا کہ چند روز پہلے ہی شمائلہ کی شادی ہوچکی ہے۔ ایک دکھ کی لہر تھی

جس نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا تھا۔ بصد مشکل خود کو سنبھالا۔ یہاں رابعہ بیگم سحرش کو اس کے لیے پسند کیے بیٹھی تھیں' آتے ہی بیٹے کے سر سہرا سجانے کی خواہش ظاہر کر دی تو وہ ماں کی خواہش کے آگے سر جھکا گیا۔ اس کا دل تو کرچی کرچی ہو ہی گیا تھا مگر ماں کے اکلوتے بیٹے کے لیے کچھ ارمان تھے۔ سحرش اس کے لیے ایک اچھی شریکِ حیات ثابت نہ ہو سکی۔ وہ ایک بڑے باپ کی آزاد منش بیٹی تھی۔ بمشکل دو سال ہی ابتہاج کے ساتھ گزارا کر پائی اور اپنی دنیا میں واپس لوٹ گئی۔ سحرش کے ساتھ بیتا وقت ایک کربناک دور تھا اس دوران ابتہاج کے والد ہارٹ اٹیک کے باعث گزر گئے۔ شمائلہ کے نہ ملنے کا دکھ پھر سحرش کی بے راہ روی سے ابتہاج کی زندگی میں ایک سناٹے نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ رابعہ بیگم نے سر توڑ کوشش کی کہ ابتہاج دوبارہ اپنا گھر بسا لے۔ مگر اس کے دل کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ بیٹے کے غم نے انہیں بھی فالج کی مریضہ بنا کر بستر سے لگا دیا تھا...... مگر آج اچانک شمائلہ کو یوں سامنے پا کر اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

☆......☆

اِس گھٹن زدہ ماحول میں ابتہاج کی دوستی شمائلہ کے لیے تازہ ہوا کا خوشگوار جھونکا ثابت ہوئی۔ وہ اکثر عبید رضا سے ملنے آتا تو شمائلہ کے کیبن کی طرف کر ضرور اس کی خیریت دریافت کر لیتا۔ اس کے علاوہ آفس کے کام کے سلسلے میں بھی میٹنگ رہتی۔ لنچ ٹائم ہوتا تو دونوں ساتھ ہی کیفے ٹیریا میں بیٹھ جاتے۔ کبھی عام موضوعات کو زیرِ بحث لاتے تو کبھی تعلیمی دور کے قصے دہراتے۔ دونوں کا ذہنی معیار ایک جیسا تھا وہ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے تھے اور پچھلے کئی مہینوں کے دوران اچھے دوستوں کی طرح اپنے اپنے مسائل آپس میں ڈسکس کر لیا کرتے تھے جہاں وہ اسے سحرش کے بارے میں بتا چکا تھا' وہاں وہ سعید کی فطرت کے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکا تھا اور دونوں ہی خیر خواہی کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش رہنے کا مشورہ دیتے۔ شمائلہ کو شدت سے احساس ہوتا کہ سعید بالکل بھی اس کے معیار کا نہ تھا اور کئی سالوں سے اس کی ذہنی آسودگی چھین رکھی تھی۔

☆......☆

شمائلہ دو دن سے نوٹ کر رہی تھی کہ سعید اپنی ملازمت پر نہیں جا رہا تھا۔ بالآخر اس نے استفسار کر ہی لیا۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان اب کچھ خاص روابط نہ رہے تھے۔

''کیا بات ہے آج کل تم جاب پر نہیں جا رہے ہو؟''

''جاب تو میں نے چھوڑ دی ناں'' وہ لاپرواہی سے منہ میں مونگ پھلی کا دانہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''لیکن کیوں؟ کیوں چھوڑ دی جاب؟'' شمائلہ سخت استعجابیہ انداز میں بولی۔

''کیا بتاؤں یار' اِس فیکٹری کے مالک نے کس قدر تنگ کر کے رکھا ہوا تھا میری تو بنتی ہی نہیں تھی اس کے ساتھ۔ ہر بات پر روک ٹوک' کبھی ٹائم کا رونا۔ میں نے بھی کھری کھری سنا ڈالیں'' اس نے مونگ پھلی چھلکا ہوا میں اُڑایا۔

''مگر تم تو ایگزیکٹ ٹائم پر نکلتے تھے' پھر کیا مسئلہ تھا''

''تو اور کیا! ہاں کبھی آپا کا فون آ جاتا تو وہاں سے چکر لگاتا ہوا جاتا۔ یا کبھی آپا بے چاری کے کسی ضروری کام کی وجہ سے فیکٹری سے جلدی نکلنا پڑ جاتا' تو اس نواب صاحب کو بُرا لگتا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتا تھا۔ پریشان کر کے رکھ دیا تھا مجھے

۔ اب بھگتے گا خود ہی...... یہ تم ریموٹ کہاں رکھ دیتی ہو بھئی؟'' اس نے تکیے کے نیچے ٹٹولا۔

''وہ کیا بھگتے گا، بھگتیں گے تو ہم ہی، اور نوابوں والا رویہ اس نے نہیں، تم نے اختیار کرر کھا تھا وہ تمہاری سلطنت نہیں تھی کہ جب دل چاہا ڈیوٹی چھوڑ کر کسی کی بھی غلامی کرنے چل دیئے، کچھ ہوش ہے تم کو اُف میرے خدا'' اس سے کھڑا نہ رہا گیا تو وہیں بیٹھ گئی۔

کیا مطلب ہے تمہارا یا کسی کی غلامی کیوں کرنے لگا میری بہنیں بیچاری کتنی اکیلی اور دکھی ہیں مجھ سے نہیں کہیں گی تو کس سے کہیں گی اپنی پریشانیاں ان کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔

وہ اکیلی کیوں ہونے لگیں ان کے شوہر موجود ہیں ان کی ذمے داری پوری کرنے کے لیے مگر وہ تم جیسے بے دام کے غلام کو آزاد کیوں کرنے لگیں اور تم نے جو یہ فرض کی گردان لگا رکھی ہے جانتے بھی ہوا س کا مطلب کیا ہے میں تمہاری بیوی ہوں میری اور اس گھر کی تمام ذمے داریاں اٹھانا تمہارا فرض ہے کیا جواب دو گے خدا کے سامنے۔ شمائلہ نے سر تھام لیا۔

اب کیا کرو گے کیسے ملے گی دوسری نوکری اتنی جلدی۔ پریشانی اسے گھیر رہی تھی

مجھے کہاں اتنی جلدی نوکری ملے گی شمائلہ میں تو کہتا ہوں تم کوئی دوسری اچھی نوکری تلاش کرو تھوڑا زیادہ وقت لگا لینا اچھی تنخواہ مل جائے گی نا۔ اس نے چند چھلی مونگ پھلیاں اکٹھی منہ میں ڈالیں

کتنے بے شرم ہو تم اپنی بیوی سے دوسری نوکری تلاش کرنے کا کہہ کر خود آرام سے بیٹھے ہو۔ وہ شدید غم و غصے سے کانپ رہی تھی۔

تو اپنے بھائیوں سے کہو وہ کس مرض کی دوا ہیں خوب پیسہ ہے اپنی بیویوں پر لٹانے کے لیے بڑے ہی بے غیرت ہیں اپنا بوجھ میرے اوپر ڈال کر خود عیش کر رہے ہیں۔ وہ انتہائی کمینگی پر اتر آیا۔

بے غیرت وہ نہیں تم جو ہو اپنے فرائض سے غافل ہو رہے ہو میرے بھائیوں نے اپنے فرائض سے منہ نہیں موڑا بلکہ اپنے گھر والوں کی ضروریات اور خواہشات کو اپنی اولین ترجیحات سمجھتے ہوئے بخوبی پوری کر رہے ہیں تم خود تو کسی قابل نہیں ہو ان کے گھروں کی آسودگی دیکھ کر ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے رہو گے'' غصے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

ہاں تو جاؤ جہاں تمہیں سب کچھ ملے میرے گلے کیوں پڑی ہو تم میرے سر کا عذاب بن گئی ہو دفع ہو جاؤ' نکل جاؤ میرے گھر سے مصیبت ہو تم میرے لیے دفع ہو جاؤ تم سے شادی کر کے میرا چین سکون سب برباد ہو کر رہ گیا۔ وہ منہ سے کف اگل رہا تھا

بہت بدنصیب ہو سعید تم مجھے کیا نکالو گے میں مزید یہاں رہ کر خود اپنی ذات کو بے وقعت نہیں کرنا چاہتی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

شمائلہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گی وہ ابا کے گھر چلی آئی بھائی ہمیشہ نباہنے اور زندگی بہتر بنانے کے مفید مشورے دیتے مگر سعید کی ہٹ دھرمی اور کم ظرفی کے سامنے سب دھرا کا دھرا رہ گیا شمائلہ کے اعصاب شل ہو گئے تھے اس نے ساری ہمتیں جمع کر کے سعید سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا شمائلہ کسی پر بوجھ نہ تھی مگر ہر عورت کو شوہر کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں جو پوری نہ ہوں تو وہ ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے سعید کی صورت میں اس نے ایک سنہری دور برباد کر کے زندگی کا جانے کون سا قرض اتارا تھا۔

چند دنوں کی چھٹیوں کے بعد وہ آفس آئی تو بہت مضمحل تھی بے دلی سے کام نمٹا رہی تھی کہ ابتہاج

کیبن کا گلاس ڈور دور سے چابی سے بجاتا ہوا اندر چلا آیا۔
السلام علیکم بزی ہو کیا۔
وعلیکم سلام' کچھ خاص نہیں بس چائے کی شدت سے طلب ہو رہی ہے۔ شمائلہ نے ہاتھ سے کنپٹی دبائی۔
پھر تو ٹھیک وقت پر آیا ہوں چائے کی خواہش مجھے بھی ہو رہی ہے اور آفس ٹائم بھی آف ہونے والا ہے اور یہاں کی چائے پینے کا میرا قطعاً موڈ نہیں ہے۔ وہ مسکرایا۔
شمائلہ نے ضروری فائلز اکٹھی کیں اور انٹر کام پر اپنی کولیگ صوفیہ کو چند ہدایات دیں اور دونوں قریب ہی ایک ریسٹورنٹ کے صاف ستھرے ماحول میں آ گئے۔
سب خیریت ہے ناں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اس نے شمائلہ کے بیٹھنے کے لیے کرسی باہر نکالی اور خود گھوم کر سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا
طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن شاید قسمت ٹھیک نہیں۔ شمائلہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی
ہم اچھے دوست ہیں شمائلہ تم ہر پرابلم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ اس نے تسلی دی
میں سمجھنے سے قاصر ہوں ابتہاج میرے چاروں طرف گہرا سناٹا ہے مگر اس سناٹے میں بھی بے پناہ شور ہے میں جتنا اس شور کو دبانے کی کوشش کرتی ہوں وہ اتنا ہی میری سماعتوں کو چیرتا ہے میں خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگی ہوں۔ وہ ضبط کے مراحل طے کر رہی تھی۔
ایسا مت سوچو شمائلہ تم ایک باشعور انسان ہو اور باشعور انسان خود کو سنبھالنے کا ہنر جانتا ہے بھول جاؤ سب یہ بتاؤ بچوں سے بات ہوئی۔ ابتہاج نے نرم لہجے میں کہا۔
ہاں اکثر ہوتی ہے بچے زندگی کے راستوں پر اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے کوشاں ہیں وہ ایک عرصے سے اپنے باپ کی بے حسی کا شکار رہے ہیں میں نہیں چاہتی کہ میری ذات کے حوالے سے کوئی دکھ ان کی خوشیوں اور ترقی کی راہ میں حائل ہو میری تنہائی ان کے اچھے مستقبل کے آڑے آئے میں انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔
تم تنہا نہیں ہو شمائلہ تمہارے یہ بے لوث جذبے تمہارا قیمتی اثاثہ ہیں۔
سمجھ میں نہیں آتا انسان کو ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں ملتی ہے میں نے تو زندگی سے کچھ زیادہ نہیں مانگا تھا ہر طرح سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔
جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ سزا نہیں ہوتی شمائلہ قدرت ہمارے جذبوں اور نیک نیتی کا امتحان لے رہی ہوتی کہ ہم کس حد تک ثابت قدم رہ سکتے ہیں اب مجھے ہی دیکھ لو...... اس نے ایک لمبا سانس کھینچا تو شمائلہ نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔
برسوں پہلے جو بات میں تم سے کہنا چاہتا تھا آج کہنے کا موقع مل رہا ہے ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد جب واپس آیا تو میرے دل میں صرف تمہیں پانے کی شدید تمنا تھی مگر شاید پروردگار کی آزمائش ہی تھی جو ہمارے درمیان آ کھڑی ہوئی۔
لیکن ابتہاج تم نے تو کبھی...... شمائلہ آنکھوں میں حیرت لیے اسے تک رہی تھی۔
ہاں میں نے تم پر یہ بات آشکار نہیں ہونے دی میں ایک مکمل انسان بن کر تمہارے سامنے آنا چاہتا تھا کہ تمہیں خوشیوں بھری زندگی دے سکوں ساری زندگی تمہاری حفاظت کرنے کے قابل بننا چاہتا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لیکن شمائلہ اب میں پورے خلوص کے ساتھ تمہارا ہاتھ

تھامنا چاہتا ہوں ہم اپنی اپنی آزمائشوں میں سرخرو ہو چکے ہیں شاید اسی لیے اللہ نے ہم کو دوبارہ ملایا ہے۔ وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

لیکن ابتہاج لوگ کیا سوچیں گے مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔

تمہارے یہ وسوسے بالکل بے معنی ہیں شائلہ لوگوں کا کام صرف کچھ عرصے باتیں کرنا ہے اور کچھ نہیں ہم دونوں میچورڈ تعلیم یافتہ اور صاف دل کے لوگ ہیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق رکھتے ہیں اور پھر ہمارا مذہب اور قانون بخوشی اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ابتہاج کی نیک نیتی پر تو شائلہ کو پورا یقین تھا مگر لوگوں کی باتوں سے خوفزدہ تھی۔

☆......☆

وہ رات سونے کے لیے لیٹی تو اس کا ذہن خاصا منتشر ہو رہا تھا ابتہاج کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا کیا وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا اس بے انصاف اور خود غرض دنیا کا کام صرف تکلیف پہنچانا ہے اور کچھ نہیں۔ سعید کی مثال اس کے سامنے تھی کیا کچھ نہیں کیا شائلہ نے اس کے لیے۔ اس کے خاندان۔ اس کے بچوں کے لیے پھر بھی اس نے ذرا قدر نہ کی اور وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اس جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ بتانے والوں نے بتایا کہ شائلہ کی علیحدگی کے فوراً بعد سعید کی بہنوں نے ایک دولت مند بیوہ سے اس کی شادی کروادی تھی اور سعید اس کی دولت پر عیش کرنے کے خیال سے بہت خوش تھا مگر اللہ کا ایک نظام ہے جسے مکافات عمل کہتے ہیں اور اب سعید اسی نظام کا شکار ہو کر رضیہ اور اس کے بارہ سالہ بیٹے کا زرخرید غلام بن چکا تھا سعید کی بہنوں نے جس گھر میں شائلہ کی موجودگی میں بھاوج کی گرہستی پر خوب اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اب وہاں رضیہ کا قبضہ تھا جس نے آتے ہی چھوٹی اور بڑی آپا کی گھر میں انٹری پر پابندی لگا دی تھی اور اب وہ اپنے اپنے شوہروں کے شکنجوں میں قید پھڑ پھڑانے میں مصروف تھیں کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک نہ ایک دن اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا ضرور ہے۔ سعید اس کی زندگی کا رانگ نمبر تھا جسے اس نے دل کی کونٹیکٹ لسٹ سے ہمیشہ کے لیے ڈیلیٹ کر دیا تھا شائلہ کے دل نے نیک نیتی کے ساتھ ابتہاج کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کر لیا تھا دل کا فیصلہ سنتے ہی شائلہ کے چاروں طرف دھنک رنگ بکھر گئے تھے جس میں خود کو سر تا پا جھلملاتا محسوس کر رہی تھی اس نے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ابتہاج کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

شائلہ میں جانتا تھا تمہارا فون ضرور آئے گا۔

ابتہاج نے پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا تھا۔

ابتہاج تم ٹھیک کہتے ہو ہمیں اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کا پورا حق حاصل ہے میں بھی اسی راہ پر گامزن ہونا چاہتی ہوں جس پر تم میرے ہم سفر بنو

میں تمہیں کبھی مایوس نہیں ہونے دوں گا شائلہ ذرا دیر سے سہی مگر ہماری خوشیاں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ شائلہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی اور اس نے ابتہاج کو بھائی جان سے ملنے کا عندیہ دے دیا غموں کے بادل چھٹ رہے تھے شائلہ کے من آنگن میں دور تک پھول کھلے جا رہے تھے۔ اس نے گہرا سانس ہوا میں چھوڑا اور فون بند کر کے تکیے کے نیچے رکھا اور پرسکون ہو کر آنکھیں موندیں تو عین سامنے ابتہاج اپنی تمام تر وفاداریوں کے ساتھ اس کی جانب ہاتھ بڑھا رہا تھا جسے اس نے بغیر کسی پس و پیش کے تھام لیا تھا۔

□□......❀......□□

ناول

ثمینہ مشتاق

موتی......!

(قسط3)

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو موٹی تھی

اور معاشرے میں مس فٹ سی تھی مگر پھر کچھ ہوا......

''تم رات میں کچھ اچھا سا بنا کر ضرور لے جانا بیٹا آج نئے گھر میں ان کا پہلا دن ہے ان کے تمام برتن بھی پیک تھے' پڑوسیوں کا خیال ہماری ذمہ داری ہے۔'' روبی شریر نظروں سے زوبی کو دیکھ رہی تھی اماں کے کمرے سے چلے جانے کے بعد بولی۔

''لگتا ہے پڑوسیوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کے نیک ارادے ہیں۔'' زوبی نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے بستر پہ بیٹھ گئی۔

''اب کیا یوں ہی منہ بنا کے رکھو گی۔''

''نہیں......'' زوبی نے جواب دیا۔

''شہزاد کو فون کروں گی سب کچھ ٹھیک کرنے کے لیے کہوں گی میں اماں کو ایسے نہیں دیکھ سکتی۔'' زوبی نے دکھ سے کہا۔ روبی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

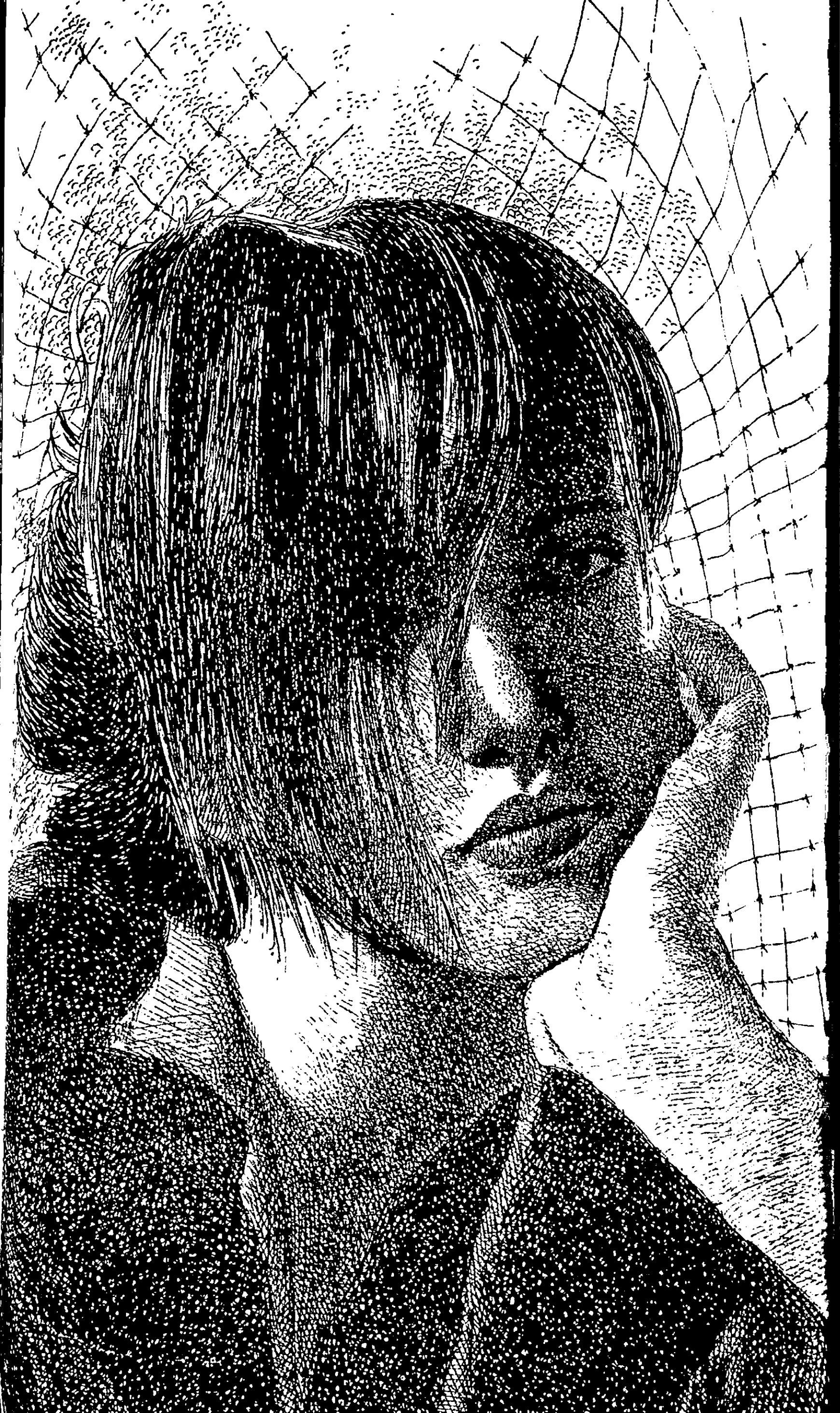
''آپی......تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ اس کے برابر آ بیٹھی۔

''مجھے تم سے اس بیوقوفانہ بات کی امید نہیں تھی' تمہاری بھی کوئی عزت ہے یا نہیں؟''

''کس طرح اس نے اماں کے سامنے رشتے سے انکار کیا تم سب جانتی ہو۔ تمہاری انا کہاں چلی گئی ہے تمہاری عزت نفس کہاں مر گئی ہے تم کیا اب اس شخص کی منتیں کرو گی؟ اس سے محبت کی بھیک مانگو گی؟''

''ہاں بھیک مانگوں گی......محبت کی۔''

''مانگ لینی چاہیے......مانگنے سے اکثر چیزیں مل بھی تو جاتی ہیں۔'' زوبی نے کہا۔ روبی کو اپنے کانوں پر



یقین نہیں آیا وہ اٹھ کر زوبی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔
''آپی.....تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو میں نہیں جانتی تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے مگر اتنا پتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو' میں اس بیوقوفی میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔'' زوبی نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔
''روبی کیا تم نہیں چاہتی سب ٹھیک ہو جائے؟''
''ہاں میں چاہتی ہوں سب ٹھیک ہو جائے مگر اس طرح نہیں اس کے لیے تمہاری عزت کا سودا مجھے منظور نہیں' تم خود کو کس بات کی سزا دے رہی ہو بس اتنا قصور ہے تمہارا کے تم شہزاد کو پسند نہیں آئیں۔''
''میں شہزاد کو ریجیکٹ کرتی ہوں مجھے شہزاد پسند نہیں وہ مر کر بھی زندہ ہو جائے تب بھی نہیں۔'' روبی غصے سے بولی۔ زوبی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔
''تم میری حالت نہیں سمجھ سکتیں تم مجھ سے کچھ بھی امید کر سکتی ہو میری ذات میں ماتم بپا ہے میں خود سے لڑ رہی ہوں اور مستقل ہار رہی ہوں میرے خیالات منتشر ہیں میرے پاس فنا ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے اگر اماں کو ان کے رشتے واپس دلانے کے لیے مجھے خود کی نفی بھی کرنی پڑی تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔''
''اچھا.....تو تم کو لگتا ہے تم محبت کا کاسہ لے کر شہزاد کے پاس جاؤ گی اور وہ مسکرا کر اپنی محبت سے تمہارا دامن بھر دے گا' اتنا ضدی اور خود سر انسان جس نے اماں کی عزت تک کا پاس نہیں کیا تم سوچ سکتی ہو تمہارے لیے کس حد تک گر جائے گا۔'' روبی نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔
''مجھے ایک آخری کوشش تو کر لینے دو کیا پتا وہ اس بار مان جائے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔'' زوبی نے امید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
''آپی......ہوش میں آؤ۔'' روبی نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔
''وہ رمشا کو پسند کرتا ہے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے کوئی اس کو مجبور نہیں کر پایا تو تم کیا چیز ہو جس سے اس کو کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے جس کی نظر میں تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''
''پلیز آپی تمہیں حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا' یہ ہی حقیقت ہے اور ہم اس حقیقت کے ساتھ بہت خوش ہیں سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔'' دروازے کی دستک پر دونوں خاموش ہوگئیں۔ ثریا نسیم کی ہدایات پر زوبی نے آج رات کے کھانے میں خصوصی اہتمام کیا۔
نرگسی کوفتے اور شامی کباب کی ٹرے انتہائی نفاست سے سجا کر دونوں بہنیں پڑوسیوں کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ ایک چھوٹی سی بچی نے کھولا لال فراک پہنے سنہری بالوں میں پونی ٹیل باندھے وہ کوئی چھوٹی سی گڑیا لگ رہی تھی۔
''آپ کون ہیں؟'' اس نے اپنی شریر آنکھیں گھما کر بڑی ادا سے پوچھا روبی کو ہنسی آگئی۔
''ہم.....'' اس سے پہلے کے زوبی جواب دیتی یاسر نے چھوٹی بچی کو گود میں اٹھالیا اور زوبی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
''معاف کیجیے گا یہ میری بھانجی ایمان ہے آپ اندر تشریف لائیں۔'' ایمان کی شریر آنکھیں ابھی بھی ان دونوں پہ جمی تھیں گھر میں پہلے کی بہ نسبت کافی رونق تھی ہال کرے کی ڈائنگ ٹیبل پر کھانا لگایا جارہا تھا ایک خاتون ٹیبل لگانے میں مصروف تھیں۔

''زمر آپی......'' یاسر کی آواز پر انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔
''یہ ہمارے پڑوسی ہیں۔'' یاسر نے دونوں لڑکیوں کا تعارف کروایا۔ زمر آپی بہت پیار سے ملیں۔
''یہ کیا تکلف کیا؟'' انہوں نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
''ارے واہ نرگسی کوفتے کس نے بنائے ہیں؟'' زمر آپی نے مسکرا کر پوچھا۔
''میں نے' گھر میں کوکنگ میں ہی کرتی ہوں۔'' زوبی نے سادگی سے جواب دیا۔
''ماشاءاللہ......'' انہوں نے محبت سے زوبی کو دیکھا۔
''مجھے بھی سکھا دینا مجھے بنانے نہیں آتے میرے میاں صاحب کو بہت پسند ہیں۔''
''کیوں نہیں ضرور......'' زوبی مسکرا دی۔
''کون آیا ہے......؟'' امیرا بیگم ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایمان یاسر کی گود سے اتر کر ان سے لپٹ گئی۔

''نانو......کھانے والی آنٹی آئی ہیں کھانا لے کر۔'' ایمان کی بات پر سب ہنس پڑے۔ میز پر کھانا لگ چکا تھا امیرا بیگم نے اصرار کر کے دونوں بہنوں کو بھی کھانے پر روک لیا۔ سارا وقت زوبی کے نرگسی کوفتوں اور شامی کباب کی تعریفیں ہوتی رہی۔ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر گھر واپس آ گئیں۔
آج کی رات پھر نیند آنکھوں سے غائب تھی
اس کی آنکھیں کمرے کی چھت کو گھور رہی تھیں روبی سو چکی تھی اس نے موبائل اٹھایا اور ایک میسج ٹائپ کیا۔
''ہم خوش مطمئن آباد ساتھ صحت مند سلامت اور رب کی امان میں رہیں......آمین۔'' یہ میسج بھیج دیا گیا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک موبائل کی اسکرین چمکی۔
''یہ کیا ہے......؟'' جواب موصول ہوا۔
''دعا ہے اور دعاؤں کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔'' زوبی نے جواب دیا۔
''پھوپو کیسی ہیں؟'' سوال موصول ہوا۔
''ٹھیک ہیں وہ بہت باہمت ہیں' پر میں نہیں۔''
''میں جانتی ہوں آپ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔'' زوبی نے جواب دیا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ زوبی کا درد آنکھوں سے بہہ نکلا۔
''آہ سچ ہے......ایک بار مرنے میں وہ اذیت کہاں جتنی کسی کے لیے روز مرنے میں وہ دیر رات تک شہزاد کو کیے جانے والے میسج بار بار پڑھتی رہی۔ فجر کی نماز کے بعد اس نے وہ ہی دعا دوبارہ ٹائپ کر کے شہزاد کو بھیج دی۔

''کیوں بھیج رہی ہیں یہ دعا مجھے؟'' شہزاد کا جواب موصول ہوا۔
''میں دعا میں رمشا کو مانگتا ہوں' آپ مجھے مانگ رہی ہیں میں آپ کا ہونا نہیں چاہتا' ہم اچھے دوست ہو سکتے ہیں زوبی ایک دوسرے کی محبت نہیں۔''
''میں جانتی ہوں ہم کچھ نہیں ہو سکتے' میں جانتی ہوں محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی بیچ کا تو کوئی راستہ نہیں ہوتا' رمشا خوب صورت ہے کامل ہے قبولیت کا درجہ پا چکی ہے میں تو مر کر بھی آپ کے لیے کامل نہیں ہو

سکتی۔ وہ آپ کی نظروں میں جچتی ہے آپ کے دل میں بستی ہے آپ کی روح میں سماتی ہے' آپ کی محبت مکمل ہے اور میری الفت محض دیوانے کا خواب......'' زوبی کو جواب میں محض چند لائنیں موصول ہوئیں۔

''میرا خیال دل سے نکال دیں زوبی......''

''کوئی آرزو میرے دل میں پنپنے مجھے اختیار نہیں کیونکہ میں انسان ہوں نہ اپنے قابل قبول ہونے پر مجھے اختیار ہے اور نہ میرے دل کو...... محبت پر۔'' زوبی کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ میسج کا سلسلہ جاری تھا۔

''آپ کو محبت کا حق کس نے دیا؟ میں نے کبھی آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' شہزاد نے استفسار کیا۔

''اس میں میرا ابھی تو کوئی قصور نہیں۔'' زوبی نے بے بسی سے جواب بھیجا۔

اللہ نے محبت کرنے کا جذبہ بھی انسان کی فطرت میں رکھا مگر حصول قسمت پر چھوڑ دیا ہے۔'' زوبی کا بس نہیں چلتا تھا وہ کہہ دے خدا کے لیے مان جاؤ۔

''میرے ہو جاؤ شہزاد سب ٹھیک کر دو یہ زندگی ہر لمحہ سولی پر ٹنگی ہے نہ موت آتی ہے نہ زندگی باقی ہے۔''

زوبی کے میسج کے بعد شہزاد کا کوئی جواب نہ آیا۔ زوبی جائے نماز پر بیٹھ کر روتی رہی اور وہیں سو گئی۔

''آپی......'' روبی کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی دن کافی چڑھ چکا تھا' زوبی انگارے کی طرح تپ رہی تھی۔

''اف تمہیں تو تیز بخار ہے۔'' روبی نے پریشان ہو کر اس کے ماتھے کو ہاتھ لگایا اور سہارا دے کر اسے بستر تک لے آئی۔

''میں اماں کو بلاتی ہوں۔'' زوبی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی ثریا نسیم پریشان ہو گئیں۔

''کیا ہوا زوبی اتنا تیز بخار......''

امبر شہزاد کو کیے جانے والے میسج زوبی کے موبائل میں پڑھ چکی تھی۔ وہ دکھ اسے دیکھ رہی تھی مگر اس نے ثریا نسیم سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' امبر نے دروازہ کھولا تو یاسر کو سامنے کھڑا پایا۔ ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور کالی پینٹ میں وہ شاید کہیں جانے کے لیے تیار تھا اس کے ہاتھ میں کل رات بھیجے گئے کھانے کے برتن تھے جنہیں وہ واپس کرنے آیا تھا۔

''السلام وعلیکم......کھانا بہت لذیذ تھا ایک بار پھر شکریہ۔'' یاسر نے مسکرا کر ٹرے امبر کے حوالے کر دی۔

''ایک زحمت اور دینی تھی اگر میں آنٹی سے مل سکوں؟'' یاسر سوالیہ نظروں سے امبر کو دیکھ رہا تھا۔

''جی ضرور......'' امبر اسے اندر زوبی کے کمرے میں لے آئی جہاں ثریا نسیم پریشانی کے عالم میں اس کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔

''السلام وعلیکم......!'' یاسر نے ادب سے سلام کیا۔

''زوبی کو کیا ہوا؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''بیٹا بخار میں تپ رہی ہے میری بچی یہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے شاید اس کو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں۔'' یاسر تیزی سے مڑا اور گھر سے اپنا بیگ لے آیا اس کے ساتھ امیرا بیگم بھی آ گئیں۔

''آپ اجازت دیں تو میں زوبی کا چیک اپ کر لوں۔'' یاسر نے ثریا نسیم سے پوچھا۔

''آپ......آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟'' امبر نے حیرت سے پوچھا۔ یاسر مسکرا دیا۔
''جی......کچھ ایسا ہی معاملہ ہے' آپ کا پڑوسی بھی اور ڈاکٹر بھی......'' ثریا نسیم نے یاسر کے لیے جگہ خالی کر دی۔ اس نے ضروری چیک اپ کے بعد زوبی کو انجکشن لگایا اور مسکرا کر امبر کی جانب دیکھا۔
''اور میں انجکشن بھی لگا لیتا ہوں۔'' امبر ہنس پڑی۔
''زوبی ٹھیک ہو جائیں گی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے کچھ دوائیں ہیں وہ میں شام تک ساتھ لیتا آؤں گا آپ بے فکر رہیں۔'' اس نے ثریا نسیم کو دلاسا دیا۔
''آپ کا بہت بہت شکریہ بیٹا......'' ثریا نسیم کی آنکھیں تشکر سے چھلک پڑی۔
''میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔''
''شکریہ کی کیا بات ہے آنٹی یہی تو ہم ڈاکٹروں کا کام ہے جہاں مریض وہاں ہم' اصل زحمت تو مجھے آپ کو دینی تھی۔''
''کیسی زحمت بیٹا؟'' ثریا نسیم نے پوچھا۔
دراصل امی گھر میں تنہا ہوتی ہیں اور میرا پیشہ ایسا ہے کہ گھر آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے کبھی رات دیر تک بھی واپس آتا ہوں آپ سے بس یہ گزارش تھی کے امی کا خیال رکھیے گا۔ امی استما کی مریضہ ہیں۔
''مگر میرے کان کھینچنے کے معاملے میں ایک دم فٹ ہیں۔'' یاسر نے امیرا بیگم کو پیار سے ساتھ لگا لیا۔
''آپ صرف زوبی کا خیال رکھیں۔'' امیرا بیگم مسکرائیں۔
''اس شیطان کی باتوں میں بالکل نہ آئیں۔ آپ کی بیٹی کو آپ کی توجہ چاہیے۔ یاسر تو یونہی میری فکر کرتا رہتا ہے کلینک جا کر بھی گھڑی گھڑی فون کرتا ہے۔ کہیں بڑی بی سلامت بھی ہیں یا نہیں۔''
''اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ سلامت رکھیں ثریا نسیم بولیں۔
ایسی فرمابردار اولاد تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔
میں چلتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے انشاءاللہ شام میں ملاقات ہوتی ہے۔
یاسر سب سے رخصت ہو کے اپنے کلینک کے لیے روانہ ہو گیا۔
امیرا بیگم کچھ دیر زوبی کے پاس بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئیں تو ثریا نسیم اور امبر تنہا رہ گئے۔
اماں آپ آرام کریں......میں آپی کا خیال رکھوں گی۔
امبر نے زبردستی ثریا نسیم کو ان کے کمرے میں بھیج دیا۔
زوبی کا بخار اتر چکا تھا لیکن نقاہت طاری تھی۔
''آپی۔'' امبر نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
اب کیسی طبیعت ہے؟
میرا موبائل کہاں ہے؟ زوبی نے پوچھا۔
کیوں؟ امبر کے ماتھے پہ شکنیں پڑ گئیں۔
خود کو اور کتنی تکلیف دو گی۔
بھول جاؤ سب کچھ......

یہ میرے بس میں نہیں شہزاد کے ساتھ گزرے لمحے میری آنکھوں میں جم گئے ہیں وہ مجھے کسی پل قرار نہیں لینے دیتے۔زوبی نڈھال تھی۔

میں صرف اتنا جانتی ہوں شہزاد بھائی تمہارے لیے کبھی نہیں مانیں گے۔امبر کا لہجہ سرد تھا۔

کیوں نہیں؟ وہ مجھے جانتے ہی کتنا تھے‘ رفتہ رفتہ جان جائیں گے تو ہوسکتا ہے اپنا ارادہ بدل دیں اور سب ٹھیک ہو جائے۔زوبی نے پھر امید سے امبر کی جانب دیکھا

بولو نا امبر کہہ دو ہاں یہ ممکن ہے۔

تم اپنی پسند کا جواب سنا چاہتی ہو جبکہ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم ایک چور کو گھر کا راستہ دیکھا رہی ہو مجھے نہیں پتا کیا ہونے والا ہے پر مجھے ڈر ہے تم برباد ہو جاؤ گی۔امبر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں تمہارے لیے سوپ بنا کر لاتی ہوں تم آرام کرو۔ظہر کی نماز کے بعد پھر وہ ہی دعا زوبی نے شہزاد کو بھیجی‘ پر اس بار دعا کے جواب میں آمین موصول ہوا۔زوبی کے ہاتھ خوشی سے کانپنے لگے۔کچھ دیر زوبی کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا لکھے۔

پھوپو کیسی ہیں؟ دوسرا مختصر سوال موصول ہوا۔

اماں ٹھیک ہیں۔

میں ٹھیک نہیں ہوں۔

’’آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گی......‘‘ جواب آیا۔

میں ٹھیک نہیں ہوسکتی جب تک اماں اور چھوٹے ماموں کے درمیان سب ٹھیک نہیں ہو جاتا۔زوبی نے جواب دیا۔

میں سب ٹھیک کر دوں گا مگر اس کی شرط ہماری شادی نہیں۔جواب آیا۔

پر امی جی بھی تو رمشا کے لیے راضی نہیں کوئی بھی راضی نہیں تو پھر آپ وہاں شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ زوبی نے بحث کی۔

میں راضی کر لوں گا ان کو اپنا بیٹا عزیز ہے۔جواب آیا۔

اور میں زوبی...... میرا کیا؟ زوبی نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوال بھیجا۔دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔اس کے آنسو پھر دامن بھگونے لگے۔

آپ کی محبت...... کامل اور میری؟ پھر یہ رنگین دکان سجانے کی کیا ضرورت تھی؟......تاروں بھری رات میں ہزاروں باتیں اور دوسرے دن میرے ہی وجود کی نفی آپ کی کسی بات سے مجھے نہیں لگا کے ہم اجنبی ہیں‘ آپ نے فاصلہ کیوں نہیں رکھا جب مجھے ٹھکرانا تھا میرے دل میں اگر کوئی احساس جاگا ہے تو اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔زوبی کے احتجاج پر کچھ دیر خاموشی رہی۔

مجھے احساس ہے‘ مگر میں آپ سے وہ محبت نہیں کر سکتا‘ میں کیسے رمشا کو انکار کر سکتا ہوں؟ وہ مر جائے گی۔زوبی شہزاد کا جواب پڑھ کر سسک پڑی۔

کیا ہوا؟ امبر کمرے میں داخل ہوئی۔

رو کیوں رہی ہو۔اس نے زوبی سے موبائل چھین کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

سو جاؤ کچھ دیر...... پلیز تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ امبر نے اسے بستر پر لٹا دیا۔
اب تم کچھ نہیں سوچو گی۔ اس نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے سختی سے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ شام تک زوبی کی حالت کچھ بہتر تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔
''لو جی آ گیا ڈاکٹر......'' امبر نے دروازہ کھولا۔
''السلام وعلیکم' زوبی اب کیسی ہیں؟''
''بہتر ہے۔'' امبر نے جواب دیا۔
''ارے بیٹا اندر آؤ۔'' ثریا نسیم یاسر کو اندر لے آئیں اور امبر کو چائے بنانے کی ہدایت کی۔
''کیا میں زوبی کا چیک اپ کر سکتا ہوں۔'' یاسر نے ان سے اجازت چاہی۔
کیوں نہیں بیٹا ضرور...... یاسر ثریا نسیم کے ساتھ زوبی کے کمرے میں داخل ہوا وہ گم سم سی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ یاسر نے اپنا بیگ زوبی کے بستر پر رکھا اور اس میں سے چند دوائیں نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔
''لیجیے زوبی آپ کی روم ڈیکوریشن میں کچھ اضافہ ہم نے بھی کر دیا ہے۔'' زوبی نے نظر اٹھا کر دواؤں کی جانب دیکھا۔
اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ انہیں کب تک اپنے کمرے کی زینت بنا کر رکھتی ہیں۔ یاسر نے مسکرا کر اسے دیکھا مگر زوبی کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔
آنٹی...... اب ان سے نرگس کو فتے مت بنوایئے گا۔
کیوں بیٹا؟ ثریا نسیم نے حیرانی سے پوچھا۔
دیکھیں کتنی نقاہت طاری ہو گئی ہے۔ یاسر نے شرارت سے جواب دیا۔ امبر جو چائے کی ٹرے لیے دروازے میں کھڑی تھی کھلکھلا کر ہنس پڑی' یاسر امبر کی جانب متوجہ ہوا۔
تم کیا ہر وقت ہنستی رہتی ہو یاد رکھو میں بڑا خطرناک قسم کا ڈاکٹر ہوں اور مجھے انجکشن بھی لگانا آتا ہے۔ امبر پھر یاسر کی بات پر ہنس پڑی۔
آپ کی چائے...... امبر نے چائے کا کپ اس کے سامنے بڑھا دیا۔ یاسر نے شکریہ کے ساتھ چائے کی ایک چسکی لی۔
یہ وہ چائے تو نہیں جو اس دن گھر پر آئی تھی۔
کیوں اچھی نہیں بنی چائے؟ امبر نے آنکھیں گھما کر پوچھا
اچھی ہے...... پر اس دن شاید چائے دل سے بنائی تھی آج کام چوری سے بنائی ہے۔ یاسر ہنس دیا۔
جی نہیں اس دن چائے زوبی نے بنائی تھی اور آج میں نے بنائی ہے۔ امبر نے وضاحت کی۔
اوو اچھا اچھا...... یاسر نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔
پھر ویسی چائے کے لیے تو مس زوبی کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ اس نے تھرما میٹر سے زوبی کا بخار چیک کیا۔
اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟ یاسر کے سوال کا زوبی نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کیے لیٹی۔

رہی۔ یاسر کو بے چینی ہونے لگی۔
وہ جانتا تھا زوبی سب سن رہی ہے۔ اس کے ذہن میں کئی سوال ابھرے پر اس نے نظر انداز کر دیے۔
آپ یہ دوائیں ایک دو دن تک جاری رکھیں میں چلتا ہوں' اگر ضرورت پڑے تو کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنا کارڈ زوبی کے سرہانے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
چائے کا شکریہ...... یاسر ثریا نسیم سے رخصت ہو کر وہ گھر واپس آ گیا۔
آپی ہو کیا گیا ہے تمہیں کیوں اتنا خاموش ہو گئی ہو۔ امبر نے پریشان ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ زوبی نے کوئی جواب نہ دیا امبر کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ زوبی نے رات گئے پھر دعا ٹائپ کی اور شہزاد کو بھیج دی پر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ اس کی آنکھیں ایک انجانے احساس سے رات بھر آنسو بہاتی رہیں' صبح دس بجے زوبی کے موبائل کی اسکرین چمکی۔ اس نے میسج پڑھا تو ایک لمحے کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔
زوبی دروازہ کھولیں کا مختصر سا جملہ...... وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ دروازے کی گھنٹی نے اسے اس بات کا یقین دلا دیا کے وہ خواب نہیں دیکھ رہی اس نے اٹھ کر کانپتے ہاتھوں سے گھر کا دروازہ کھولا۔ لال ٹی شرٹ بلیو جینز میں ملبوس ایک کندھے پر کالا بیگ لٹکائے شہزاد اس کے سامنے کھڑا تھا۔
آپ...... یہاں کراچی؟ کب کیسے؟ زوبی کی خوشی دیدنی تھی اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے یہ خواب تھا جو حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔
اندر بھی آنے دیں گی یا یہیں کھڑا رکھیں گی؟ پہلی بار منڈا کراچی آیا ہے پانی تو پوچھ لو۔ زوبی نے مسکرا کر شہزاد کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔
میں اماں کو بتاتی ہوں۔ زوبی نے ثریا نسیم کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ شہزاد ثریا نسیم کے آنے تک کچن کے نل سے منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔
تم یہاں؟ سب خیریت ہے؟ ثریا نسیم نے تشویش سے پوچھا۔ پھوپو شہزاد ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔
جس طرح آپ گئیں یقین کریں میرے لیے جینا مرنا ایک ہو گیا' آپ کے جانے کے بعد گھر میں ایک پل سکون کا نہیں ملا۔ ابو جی بستر سے لگ گئے ہیں ان کو آپ کے چلے جانے کا بے حد صدمہ ہوا ہے۔ آپ کسی کے فون تک کا جواب نہیں دیتی ہیں' میں کیا کرتا کیسے بتاتا آپ کو کے ابو جی کتنے بیمار ہیں۔ آپ کو منانے مجھے کراچی آنا پڑا آپ مجھے دس جوتے مار لیں پر گھر والوں سے سارے رشتے پھر سے نہ توڑیں۔ کئی سالوں بعد آپ کو سب کے ساتھ دیکھ کر ابو پھر سے جی اٹھے تھے ورنہ ساری زندگی انہوں نے آپ سے دوری کا غم دل سے لگائے رکھا تھا۔
تم بنا بتائے آئے ہو؟ ثریا نسیم پر شہزاد کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔
پھوپو بتا کے کیسے آسکتا تھا ابو نے آنے ہی نہیں دینا تھا' وہ تو پہلے ہی مجھ سے بہت خفا ہیں' ان کو لگتا تھا شاید میرے ذریعے وہ آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کر سکیں گے' پر میرے انکار نے

انہیں مجھ سے بے حد خفا کر دیا ہے۔
اٹھو...... ثریا نسیم نے شہزاد کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔
تم کو بنا بتائے نہیں آنا چاہیے تھا' بڑوں کی کوئی اہمیت بھی ہے تمہاری نظر میں یا نہیں؟ اگر خدانا خواستہ راستے میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھائی جی کو کیا جواب دیتی۔ اب جتنے دن کے لیے بھی آئے ہو آرام سے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر بھائی جی کو میرے سامنے فون کرو اور کراچی آمد کی اطلاع دے دو ابھی اسی وقت...... ثریا نسیم نے حکم دیا۔
پر پھوپو...... شہزاد نے التجا کی۔
آپ نہیں جانتی وہ بہت غصہ ہو جائیں گے۔
اگر تم نہیں بتا سکتے تو اسی وقت واپس لوٹ جاؤ میرے گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں تم پہلے ہی مجھے اپنی حرکتوں سے مایوس کر چکے ہو میں مزید کوئی غلط فہمی نہیں چاہتی۔ ثریا نسیم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ امبر بھی جاگ گئی تھی اور حیرت زدہ سی کھڑی یہ انہونی دیکھ رہی تھی۔ شہزاد نے ہاشم احمد کا نمبر ملایا۔
ابو جی...... اس کی لڑکھڑاتی آواز ہاشم احمد کے کانوں سے ٹکرائی۔
پتر...... کہاں ہے تو؟ یہاں سارا گھر تیرے لیے پریشان ہے۔ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔
ابو جی میں کراچی پھوپو کے گھر...... شہزاد کا گلا خشک ہونے لگا۔
کراچی؟...... ثریا کے پاس؟ پر کیوں وہ بھی بنا بتائے؟ خالی ہاتھ چوروں کی طرح راتوں رات کیوں چلے گئے تم؟ کیا اب بھی کچھ باقی تھا کہنے کو؟ ہاشم احمد کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔
ابو جی...... شہزاد کی زبان کو تالے لگ گئے۔ ثریا نسیم اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھیں۔
بس میں ابھی نہیں سمجھا سکتا پر میں خیریت سے ہوں کچھ دن میں واپس آ جاؤں گا' اور خالی ہاتھ نہیں آیا ہوں آپ بےفکر رہیں۔ اللہ حافظ۔ شہزاد نے ہاشم احمد کا جواب سنے بنا لائن کاٹ دی اور ثریا نسیم کی جانب اطمینان سے دیکھا۔
کیا اب میں آپ کے پاس رہ سکتا ہوں؟ ثریا نسیم نے آگے بڑھ کر شہزاد کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔
تم میرے بھائی کی اولاد ہو ہمارا خون ہو جب تک دل چاہے رہو تم منہ ہاتھ دھولو امبر تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دے گی۔ ثریا نسیم نے امبر کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ جنہیں وہ بخوبی پڑھ سکتیں تھیں مگر ابھی ان سوالوں کے جواب خود ان کے پاس بھی نہیں تھے۔
زوبی تم میرے کمرے میں آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ زوبی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی۔ امبر شہزاد کو اس کا روم دکھانے لے گئی' جو ثریا نسیم کے کمرے کے بالکل برابر ہی تھا۔ شہزاد نے بستر پر اپنا کالا بیگ رکھا اور وہیں دراز ہو گیا۔ امبر انتہائی ناگواری سے اسے دیکھ رہی تھی۔
کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔ شہزاد اٹھ کر بیٹھ گیا۔
نہیں فی الحال تو نہیں' اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخائیں۔
میں بس سونا چاہتا ہوں کچھ دیر پھر بہت سے کام کرنے ہیں۔

کون سے کام؟ امبر سے ضبط نہ ہوا۔
ہیں کچھ ضروری کام جیسے میں نے سمندر نہیں دیکھا وہ دیکھنا ہے چاندنی رات میں کیسا لگتا ہوگا سمندر۔شہزاد مسکرایا۔امبر سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی۔
آپ یہاں محض سمندر دیکھنے تو نہیں آئے میں جانتی ہوں۔آپ جس بھی وجہ سے آئے ہیں وہ وجہ بھی نیک نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ جب سے میری بہن کی زندگی میں آئے ہیں اسے آپ کی جانب سے دکھ کے سوا کچھ نہیں ملا اور یقیناً اب بھی آپ کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنے آئے ہیں۔
اف......اتنا غصہ اتنی چھوٹی سی امبر میں......شہزاد ہنس پڑا۔
میں تو سمجھتا تھا شہر والے بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں پر شاید تم مرچیں زیادہ کھاتی ہو۔امبر نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

زوبی کمرے میں......داخل ہوئی تو ثریا نسیم نے کمرے کا دروازہ بند کردیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا زوبی نظریں جھکائے بستر پر بیٹھ گئی۔
زوبی ......شہزاد کے آنے سے میں سخت پریشان ہوگئی ہوں۔زوبی نے نگاہ اٹھا کر ثریا نسیم کو دیکھا۔آج سے پہلے اس نے اماں کے چہرے پہ اتنی الجھن کبھی نہیں دیکھی تھی۔
اماں تو بڑی باہمت عورت تھیں پر آج پریشان؟ ثریا نسیم نے بات جاری رکھی۔
میرے گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں شہزاد کی موجودگی میری راتوں کی نیندیں حرام کرکے رکھے گی' ہاں وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے پر ہے تو انسان نامحرم اور تم سے شادی کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا اگر وہ ٹوٹے رشتے جوڑنے آیا ہے تو اس کا واحد راستہ تم سے ہوکر جاتا ہے۔میں تم سے فقط اتنا چاہتی ہوں کہ وہ یہاں جب تک ہے بہت احتیاط سے رہو میں اسے گھر سے چلے جانے کا نہیں کہہ سکتی محض تم کو سمجھا سکتی ہوں۔
جی اماں ......زوبی نے مختصر جواب دیا۔ثریا نسیم بے چین نظروں سے اسے دیکھ رہیں تھیں وہ اس کے اس مختصر جواب سے قطعی مطمئن نہیں تھیں۔نجانے کیوں دل اتنا گھبرا رہا تھا نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔
تم جاسکتی ہو۔انہوں نے اپنے خشک ہونٹ ہلائے۔زوبی جھکی نظروں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔وہ اپنے کمرے میں آئی تو امبر غصے سے بھری بیٹھی تھی۔
تم نے انہیں کراچی تک بلالیا۔
میں نے؟ زوبی نے سر سے ڈوپٹہ اتار کر بستر پر رکھا اور مسکرادی۔
نہیں وہ خود آئے اچانک مجھے کچھ علم نہیں تھا۔
کیوں؟ امبر نے پھر پوچھا۔
مجھے نہیں پتا۔زوبی بولی۔
شاید سب ٹھیک کرنے آئے ہیں
اچھا؟ وہ کیسے؟......امبر نے طنز کیا۔
جادو کی چھڑی لائے ہیں ساتھ؟ تم بہت خوش ہونا؟ زوبی کو دیکھ کے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کل تک شدید

بخار میں مبتلا تھی، شہزاد کے آنے کے بعد تو جیسے اس میں نئی زندگی آ گئی تھی۔
ہاں بہت...... بہت خوش ہوں...... پر لگ گئے ہیں مجھے۔ زوبی کھلکھلا کے ہنسی۔
آپی...... مجھے عجیب سا ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں کیوں دل کرتا ہے تمہیں کسی ڈبے میں بند کر کے دنیا سے چھپا لوں۔ امبر اٹھ کر زوبی کے پاس بیٹھ گئی۔
دل تو میرا چاہتا ہے شہزاد کو کسی ڈبے میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لوں جب چاہوں دیکھوں صرف میں دیکھوں۔ زوبی ہنسی۔ امبر نے برا سا منہ بنایا۔
وہ پہلی بار آیا ہے کراچی تو اب تم اسے شہر بھی گھماؤ گی؟
ہاں ضرور کیوں نہیں
زوبی نے بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا جب تک وہ یہاں ہیں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنا چاہتی کسی طرح تو ان کے دل میں میری جگہ پیدا ہو گی
یہ ہی میرا پہلا اور آخری چانس ہے وہ ساتھ رہیں گے تو مجھے سمجھ پائیں گے ظاہری خوب صورتی کے علاوہ بھی انسان میں بے شمار خوبیاں ہو سکتیں ہیں۔ اس کا ظرف اس کی وفا اس کی محبت اس کا اظہار جو وہ مختلف انداز سے کرے عورت ہی تو گھر کو اپنی عادت واخلاق سے جنت بناتی ہے۔
عورت کو ایسا ہونا چاہیے کے مرد کو اس سے سکون ملے۔
اس کے وجود سے آرام ملے۔
کیا شکل وصورت کا اچھا ہونا اس آرام وسکون کی ضمانت ہے تم خود بتاؤ؟ اس نے امبر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا
امبر چڑ کر بولی
یہ کیا بات ہوئی وہ ہوتے کون ہیں جو ہر طرح سے تمہیں جانچیں پرکھیں ان کا اپنا کیا معیار ہے؟ تم کیوں شہزاد بھائی کو خدا بنا رہی ہو کیا ان کی اجازت کے بنا جنت میں نہیں جا سکو گی
خدا...... زوبی ہنسی۔
خدا نہیں مجازی خدا
دعا کرو میرے حق میں یہی بہتر ہو جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا
میں کچن میں جاتی ہوں تم گھر کی صفائی دیکھو
زوبی نے پیار سے امبر کا گال چھوا اور کمرے سے نکل گئی
......گھنٹی کی آواز پہ امبر چلائی لو آ گے ڈاکٹر صاحب زوبی کھانا بنانے میں مصروف تھی
امبر نے دروازہ کھولا اور مسکرا دی
یاسر کالے رنگ کی ٹی شرٹ اور بلیو جینز میں سامنے کھڑا تھا
آج امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے سو کلینک نہیں جا سکا
سوچا اپنی مریضہ کی خیریت دریافت کر لوں۔

جی جی ضرور امبر نے یاسر کو اندر آنے کا راستہ دیا
زوبی کو کچن میں مصروف دیکھ کر وہ شوخی سے بولا
ارے یہ کیا ظلم۔کل سے آج تک میں اتنا تضاد لگتا ہے امبر کو آپ کے ہاتھ کے ذائقے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔
زوبی مسکرادی
نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں کافی بہتر ہوں اور گھر میں گاؤں سے مہمان آئے ہوئے ہیں تو اب کون سی بیماری کیسی بیماری۔
جی بن بلائے مہمان......امبر نے لقمہ دیا۔
خیر مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں مگر آپ بھی اپنا خیال رکھیں
معاف کیجیے گا میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ آپ اپنی صحت کی جانب سے کافی غافل ہیں اچھی صحت کے لیے خوش رہنا بہت ضروری ہے خوش رہا کریں۔
یاسر کی ہری آنکھیں خلوص سے زوبی کو دیکھ رہی تھیں جو مستقل کھانا بنانے میں مصروف تھی بریانی اور کبابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا
کیا میں آنٹی سے مل سکتا ہوں؟
جی کیوں نہیں آپ تشریف رکھیں میں بلاتی ہوں
امبر یاسر کو ہال کمرے میں بیٹھا کر ثریا نسیم کو لینے چلی گئی گھر کی سجاوٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کے کسی باذوق انسان کی محنت ہے ہال کمرے میں ہلکے ہرے پردوں کے اوپر لال اور گلابی کپڑے کی جھالر بنائی گئی تھی
لال ربن سے پردے قرینے سے سمیٹ کر باندھے گئے تھے
صوفے کے کور پر عمدہ اور نفیس ہاتھ کی کڑھائی تھی' ہال کمرے کی قد آور گلاس پینٹنگ کے نیچے زوبی لکھا تھا یاسر زوبی کی ہنر مندی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا' کچھ ہی دیر میں ثریا نسیم ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔
اسلام وعلیکم......یاسر نے ادب سے سلام کیا۔
معاف کیجیے گا آنٹی آپ کو آج پھر تنگ کرنے آدھمکا۔
نہیں بیٹا تمہارا تو ہم پر احسان ہے تم بے جھجک آسکتے ہو۔ثریا نسیم شفقت سے بولیں۔
آنٹی......یاسر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ اپنے ذہن میں الفاظ یکجا کرنے کی کوشش کرر ہا تھا۔
بولو بیٹا کیا بات ہے۔ثریا نسیم اس کی الجھن بھانپ گئیں۔
آنٹی آپ تو جانتی ہیں امی استما کی مریضہ ہیں ان کی طبیعت اکثر اچانک خراب ہو جاتی ہے اور آج بھی ان کی سانس اکھڑ گئی تھی میں ان کی جانب سے بہت فکر مند ہوں میرا کام ایسا ہے کے کیسی بھی وقت ایمرجنسی میں جانا پڑ جاتا ہے۔آپ سے گزارش ہے اگر ممکن ہو تو دن میں یہاں سے کوئی بھی امی سے ایک بار مل لیا کرے کہ وہ خیریت سے ہیں' انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں تا کہ مجھے تسلی رہے امی تنہا نہیں ہیں۔

بیٹا تم بے فکر رہو ہم امیرا بہن کا خیال رکھیں گے اور اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں آپ کی دیوار سے ہماری دیوار ملی ہے، پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے۔ زوبی نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی۔

جی بالکل آپ کے کچن کی دیوار سے میرے کمرے کی دیوار ملی ہوئی ہے بڑی ناانصافی ہے۔ یاسر کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ یاسر کے جانے کے بعد ثریا نسیم نیا مبر کو کہا کے شہزاد کو کھانے کے لیے جاگا دے۔ امبر نے پھر براسا منہ بنایا۔

اف! میں کیوں جگاؤں انہیں۔ اس نے زوبی کو دیکھا جو کھانے کی میز لگانے میں مصروف تھی اور مایوس ہو کر شہزاد کے کمرے کی جانب چل دی۔ کچھ دیر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد شہزاد کی بھاری آواز سنائی دی۔

جاگ گیا ہوں۔

شہزاد بھائی کھانا لگ گیا ہے۔ امبر نے دروازے کے باہر سے اطلاع دی اور واپس پلٹ گئی، کھانے کی میز پر سب دس منٹ سے شہزاد کا انتظار کر رہے تھے۔

تم نے اسے جگایا بھی تھا؟ ثریا نسیم نے امبر سے پوچھا۔ اس سے پہلے کے وہ جواب دیتی شہزاد اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔

سوری! آپ کو میرا انتظار کرنا پڑا۔ شہزاد کے تیز پرفیوم کی انتہائی ناگوار بو پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے امبر کی رہی سہی بھوک بھی مرگئی۔

ارے واہ بہت ہی لذیز کھانا بناتی ہیں پھوپو آپ...... شہزاد نے پہلا لقمہ لیتے ہی تعریف کی۔

کھانا زوبی نے بنایا ہے۔ امبر نے تصحیح کی۔

کیا واقعی یہ کباب آپ نے بنائے ہیں؟ شہزاد نے حیرت سے زوبی کو دیکھا۔

جی یہ دم کے کباب بریانی رائتہ اور پراٹھے سب زوبی نے بنائے ہیں جبکہ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ امبر کا موڈ شدید خراب تھا۔ وہ شہزاد کے لیے اتنے اہتمام پر بالکل خوش نہیں تھی، ثریا نسیم خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں، زوبی کا دل بیٹھ گیا اس نے حسرت سے شہزاد کی جانب دیکھا۔ شہزاد نے اس کی نظروں کے سوال پڑھ لیے اور نظریں جھکا لیں۔

آج شہر دکھائیں گی زوبی؟ شہزاد نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

جی کیوں نہیں۔ زوبی نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے رات ملتے ہیں کھانے سے فارغ ہو کر...... شہزاد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ آخر آئے کیوں ہیں؟ امبر نے غصے سے پوچھا۔ زوبی نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے برتن سمیٹتی رہی۔ رات میں ثریا نسیم کی اجازت سے زوبی شہزاد اور امبر کو سی ویو ڈنر کے لیے لے گئی۔

سمندر...... اور چاندنی رات کا حسن...... شہزاد چند لمحوں کے لیے کھو سا گیا۔

کبھی سوچا تھا آپ کے ساتھ ساحل پر دور تک چلوں گی آپ کی اوٹ سے چاند دیکھوں گی آج یہ حسرت بھی پوری ہوئی۔ شہزاد کو اپنے عقب سے زوبی کی آواز سنائی دی۔

(جاری ہے)

افسانہ

سبغ ضو

خواب ٹوٹنے نہ پائیں

یک لخت وہ چھوٹا سا گھر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا بچے وحشت زدہ ماں کو تک رہے تھے......

گرم ہوا ٹین کی چھت سے سرسراتی اس کے روشن دان سے ہوتی ہوئی عین اس کے چہرے پر تپش بھرا طمانچہ رسید کرتی اور پھر پورے کمرے میں چکراتی رہتی۔ لیکن وہ جائے نماز پر بیٹھی اپنے اندر جلتی آگ کی تپش میں بھانبڑ بنے وجود کے ساتھ ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز تھی۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہر درد لب پر آہ بن کر ٹوٹ گیا۔

سسکیاں چیخ کی صورت کمرے کی در و دیوار کو ہلا دینا چاہتی تھیں...... اس نے سختی سے ہونٹ بھینچے رب کے علاوہ کوئی اس کی آہ وزاری سنے اسے منظور نہ تھا۔ جانے کب زیست کا پُر پیچ رستہ اس کے لیے ہموار ہو سکے گا۔ بے بسی بھرا ایک شکوہ اس کے لبوں پر مچلنے لگا۔

''کیا ہے میرے پاس......؟'' ایک تلخ سوچ اس کے ذہن پر کسی بھوت کی طرح چمٹ گئی۔ جائے نماز ہاتھ میں لیے تپتی دیوار سے ٹیک لگائی...... جہاں پیٹھ جلی وہیں ایک جلتا احساس بھی سر اٹھانے لگا۔

''یہ دیوار بھی تو میری نہیں......'' ہاتھ پھیرا تھا اس نے دیوار پر...... تپتا ہوا کرائے کا مکان مگر پھر بھی انسیت ہو گئی تھی۔

''غیر کی چیز سے دستبرداری پر اتنا دکھ کیوں......کون سا یہ در و دیوار میرے تھے۔'' اس نے خود کو بہلایا۔ مالک مکان کے کہنے پر گھر خالی کرنا تھا' اپنا آشیانہ کسی اور پرائے شجر پر بسانا تھا' ہائے یہ پرائے شجر بھی......عزیز کیوں ہو جاتے ہیں۔

بھوک کا جوگ ایک عورت کو اتنا اندروں اندر ختم نہیں کرتا جتنا کہ اپنے گھر کی چاہت...... چاہے و[ہ] مٹی کا ہو......گھاس پھونس کا جھونپڑ ہو......مگر اس ک[ا] ہو۔

''آہ......کتنی مفلس ہو تم......اس کے گرد رقص کرتی محرومی اس کا منہ چڑاتے ہوئے اس کی اوڑھنی سے لپٹنے لگی...... اس نے لاشعوری طور پر اوڑھنی ک[و] جسم سے اتار کر زور سے جھٹکا......شاید کم مائیگی کے احساس کو جھٹکنا چاہتی تھی کہ ابھی اسے ہمت ک[ی]

ضرورت تھی، بہت سے حوصلے کی......

اور یہ احساس محرومی جب جب اس کے دل کو جکڑتا اس کی ہمت ڈھیر ہونے لگتی، اسے لگتا اس کے کندن جسم سے حوصلوں کی چٹان کسی آتش فشاں کی زد میں آ کر پھٹ پڑے گا اور پھر وہ امید ہار جائے گی......

اچھے وقت کی امید...... اپنے تشنہ خوابوں کے تعبیر کی امید...... جو جگنو کی طرح اس کی آنکھوں میں جگمگاتے تھے......حالات بدلنے کے خواب...... کہ کبھی خود کو سنوار کر اس کا ہاتھ بھی دینے والا ہوگا، جب اس کے دل میں غریبوں کے لیے بہت سا درد ہوگا اور ہاتھ میں بہت سے پیسے......

اس نے دوبارہ سے اپنی اوڑھنی کو اپنے بوجھل ہوتے وجود پر لپیٹا اور منہ ڈھانپنے دونوں بچوں کو لیے باہر آئی۔

کرائے کا گھر کہیں دیکھنا تھا میاں تو مزدور تھا اپنے کام سے ہلکان وہ ان بکھیڑوں کو کیسے نپٹاتا، آمدنی محدود دو بچے، دونوں کو پیٹ کاٹ کر پڑھا رہی تھی۔ گھر بھی اپنا نہیں تھا۔ کرائے کے گھر میں غربت کو چھپائے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے یہ جوڑا زندگی کو برتنے کی کوشش میں ہی ہلکان ہوا جاتا۔ تشنہ خوابوں کے جوت دونوں کی آنکھوں میں جلتے مگر مایوسی کے اندھیرے میں تعبیر کی امید دھندلا جاتی......

ایک کے بعد ایک آزمائش مسکراتی ہوئی ان کی دہلیز پر بن بلائے چلی آتی تھی۔

''کوئی کرائے کا گھر خالی ہے؟ سنیے کوئی چھوٹا سا گھر کرائے پر مل جائے گا۔'' گھر گھر کی ٹھوکر کھاتی چل رہی تھی کہاں کہاں نہیں پوچھا تھا۔ کبھی کی شاہانہ طبیعت جو کہ اب دل کے تاج محل سمیت ہی کہیں دفن ہو چکی تھی۔

ٹوٹی پھوٹی رہنے کے لیے بدتر جگہ دیکھ کر زندگی کا تاثر دیتی اندر سے سر اٹھانے لگی، اعتراض...... یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ اس نے دل کو سختی سے ڈپٹ



کر چپ کرایا ہمت مجتمع کی کرایہ پوچھا مالک مکان نے بے نیازی سے جتنا کرایہ بتایا اس کے اوسان خطا ہو گئے' ایسے گھر کا اتنا کرایہ...... کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک کمرے کے لیے اور اپنے مزاج کے برخلاف گھر کے لیے بھی وہ دردر کی ٹھوکر کھائے گی اور اپنی آمدنی دیکھ کر کرایہ کم کرانے کے لیے کیسے کیسے لوگوں کے مزاج کی گرمی کو ضبط کرے گی۔ ازل سے مقدر جو نہ تھی غربت...... ہاں اب جو چمٹی تھی تو گھن کی طرح کھائے جاتی تھی۔

''خالہ سنا ہے آپ کا مکان کرائے کے لیے خالی ہے؟'' وہ ابھی اپنی ایک جاننے والی عزیزہ کے گھر بیٹھی تھی بڑی امید سے گھر پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

گھر کیا تھا...... چار دیواری کے اندر چار کمرے تھے...... اکیلی رہنے والی خالہ کا ذرا بڑا اور ہوا دار کمرہ...... باقی تینوں کمرے دڑبے نما تھے...... ساتھ چھوٹے چھوٹے کچن ...... اور خالہ کے کمرے میں اٹیچ باتھ روم کے علاوہ باہر ایک باتھ روم گویا کہ عوامی باتھ روم بنایا گیا تھا۔ دونوں کرائے دار وہ باتھ روم استعمال کرتے تھے تیسرے کرائے دار کے لیے بھی وہی باتھ روم تھا۔

اس کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت سا تھا...... لیکن جب قسمت نے ہی گدڑی کا ایسا پھیکا اور بدرنگ لعل بنا کر ٹانکا تھا کہ جوہری کے مانند خوش بختی اس پر نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی۔ خالہ نے بے نیازی سے کہا۔

''نہیں بابو تم کدھر دے سکوگی۔''

''اس ایک کمرے کا بھلا کتنا کرایہ تھا۔'' وہ پوچھ بیٹھی۔

''چار ہزار کرایہ...... بجلی اور گیس کا بل الگ سے...... جو بل بھی آئے گا وہ سب کرائے دار مل کر دیں گے۔''

''خالہ بجلی کا بل کتنا آتا ہوگا؟'' اس نے منمنا کر پوچھا۔

''پچھلے ماہ پندرہ ہزار آ گیا تھا نگوڑ ماروں کا کچھ پتہ تھوڑی ہوتا ہے بس اٹھا کر لکھ دیتے ہیں ہزاروں میں۔''

وہ ٹھٹک گئی اس کے پاس تو واشنگ تک نہیں تھی پھر ایک کمرے کے بلب اور پنکھے کا بھلا وہ اتنے زیادہ بل میں کیسے حصہ بٹاتی...... چپ چاپ اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

کمرے میں پھیلی ملگجی روشنی میں بیمار زدہ پنکھا اپنی بساط کے مطابق ہوا دے رہا تھا' وہ آنکھ پر ہاتھ رکھے جانے کون کون سے درد کو بچوں سے چھپاتے ہوئے ضبط کرنے لگی۔

ورنہ دل کسی معصوم بچے کی طرح بلک بلک کر رونا چاہتا تھا...... ایسا رونا کہ بوجھل وجود سے ہر درد روٹھ جائے' آنکھوں میں دیپ بنے خواب مٹ جائیں۔

''ہم غریبوں کی زندگی تو پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ بے وقعت ہوتی ہے۔'' دل میں تلخی ابھری۔

''غریب شجر کے سوکھے پتے کی طرح زیست کے قدموں میں کچلا جاتا ہے...... آہ......'' بائیں بازو میں عجیب سا درد اٹھ رہا تھا...... وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بچے بھی کافی خاموش سے تھے' چھوٹا بیٹا اپنا من پسند کھیل کھیل رہا تھا...... ماچس کی تیلیوں سے گھر بنانا اس کا محبوب مشغلہ تھا...... وہ جو بچوں کو کبھی یاسیت کا شکار نہیں ہونے دیتی تھی...... ان کے اندر اعتماد کی کونپل کھلاتی۔

اور وہ ہی آج بچے کا یہ کھیل دیکھ کر شدید یاسیت

کے شکنجے میں آ گئی۔
''کیا میرے بچے بھی محرومی کے سائے تلے یوں ہی پلیں گے...... کیوں نہ میں ان کی آنکھوں میں دیے کی مانند جلتے خوابوں کو نوچ ڈالوں کہ تشنہ تعبیر کے خوف سے آزاد ہو جائیں۔'' وحشت سی وحشت تھی۔

سائیں وے! میں ڈھیر غماں داڈھواں
دل کرداائے میں بوہے اگے
کُوکاں مار کے رروواں

ضبط کے بعد اب آنسوؤں کو رستہ مل گیا تھا...... ڈھلکے ہوئے گالوں پر قطار در قطار یوں پھسلتے جاتے جیسے کسی بھٹکے کو رستہ مل جائے۔
''امی جی گھر تیار......'' بیٹے کی چہکتی آواز کانوں میں پڑی تھی چھوٹا سا تیلیوں سے بنا گھر اس کے سامنے تھا......
سات سالہ بٹی ماں کے احساسات کو بس ٹکر ٹکر دیکھے جاتی تھی۔ وہ کسی پاگل وحشی کی طرح ماچس کی خالی ڈبیہ پر لپکی اور ایک ماچس دھکا کر آن کی آن میں بچے کی محنت کو سلگا دیا۔ ماچس سے بنا گھر اپنی ہی آگ میں جلنے لگا۔ بچہ وحشت زدہ ہو کر ماں کے ربط تیز جملے سن رہا تھا۔
''کوئی گھر نہیں...... ایک تنکے جیسے گھر کی اوقات نہیں ہماری۔'' ہذیانی انداز میں وہ چیخ رہی تھی۔
''اتنی بڑی دنیا میں ہمارے لیے کچھ نہیں رکھا ہوا۔''
''سنا تم دونوں نے......'' آواز بلند ہو گئی۔ دونوں کو قریب کر کے تھوڑی سے جکڑ لیا۔
''امید مت لگاؤ خواب مت دیکھو...... آنکھیں بنجر ہو جائیں گی...... ہاتھ کچھ نہ آئے گا میرے بچوں......'' نڈھال سی بیٹھ گئی...... آج کتنی وحشت تھی اس کے لہجے میں۔
''ہم کبھی مقام حاصل نہیں کر سکیں گے......'' تلخی سے کہتی وہی عورت ابھی کتنی عام سی لگ رہی تھی جو اپنے بچوں کو خواب سلامت رکھنے کا درس دیتی۔ بیٹا خوفزدہ ہو کر ماں کا نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ بیٹی خوفزدہ نہیں تھی مگر ماں کی حالت پر دکھی سی تھی۔
''اماں......'' پاگل وحشی جذبے پر پھوار کی مانند بیٹی کی نرم آواز پڑی۔ کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
''کیا ہم بھی احساس کمتری کی گود میں پروان چڑھیں گے...... نہیں اماں...... کل استانی جی نے ایک بات بتائی ہے۔'' وہ بے زاری سے بیٹی کو دیکھے گی۔
''اماں...... اللہ پاک نے غریب کو غریب اس لیے نہیں بنایا کہ اس کی تحقیر ہو بلکہ یقیناً اس پر صبر کرنے والوں کو اپنے خاص انعام سے نوازے گا...... اماں پھر یہ غربت تو عارضی ہوئی نہ۔'' بہت جذب اور یقین کے ساتھ بتاتے ہوئے بیٹی کی چمکتی آنکھوں میں دو قطرے ستارہ بن کر جھلملانے لگے۔ آواز رندھ گئی تھی مگر لہجے میں حوصلہ تھا یقین تھا۔
''اماں ہمیں ان آزمائشوں کا انعام ضرور ملے گا۔''
وہ بیٹی کے گلے لگ کر معصوم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''اماں خواب ٹوٹنے تو نہیں چاہئیں نہ؟'' بیٹی کی امید بھری سرگوشی ابھری۔ اس نے بچوں کو بے ساختہ اپنے قریب کر کے زور سے بھینچا۔ انہیں چومتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔
''ہاں خواب سلامت رکھو خواب ٹوٹنے نہ پائیں کہ مفلس کے جینے کا سہارا ہی خواب ہیں۔''

مکمل ناول

زارا رضوان

رمزِ ہجر و وصل

(پہلی قسط)

محبت اب اور نہیں کہنے والا شخص زندگی کے ایسے موڑ پر آ جاتا ہے جہاں اُسے کہنا پڑتا ہے کہ ایک محبت اور سہی۔ ایسی محبت جس نے اُسے رمزِ وصل کی لذت سے آشنا کیا۔ جس کے وصل نے سمجھایا محبت میں ضد، اَنا، بغاوت نہیں ہوتی۔ محبت بس محبت ہوتی ہے شرطوں کی قید سے آزاد......

داستانِ محبت ایک ایسے اِنسان کی جس نے رمزِ ہجر و وَصل کا مزا چکھا۔ جس نے اپنی زندگی کی اکائیوں میں رموز کی وادیوں میں قدم رکھا۔ ایسا شخص جس نے پہلے محبت کی پھر ہجرِ محبت کو سہا۔ جو رمزِ ہجر کو سمجھتا ہے۔ محبت کو بچھڑتے دیکھا، مرتے دیکھا، ہجرِ بیکراں کیا ہے اُس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے جس پر خوشیاں حرام ہو گئی ہوں۔ جہاں یادوں کا ناگ پھن پھیلائے ہر وقت ڈستا رہتا ہو وہاں خوشیاں کیسے جی سکتی ہیں، ہر دِن قیامت ہو اور ہر رات عذاب۔

محبت اب اور نہیں کہنے والا شخص زندگی کے ایسے موڑ پر آ جاتا ہے جہاں اُسے کہنا پڑتا ہے کہ ایک محبت اور سہی۔ ایسی محبت جس نے اُسے رمزِ وَصل کی لذت سے آشنا کیا۔ جس کے وصل نے سمجھایا محبت میں ضد، اَنا، بغاوت نہیں ہوتی۔ محبت بس محبت ہوتی ہے شرطوں کی قید سے آزاد۔ ذات پات، رنگ نسل، امیری غریبی اور عمر کی قید سے ماورا۔

''تم ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہو بلکہ بہت اچھے لگتے ہو۔ ہمیشہ ہنستے رہا کرو۔ اور دیکھو غصہ مت کیا کرو۔ تم پر بالکل سوٹ نہیں کرتا۔'' ماضی کے کسی کونے سے آتی یہ آواز کان میں پڑتے ہی وہ آنکھیں کھول کر بیٹھ گیا۔

''لو جی......غصہ نہ ہوگیا پینٹ سوٹ ہوگیا جو سوٹ نہیں کرتا۔'' مترنم ہنسی چاروں طرف پھول بکھیر گئی۔

''مجھے خوش رہنا ہے، مجھے بس مسکرانا ہے۔'' آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے خود سے کہا اور گاڑی کی چابی اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ خوش رہنے کے لیے مصروفیت ضروری تھی ورنہ شکستگی، اُداسی، یاسیت، ویرانگی اور تنہائی کا ناگ اُس کو ڈس لیتا۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم! کیسی ہو؟ آ گئی شادی کھا کر؟''

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ٹھاک۔ آپ سنایئے۔ یاد آ گئی ہماری۔'' ہنستے ہوئے مہرین کی سیاہ لمبی گھنی پلکیں پل کو اُٹھیں۔ وہ دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو چکی تھی۔

''بھولے کب تھے جناب۔ خیر سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ کہیں گئے ہیں کیا؟'' اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

''ابو کام پر گئے ہیں۔ بھابھی رانیہ کو سلا رہی ہیں اور امی دوا کھا کر سوئی ہیں۔ آپ بیٹھیں میں پانی لائی۔'' اُس نے منہ سے دھاگہ توڑتے ہوئے بتایا۔ رُومال کو



سائیڈ پر رکھا اور پانی لینے چلی گئی۔
''شکریہ جناب۔'' پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے بولا تو مہرین کی ہنسی گہری ہوگئی۔ اُس کا طرزِ مخاطب مہرین کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ خوش مزاج، دوستانہ رویہ، سب سے گھل مل جانیوالا زندگی سے بھرپور شخص لیکن جب کبھی لاپرواہی برتتا یا اُس کے میسج کا جواب نہ دیتا تو وہ پہروں کڑھتی رہتی۔ اپنے اور اُس کے رِشتے کے درمیان فرق جانتی تھی پھر بھی جانے انجانے وہ اُس کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔
''اچھا میں چلتا ہوں۔ سب کو سلام کہنا۔ چاچو سے فون پر بات کر لونگا۔'' پانی کا گلاس تھما کر اُٹھتے ہوئے بولا۔
''تھوڑی دیر بیٹھ جاتے۔ بھابھی اور امی سے مل کر جایئے گا۔ کھانا تیار ہے بس گرم ہی کرنا ہے۔'' اُس نے روکنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتی تھی کچھ دیر اور بیٹھتا۔
''پھر کبھی صحیح۔ یہاں کسی کام سے آیا تھا تو سوچا تم لوگوں سے مل لوں۔ او کے چلتا ہوں۔ ٹیک کیئر۔ اللہ حافظ۔''
''اللہ حافظ۔'' وہ چلا گیا۔ مہرین گلی کے کونے تک اُس کو جاتا دیکھتی رہی جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا وہ اندر نہ گئی۔

☆......☆......☆

ہم تو عشق کے ''ع'' میں ایسے اُلجھے کہ عیب دار ہوئے
جو عشق کے ''ق'' تک گئے شاید انہوں نے قیامت ڈھائی ہوگی

''عشق کے قاف تک پہنچ جانے کے بعد ہر حرف ختم ہو جاتا ہے۔ سب ہیچ لگتا ہے۔'' اُس نے مہرین کے بھیجے گئے میسج کا جواب دیا۔ مہرین کے چہرے پر دھنک کے رنگ بکھر گئے، سب رنگ محبت کے، چاہت کے، اپنائیت کے۔
''آپ نے قاف پر ریسرچ کی ہے کیا؟'' بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔ وہ بات لمبی کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔

''ریسرچ کی ہوتی تو نامراد نہ ہوتا۔'' کافی دیر بعد جواب آیا۔ اُس کو میسج عجیب وغیر معمولی لگا۔
''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' میسج کا جواب نہ آیا۔ وہ ایسا ہی تھا وقت ملتا تو جواب دیتا ورنہ کئی گھنٹوں بعد جواب آتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی کال آئی۔ چوہدری حفیظ علی نے بات کر کے فون مہرین کو تھما دیا۔ وہ فون لے کر چھت پر چلی گئی تاکہ بات کر سکے۔
''آپ نے لاسٹ میسج کا جواب نہیں دیا۔'' سلام دُعا کے فوراً بعد پوچھ لیا۔
''جواب دینا ضروری نہیں تھا۔ اِس لیے نہیں دیا۔'' لاپرواہ لہجہ مہرین کو سلگا گیا۔
''چلیں مرضی آپ کی۔ نہ دیں جواب۔'' نروٹھے پن سے بولی۔
''ایک تو تم برابڑی جلدی مان جاتی ہو۔'' اُس کے بچپنے پر وہ ہنس پڑا۔
''ہر بات کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ کوئی بات تو تھی جو آپ کہنا چاہتے تھے پھر رُک کیوں گئے۔ اگر بات کی تھی تو بتا بھی دیتے۔ ورنہ بات ہی نہ کرتے۔'' نروٹھے پن سے بولی تو اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔
''کیا بات کروں۔ تم کیا سمجھوگی۔''
''سمجھ ہے مجھ میں۔ ہر بات سمجھ جاتی ہوں۔''
''لیکن میری باتیں سمجھنے کے لیے ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔''
''اب اِتنی بھی چھوٹی نہیں۔ سترہ سال کی ہوں۔ ہر بات سمجھتی ہوں آپ کر کے تو دیکھیں۔'' وہ ہنس پڑا۔
''میں تم سے اپنی باتیں کیوں شیئر کروں؟ ہم کزنز ضرور ہیں لیکن ہمارے درمیان ایک اور رِشتہ بھی ہے جس میں عزت و احترام لازم ہے۔'' اُس نے کہا تو مہرین کا حلق کڑوا ہوگیا۔ جس رِشتے کا حوالہ دیا اُس سے مہرین کو چڑ تھی۔
''عزت و احترام کے دائرے میں رہ کر بات کی جا سکتی ہے۔'' وہ لاجواب ہوگیا۔
''پھر کبھی صحیح۔'' اُس نے ٹال دیا۔
''ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ ہنہ۔ صاف صاف منع کر

دیں نہیں شیئر نہیں کر سکتے۔'' وہ تپ گئی۔

''میری باتوں کو سمجھنے کے لیے میچورٹی چاہیے جو تم میں ہے نہیں۔ رکھتا ہوں فون۔ کچھ کام ہے۔ اللہ حافظ۔'' ایکدم سرد ہو گیا۔ ٹکا سا جواب دے کر اللہ حافظ کا جواب سنے بغیر فون کاٹ دیا۔ وہ کتنی دیر جلتی رہی۔

''میں ہی پاگل ہوں جو سب باتیں شیئر کرتی ہوں۔ اب میں بات ہی نہیں کرونگی۔ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ ہنہ۔'' وہ دِل ہی دِل میں خود سے مخاطب تھی۔

ہاشم اُس کا تایا زاد تھا۔ خاندانی چپقلش اور جائیداد کے تنازعے کی وجہ سے دونوں کے والد کی بول چال بند تھی۔ مہرین اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ سولہ سال! مہرین سے ملے اُسے بمشکل ایک ڈیڑھ سال ہوا تھا جب اُن کے دادا کا اِنتقال ہوا۔ دونوں بھائیوں میں صلح ہو گئی۔ چوہدری وجاہت نے اپنے بھائی حفیظ سے مہرین کا ہاتھ چھوٹے بیٹے عاصم کے لیے مانگ لیا۔ عاصم کا بڑا بھائی ہاشم ہر ماہ دو ماہ بعد وہ چوہدری حفیظ احمد کے گھر چکر لگاتا یا جب بھی آفس ورک کے سلسلے میں لاہور چکر لگتا تو وہ لازمی ملنے جاتا خواہ آدھے گھنٹے کے لیے بیٹھنا پڑتا۔ مہرین سے نوک جھونک چلتی، خدیجہ بھابھی سے گپیں لگاتا، چوہدری حفیظ سے حالاتِ حاضرہ پر بات چیت کرتا، شکیل سے روزمرّہ کی گفتگو۔ وہ جانے انجانے میں مہرین کے دِل میں جگہ بناتا چلا گیا اور وہ کچھ نہ کر سکی یہ بھی بھول گئی کہ وہ اُس کے بھائی سے منسوب ہے۔

محبت کے آکٹوپس نے اُس کے دِل پر گہرے پنجے گاڑھ دیئے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُس کا خیال، اُس کی سوچ، اُس کی فکر، اُس کی باتیں!! محبت کے ڈنک کا اِتراق کسی کے پاس نہیں۔ محبوب کا ساتھ زندگی کی نوید!! محبوب طبیب، محبوب دوا!!!

''یہ حیثیت ہے میری۔'' دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے میسج کیا ساتھ میں غمگین کا آئکون بنایا۔

''تمہاری حیثیت تم سے بہتر کون جان سکتا ہے مہر؟ اگر کوئی حیثیت نہ ہوتی تو کبھی بھی پاپا عاصم کے لیے تمہارا ہاتھ نہ مانگتے۔'' عاصم کے نام پر اُس کا حلق کڑوا ہو گیا۔

''ہر بات پر اُس کا ذکر۔ ہم اپنی بات نہیں کر سکتے کیا؟ ایسی بات جس میں ہم دونوں کا ذکر ہو؟'' جلد بازی میں میسج کر تو دیا بعد میں پچھتائی۔ اُسے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

''آپ کا بھائی آپ کی طرح کیوں نہیں ہنس مکھ، ملنسار، گھلنے ملنے والا۔ وہ ایک بار بھی یہاں نہیں آیا نہ کسی سے ملا۔ ہم لوگ دو بار گئے آپ کے گھر مگر اُس نے سیدھے طریقے سے بات نہیں کی۔'' جان بوجھ کر دوسرا میسج کیا تا کہ پہلے میسج کی تلافی کر سکے۔

''وہ ایسا ہی ہے سنجیدہ، اپنے آپ میں رہنے والا۔ کم کم ہی کہیں جاتا ہے۔''

''اپنی منگیتر سے بات کرنے میں تو کچھ نہیں جاتا۔ اور آپ۔ آپ تو ایسے نہیں ہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں لونگ، کیئرنگ۔ اپنے اپنے سے''

''تم کونسا مجھے زیادہ جانتی ہو۔ ابھی ایک ڈیڑھ ڈھائی سال ہوا ہے ملے۔ گھڑی دو گھڑی بات ہوتی ہے اِس میں کیسے جج کر سکتی ہوں کہ میں اچھا ہوں۔''

''کسی کو جاننے کے لیے ایک پل کافی ہوتا ہے۔'' مہرین کے کہنے پر ہاشم نے قہقہہ لگایا۔

''واہ جی واہ! ایک پل کافی ہوتا ہے جاننے کے لیے۔ یہاں ایک دوسرے کو سمجھنے میں زمانے بیت جاتے ہیں اور تم بات کر رہی ہو ایک پل کی۔ آئی وَڈی ماہرِ نفسیات۔'' تیرہ منٹ بعد میسج کیا وہ بھی سڑا ہوا جسے دیکھ کر مہرین جل کر رہ گئی۔

''کسی کو سمجھنے کے لیے ماہرِ نفسیات ہونا لازمی نہیں۔'' وہ اِتنا ہی لکھ سکی۔

''بظاہر میں سب کیساتھ ایسا ہی ہوں مہر۔ لیکن حقیقت برعکس ہے۔ میں فطرتاً جھگڑالو اور غصے والا ہوں جو ہمارے خاندان کا خاصہ ہے۔ جو روپ تم دیکھتی ہو وہ ایک خول ہے جو میں نے چڑھا رکھا ہے۔ اصل روپ دیکھ لو تو کانوں کو ہاتھ لگاؤ کہ اِتنا لڑاکا بندہ۔''

''میں نہیں مانتی۔ آپ ایسے ہو ہی نہیں سکتے۔ بالفرض ہیں بھی تو عاصم سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

''اُس سے لاکھ درجے بہتر ہوں یا ہزار درجے بدتر۔ ہوگا تو تمہارا جیٹھ۔'' مہرین کڑھ کر رہ گئی۔ کوئی جواب نہ بن پایا۔ کیا کہتی حقیقت یہی ہے جسے وہ تسلیم کرنا نہیں چاہتی۔ موبائل سائیڈ پر رکھ کر اپنے لیے چائے بنانے چلی گئی۔

اُس کا دِل، دماغ، سوچیں ہاشم سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہو جاتیں۔ کیا پتہ ہاشم کی عاصم اُس کے دِل میں جگہ بنا لیتا لیکن دونوں خاندانوں کے ملنے سے دونوں کی بات چیت پکی ہونے تک اُس نے ایک بار بھی مہرین سے بات نہ کی تھی۔ ایک بار بھی اُن کے گھر نہ آیا تھا۔

''اِنسان جتنا بھی سنجیدہ، اپنے آپ میں رہنے والا ہو اپنی ہونیوالی شریکِ حیات سے بات تو کرتا ہے۔ مجھ سے نہ صحیح ابو یا بھائی سے بات کرنے میں کیا جاتا ہے اُس کا۔ کبھی ملنے بھی نہیں آیا۔ مغرور ہے یا وہ اِس رشتے پر راضی نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں جب ہم تایا ابو کے گھر گئے تھے سلام کے بعد کوئی بات تک نہ کی۔ مجھے دیکھا تک نہیں نہ ہم لوگوں کے پاس بیٹھا۔'' وہ اپنی بھابھی سے اُلجھ پڑی۔

''کیا پتہ اُس کی عادت ہو۔ کسی کی عادت تو نہیں بدل سکتے ہم۔'' خدیجہ نے سمجھایا۔

''جو بھی ہے' ہاشم بھائی جیسا کوئی نہیں' دیکھا نہیں کیسے ہر تیسرے دِن ابو کو فون کرتے ہیں، ہم سب سے بات کرتے ہیں۔'' خدیجہ اُس کے چہرے پر ہاشم نام کے رنگ دیکھ کر خاموش ہو جاتی۔

''عاصم سمجھدار، ذہین اور محنتی لڑکا ہے۔ اِس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میرا بھائی ہے بلکہ حقیقت یہی ہے۔ البتہ ریزرو رہنا اُس کی عادت ہے جس کو ہم نہیں بدل سکتے۔ ہاں تم چاہو تو شادی کے بعد اُس کو اپنے رنگ میں رنگ لینا یا اُس جیسی ہو جانا۔ تم پر ہے۔'' میسج کی بیپ ہوئی تو وہ چونکی۔

''میں رنگریز نہیں۔'' مختصر جواب دیا۔ یہ بھول گئی کہ بھابھی سے بات کر رہی تھی۔

''کسی نہ کسی کو تو بننا پڑتا ہے تاکہ اپنے رنگ میں رنگا جا سکے۔ بلکہ یہ تو وقت بتاتا ہے کون کس جیسا ہو جاتا ہے۔''

''مجھے اُن کو اپنے رنگ میں رنگنا ہے نہ خود اُن جیسی ہونا ہے۔ میں ایسے ہی بہت اچھی ہوں۔''

''خوش فہمی۔'' مختصر جواب! مہرین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے سوال کیا۔

''کیا آپ کو اچھی نہیں لگتی؟'' اُس ایک سوال میں بہت کچھ پنہاں تھا۔ اَن کہی محبت، دبے جذبے کی چنگاریاں، کچی عمر کی محبت!!

''تم اچھی ہو بھی عاصم کے لیے تمہارا اِنتخاب کیا ہے ورنہ ہمیں لڑکیوں کی کمی تھوڑی تھی۔'' ہاشم کے میسج نے اُس کو اندر تک سلگا دیا تھا۔ اُسے لگا وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔

وہ اُس کی آنکھوں میں آنیوالے رنگوں سے بے خبر نہیں تھا۔ کہتے ہیں عورت کے چہرے پر رنگ اس کی زندگی میں آنے والے مرد کی وجہ سے آتے ہیں۔ محبت کا رنگ، حیا کا رنگ، چاہت، اپنائیت وخلوص کا رنگ۔

مہرین نے میسج کی بجائے کال کرنا بہتر سمجھا۔ اُس کو مس بیل دی۔ تھوڑی دیر بعد کال آ گئی۔

''عاصم عاصم۔ کہیں نہ کہیں اُس کا ذکر آ جاتا ہے۔ اُس نے کبھی اِتنی دِلچسپی نہیں دِکھائی ہوگی میرے بارے میں بات کرتے وقت۔ اِن فیکٹ وہ تو میرا ذکر کرتا ہی نہ ہوگا۔'' سلام کیے بغیر تنک کر بات کرنے پر ہاشم کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''اچھا ہے نہ نہیں کرتا بات۔ اگر شادی سے پہلے بات کر لوگی تو شادی کے بعد بات کرنے کے لیے کیا بچے گا۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہوگے۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے سڑیل کا منہ تکنے کی۔ ہنہ۔'' مہرین نے سڑا ہوا جواب دیا۔

''لو کر لو گل۔ منہ تے تہانوں تکنا پے گا۔ شادی ہونی اے کوئی مذاق نئی (منہ تو تمہیں دیکھنا پڑے گا۔ شادی ہونی ہے کوئی مذاق نہیں)۔'' بہتر یہی تھا مہرین کی باتوں کو مذاق میں اُڑا دے۔

''کاش مذاق ہوتا۔'' مہرین نے افسردگی سے کہا۔

''مہر۔''

''جی۔''

''تمہیں عاصم سے اِتنی چڑ کیوں ہے؟ آئی مین ابھی سے تم اُس کے بارے میں اِسطرح سوچتی ہو۔ پوری لائف کیسے گزارو گی؟ تمہیں اس کے بارے میں مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔ ورنہ مشکل تمہی کو ہوگی۔'' ہاشم نے اُسے سمجھایا۔

''جس طرح مدِ مقابل کا رویہ ہوتا ہے ویسی ہے اگلے بندے کی سوچ ہوتی ہے۔ میں جان بوجھ کر اُس کے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کر رہی۔ اُس کا رویہ ایسا ہے کہ میں مثبت سوچ ہی نہیں سکتی۔ آپ کی سوچ، آپ کی باتیں، آپ کا دوستانہ و مخلص رویہ دیکھ کر وہ کہیں پیچھے چلا جاتا ہے۔'' مہرین نے صاف گوئی سے کہا۔

''یہیں پر غلطی کر رہی ہو۔ مجھے اُس کے ساتھ کمپیئر کرو گی تو وہ پیچھے رہے گا۔ دیکھو مہر اُس کا تمہارا سامنا اب تک ڈھنگ سے ہوا ہی نہیں وجہ اُس کی نیچر۔ منفی سوچوں کو نکال پھینکوں تا کہ شادی کے بعد لائف سیٹ ہونے میں آسانی ہو۔ بی پوزیٹیو، تھنک پوزیٹیو۔'' ہاشم نے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

''آئی وِل ٹرائی۔'' مہرین نے بے دِلی سے کہا۔ اُس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا وہ اِس رِشتے سے خوش نہیں ہے۔

اُسے لگا مہرین کو سچ بتا دینا چاہیے تا کہ وہ اپنے بڑھتے قدم روک لے۔ محبت کے چڑھتے رنگوں کو پکا ہونے سے پہلے اُسے کچھ کرنا تھا۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔

''ہیلو۔'' ہاشم نے تصدیق چاہی۔

''جی سن رہی ہوں۔''

''مہر تم کچھ جاننا چاہتی تھی؟۔''

''میں؟ کیا؟۔'' مہرین واقعی بھول چکی تھی۔ ایکدم یاد آنے پر بولی۔

''جی جی یاد آ گیا۔ آپ تو راضی نہیں تھے بتانے پر۔'' مہرین نے شکوہ کیا۔

''کچھ باتیں وقت پر کی جائیں تو اچھا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہی یہی وقت ہے کہ تم سے بات کرلوں۔'' مہرین کا دِل دھڑ کنے لگا۔

''جی کہیے۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''ابھی نہیں۔ میں تمہیں رات کو فون کرونگا۔ بلکہ جب تم بالکل فارغ ہو جاؤ مجھے مس بیل دینا۔'' مہرین نے اچھا کہا تو اُس نے اللہ حافظ کہتے ہی کال ختم کردی۔

مہرین بے تابی سے رات کا اِنتظار کرنے لگی۔ سارے کام جلدی جلدی نپٹائے۔ وہ اُس کی ذومعنی باتوں کا مطلب جاننا چاہتی تھی۔ کبھی اُسے لگتا وہ مہرین کو پسند کرتا ہے مگر عاصم کے حوالے سے کچھ کر نہیں سکتا۔ کبھی لگتا وہ کسی اور میں اِنٹرسٹڈ تھا، کس لڑکی کو پسند کرتا تھا جو اُس کو ملی نہیں یا شاید وہ مہرین ہی ہے تبھی وہ خود کو نامراد کہتا ہے۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار تھی۔ ایک ایسے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی جس سے باہر ہاشم ہی نکال سکتا تھا۔ گتھی کو ہاشم سلجھا سکتا تھا۔ آج اُسے اپنی باتوں کا جواب ملنا تھا۔ اِس بھنور سے نکلنا تھا، اِس کشمکش سے آزاد ہونا تھا۔

☆......☆......☆

''میں اور عنایہ فرسٹ ایئر سے ایک دوسرے کیساتھ تھے۔ دوستی کب محبت میں بدل گئی دونوں کو علم نہ ہوا۔ جانے انجانے میں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ چوہدری ہاشم وجاہت، چوہدری کبیر الٰہی، نبیل نواز، الوینہ واجد اور عنایہ ماجد۔ ایک ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں۔ ایک دوسرے سے مختلف مگر قریب ترین۔ الوینہ عنایہ کی تایا زاد تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ساتھ پڑھتی آ رہی تھیں۔ کالج میں کلاس فیلو ہونے کیساتھ ساتھ ایک دوسرے کی بیسٹ فرینڈ بھی تھیں۔ گریجویشن کے بعد سب دوست الگ الگ فیلڈ میں چلے گئے۔ رابطہ بہرحال قائم تھا۔ عنایہ نے ایم بی اے کے لیے ایڈمیشن لیا تو میں نے بھی جاب کیساتھ ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ مقصد ایک دوسرے کا ساتھ تھا۔ عنایہ کے گھر والے اُس کی شادی خالہ زاد سے کرنا چاہتے تھے پر وہ سنجیدہ نہ لے رہی تھی کیونکہ کامران کی جاب نہیں تھی اور اُس کے والدین بغیر جاب کے کبھی بھی اُس کی شادی نہ کرتے۔ میں نے عنایہ کے کہنے پر ایم بی

اے کیساتھ ساتھ جاب بھی شروع کر دی تا کہ کل کو رِشتہ بھیجوں تو اُس کے والدین کو اعتراض نہ ہو۔ زندگی اچھی جا رہی تھی لیکن کامران کی جاب نے سب بگاڑ دیا۔ اُس کی جاب لگتے ہی عنایہ کی خالہ باقاعدہ رِشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ جیسے ہی عنایہ نے مجھے مطلع کیا میں پریشان ہو گیا۔ مجھے لگا وقت آ گیا ہے کہ گھر میں بات کی جائے۔ یوں بھی میں برسرِ روزگار تھا۔ تنخواہ اچھی تھی۔ ایم بی اے کے بعد مزید ترقی ہو جاتی۔ وہ بول رہا تھا وہ سن رہی تھی۔

''لڑکی کی ذات؟'' ہاشم کی پوری بات سننے کے بعد اُس کی والدہ نے سوال کیا۔

''مغل۔''

''غیر برادری کی لڑکی ہے۔ تمہارے ابو کبھی نہیں مانیں گے۔ ہادیہ، سنیعہ، زنیرہ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے مگر جن سے رِشتہ ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہیں۔ غیر برادری سے کتنے اچھے رِشتے آئے مگر برادری کے چکر میں اِنٹر پاس بھتیجے کو دینا منظور کیا بھلے اُن کی نوکری اچھی ہے مگر تعلیم تو واجبی سی ہے۔ ڈاکٹر سعود کی بیوی کتنی خوش ہے اپنے گھر میں۔ کیا تھا تمہارے ابو ہادیہ کے لیے اُس کو ہاں کر دیتے۔ کیپٹن دِلشاد، تمہارا دوست نبیل، پروفیسر حقدار کا بیٹا شاہنواز۔ کون کون سے رِشتے گنواؤں تمہیں جبکہ تم سب جانتے ہو۔ میں اپنی بچیوں کے لیے بات نہیں کر سکی اور تم کہتے ہو میں تمہارے لیے بات کروں؟ وہ تو جیسے مان جائیں گے۔'' نزہت وجاہت کی پھیکی مسکراہٹ کے اُن کی کمزوری کو عیاں کر رہی تھی۔ ہاشم سمجھ سکتا تھا وہ خود مجبور ہیں۔ اپنے خاندان والوں کا عورتوں سے سلوک بچپن سے ہی دیکھتا آ رہا تھا۔ ساس سسر، نند و شوہر کے نزدیک بہو کی حیثیت اُس سے پوشیدہ نہیں تھی۔

''امی دانیال اچھا لڑکا ہے۔ بچپن سے دیکھا بھالا ہے سب سے بڑھ کر پھپھو ہادیہ کو بہت پیار کرتی ہیں۔ ہماری ہادیہ وہاں خوش رہے گی۔ اِس لیے اُس کی طرف سے خدشات نکال دیں۔'' ہاشم نے ماں کو سمجھایا۔

''اپنے ہیں بھی تو دِل مطمئن ہے۔ کبھی سوچتی ہوں بچیاں یہ نہ کہیں کہ تعلیم دِلوا کر کم تعلیم یافتہ سے شادی کیوں کر دی۔'' دِل کی بات زبان پر لے آئیں۔

''اللہ اکبر! تسی وی کی سوچی جاندے او۔ (آپ بھی کیا سوچی جاتی ہیں) آپ کی بیٹیاں فرمانبردار، سمجھدار اور سعادت مند ہیں۔ وہ ایسی کوئی فالتو بات نہیں سوچ سکتیں۔ وہ جانتی ہیں پاپا اُن کے لیے کبھی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' نزہت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں کی گل کرن آیا سی تسی وی نہ (میں کیا بات کرنے آیا تھا۔ آپ بھی نہ)۔'' ہاشم نے کہا اور چلا گیا۔ جانتا تھا یہاں دال گلنے والی نہیں۔

بہت سوچ بچار کر کے ہمت کر کی اور عنایہ کے گھر گیا۔ اپنا مدعا پیش کیا۔ تین بھائی ایک ساتھ لائن سے لگے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ لمبے چوڑے، گھنی گھنی مونچھوں والا گھبرو جوان۔ ہاشم نے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے پانی کا گلاس ایک گھونٹ میں ختم کیا۔ ایسا نہیں تھا وہ ڈر گیا تھا۔ بلکہ اُسے وہ بات کرتے مشکل آ رہی تھی جو اصولاً والدین کو کرنی چاہیے۔

''دیکھو برخوردار! تم ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ لگتے ہو۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ تم والدین کے ہمراہ آتے؟'' عنایہ کے والد پروفیسر ماجد غنی نے بغور اُس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''انکل بات یہ ہے کہ میری فیملی آؤٹ آف کاسٹ شادی نہیں کرتی۔ میں نے اپنے والدین سے بات کی تھی مگر۔'' اُس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ پروفیسر ماجد سمجھ چکے تھے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ویسے عنایہ نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ اُس کی نسبت خالہ زاد سے طے ہے۔'' عنایہ کی والدہ نے کہا۔ اُس کو اچھو لگ گیا۔

''جی آنٹی بتایا۔ مگر وہ اِس رِشتے سے۔ آئی مین ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ لوگ بھروسہ کیجیے۔ میں عنایہ کو خوش رکھونگا بلکہ بہت خوش رکھونگا۔ میری جاب اچھی ہے ترقی کے چانسز ہیں۔'' اُس نے اپنے تئیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارے پیرنٹس راضی نہیں ہیں۔ اُس گھر میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ رکھ لیں۔ پھر کہاں رہو گے؟

اگر کھو کرائے کے مکان میں۔ تو اُس کے لیے ہرگز ہم نہیں مانیں گے۔'' پروفیسر ماجد نے کہا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں زبیر کے پاپا۔ دیکھو بیٹا تمہیں بتا چکی ہوں عنایہ کے لیے میری بہن نے ہاتھ مانگا ہے۔ بلکہ عنایہ کی پیدائش پر ہی اُنہوں نے کامران کے لیے عنایہ کو مانگ لیا تھا۔ باقاعدہ منگنی کے لیے وہ ایک آدھ ہفتے تک تشریف لانے والی ہیں۔''

''آنٹی یہ آپ لوگوں کی خواہش ہے نہ کہ عنایہ کی۔ میں اُس کے کہنے پر آیا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رہی بات کرائے کے مکان کی تو میرا ذاتی گھر موجود ہے جو پاپا نے میرے نام کیا ہوا ہے۔''

''دیکھیں ہاشم ہمیں اعتراض نہیں کہ عنایہ اور تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ لیکن ہماری مجبوری ہے کہ ہم اپنی بہن کی شادی بغیر تمہارے والدین کی رضامندی کے نہیں کر سکتے۔ عنایہ کا ہاتھ چاہیے تو پیرنٹس تو راضی کرنا ہوگا تا کہ وہ عزت سے آ کر ہماری بہن کو بیاہ کر لے جائیں۔'' عنایہ کے چھوٹے بھائی احسن نے کہا۔

''دیکھو بیٹا شادی دو لوگوں نہیں دو گھروں کی ہوتی ہے، دو خاندانوں کی ہوتی ہے۔ عنایہ سے شادی کر کے تم اپنے والدین سے دُور ہو جاؤ گے۔ بالفرض ابھی وہ مان بھی جائیں تمہیں قبول کر لیں لیکن عنایہ کو قبول نہیں کر سکیں گے۔ اُس کو وہ مقام و عزت نہ مل سکے گا جو ایک بہو کا حق ہے۔ تم زندگی کو اپنے نظریے سے دیکھ رہے ہو ہماری نظر سے دیکھو اور دُور تک جاؤ۔ پھر بتانا عنایہ کا تمہارے گھر میں کیا مقام ہے، کیا مقام ہو سکتا ہے یا کیا مقام ہوگا۔'' پروفیسر ماجد نے رسانیت سے کہا۔ ہاشم اُن کی باتوں کو سمجھ سکتا تھا۔ اُن لوگوں کی ہر بات درست تھی۔ اُس کے والدین کبھی بھی عنایہ کو نہیں اپنائیں گے نہ عزت و مقام دیں گے۔ آج، کل نہ کبھی۔ ذات پات کے مارے لوگ۔

''انکل عنایہ کو میں عزت کیساتھ اپنانے آیا ہوں اور بہت اُمید لے کر آیا ہوں۔ آپ لوگ ماشاء اللہ ویل ایجوکیٹڈ ہیں سمجھ سکتے ہیں سب باتوں کو۔''

''خیر سے تعلق تو تمہارا بھی ایک پڑھی لکھی باشعور فیملی سے ہے برخوردار۔ پھر بھی تمہارے پیرنٹس ذات برادری کو مانتے ہیں۔ پڑھ لکھ جانے سے اگر فطرت بدل جائے تو ہمارا معاشرہ مثالی معاشرہ نہ بن جائے۔'' پروفیسر ماجد نے کہا اور ویل چیئر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے جس کا صاف مطلب تھا وہ مزید سمجھانے یا بات چیت کے موڈ میں نہیں ہیں۔

''میرے خیال میں آپ کو جواب مل چکا ہے۔'' احسن نے کہتے ہوئے ہاتھ سے باہر کی طرف اِشارہ کیا جسکا مطلب تھا تم جا سکتے ہو۔

''تھوڑا وقت دے دیں تا کہ میں اپنے والد سے بات کر کے اُن کو راضی کر سکوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے عنایہ کا خیال دِل سے نکال دینا بہتر ہوگا۔'' مسز ماجد نے صاف لفظوں سے منع کر دیا۔

''کیا میں عنایہ سے مل سکتا ہوں؟'' کھڑے ہوتے بولا۔

''کس لیے ملنا ہے؟ جب ماما نے منع کر دیا ہے کہ بھول جاؤ تو مطلب ہے بھول جاؤ۔ جا سکتے ہو۔'' عنایہ کے بڑے بھائی شبیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک بار بات کر لوں پھر چلا جاؤنگا۔'' ہاشم ڈٹ گیا۔

''دیکھو میں بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔ اب سیدھی طرح چلتے بنو ورنہ۔'' شبیر نے سختی سے کہا تو ہاشم نے شدتِ ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''تمیز کیساتھ بھائی۔ میں نے کوئی فرمائش نہیں کی جس پر آپ اِتنا بل کھا رہے ہیں۔''

''تم مجھے تمیز سکھاؤ گے؟ مجھے؟ شبیر ماجد غنی کو۔ تم ہو کیا شے؟'' ہاشم کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے سے لگتا نہ تھا کہ پروفیسر صاحب کا بیٹا ہے۔

''شے تو میں بہت بڑی ہوں۔ عنایہ کے بھائی نہ ہوتے تو بتا تا کیا شے ہوں میں۔'' ہاشم کو بھی غصہ آ گیا۔ آخر کو چوہدریوں کا خون تھا کیسے نہ جوش مارتا۔

''چل۔ چل بتا۔ کیا چیز ہے۔ میں کھڑا ہوں۔ شاباش بتا۔'' شبیر نے دونوں ہاتھ سینے کے گرد باندھ

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر لسٹ 2019ء

1	جنوری	تلافی	فائزہ مشتاق
2	فروری	منافق	ثمینہ مشتاق
3	مارچ	کھڑکی	عقیلہ حق
4	اپریل	پیپ	ثمینہ مشتاق
5	مئی	حی لا یزل	فرح اسلم قریشی
6	جون	بازگشت	کاوش صدیقی
7	جولائی	آخری یقین/ دکھ	ثمینہ مشتاق/ حافظہ مون بخاری
8	اگست	سرمژگاں	ثمینہ عرفان راجپوت
9	ستمبر	عورت، سمندر اور میں	نسیم سکینہ صدف
10	اکتوبر	گستاخ دل	ڈاکٹر نعمان اسحاق
11	نومبر	گمان/ جہاندیدہ	افتخار چوہدری/ ڈاکٹر عزیزہ انجم
12	دسمبر	مسیحائی	افسر سلطانہ

لیے۔ ہاشم مکا بنا کر آگے بڑھنے کو ہی تھا کہ احسن نے پکڑا۔

"آر یو ان سینس؟ وہ غصے میں ہے آپ ہی تحمل سے کام لیں۔" احسن نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"تحمل سے کام لوں؟ تم دیکھ نہیں رہے ہمارے گھر پر کھڑا ہو کر ہم ہی سے بدمعاشی کر رہا ہے۔" شبیر نے کہا۔

"بلاوجہ اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں شبیر بھائی۔ تم جاؤ مسٹر ہاشم۔" احسن نے معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عادتاً ٹھنڈے مزاج کا بندہ تھا۔

"عنایہ سے ملے بغیر تو ہرگز نہیں۔" ہاشم ضد میں آ گیا۔

"اچھا۔ اِتنی محبت تھی تو یہاں تم نہیں تمہارے پیرنٹس ہوتے۔" زبیر نے پہلی بار زبان کھولی۔

"وہ نہیں مانیں گے۔ زبردستی لا نہیں سکتا۔ تھوڑا سا وقت دے دیں تاکہ اُن کو منا سکوں۔" ہاشم نے ایک بار پھر التجا کی۔

"پھر بھی نہ مانے تو؟" زبیر نے پوچھا

"کوشش کرونگا مان جائیں۔" ہاشم کا لہجہ دھیما تھا۔ وہ وثوق کیساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مان جائیں گے۔

"سوال یہ ہے نہ مانے تو کیا کرو گے؟" مدِ مقابل اِنتہا کا ڈھیٹ تھا۔

"شادی مجھے کرنی ہے نہ کہ والدین کو۔" وہ ایک ہی رٹ سے چڑ گیا۔

"او میاں!! کند ذہن ہو یا عشق کا بھوت دماغ چاٹ گیا ہے جو بابا جانی کی کہی باتیں اتنی جلدی بھول گئے ہو۔" عنایہ نے ٹھیک کہا تھا۔ اُس کا بھائی شبیر کافی گرم دماغ تھا۔ چھوٹی چھوٹی خلافِ توقع بات پر لڑ پڑتا تھا۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔

"تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی کاکا کہ شادی لڑکا لڑکی کی کیساتھ ساتھ دو خاندانوں کی ہوتی ہے۔ ہم اپنی بہن کو کیسے جھونک دیں جہاں وہ کسی کی پسند نہ ہو۔ بہت باتیں ہو گئیں۔ اب چلتے بنو۔" شبیر اُس کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف لے جانے لگا۔ ہاشم وہیں اکڑ گیا۔ اِسی ضد، اکڑ، دھرمی کی وجہ سے بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ وہ دو ہٹے کٹے مرد اور ہاشم اکیلا۔ جتنا مار سکتا تھا مارا۔ باقی مار کھاتا رہا لیکن جانے کا نام نہ لیا۔ احسن اُن تینوں کو چھڑوانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن کہاں تک قابو کرتا۔ شبیر نے پسٹل نکال لی۔

"ماں کا دودھ پیا ہے تو چلا گولی۔" ہاشم سینہ ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔

"شبیر۔ ہوش سے کام لو۔ یہ پاگل ہے۔ عشق کا بھوت سر چڑھ کر ناچ رہا ہے۔ تم پاگل مت بنو۔ یار ہاشم تم ہی چلے جاؤ۔ جاؤ یارا خدا کا واسطہ ہے۔" زبیر اور احسن نے اُس کو پکڑ کر روکا۔

"عنایہ کو لینے آؤں گا دیکھ لینا۔" جاتے جاتے وہ دھمکی دینا نہ بھولا تھا۔

☆......☆......☆

چیختے ہیں چلاتے ہیں تہلکہ مچاتے ہیں
خدارا اِن لفظوں کی زبان کاٹ دے کوئی!

"مرد بڑا ہی بزدل واقع ہوا ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرنیوالا مرد ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرا کر بھاگ جاتا ہے۔" وہ ہاشم سے سخت متنفر تھی۔

"بہت بھرم ہے اپنی ذات کا۔ ابو غیر برادری میں نہیں کریں گے۔ ہنہ۔ نام نہاد ذات پات کا بھرم رکھنے والے لوگ۔ چوہدری بنے پھرتے ہیں باقی سب تو جیسے حقیر ہیں۔" اُس کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ دِل کی بھڑاس جی بھر کر نکال کر بھی وہ ہلکی نہ ہو پا رہی تھی۔ کمرے میں چکر کاٹتے کاٹتے اُس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں لیکن اُس کے اندر اُبلتا جوالا مکھی اُسے ٹک کر بیٹھنے نہ دے رہا تھا۔

"وہ بزدل ہوتا تو یہاں آتا کیا؟ اِس میں اُس کا کیا قصور۔ اُس کے پیرنٹس نہیں آئے تو کیا ہوا۔ وہ تو تمہارا ہاتھ مانگنے آیا تھا۔ مما پاپا کو سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ یہاں تمہارے کہنے پر آیا تھا جسکا مطلب وہ سمجھ سکتے ہیں۔ کام شبیر بھائی کے جوش نے بگاڑا ہے۔" نبیلہ نے ہاشم کو سپورٹ کی۔

''غلطی ساری ہاشم کی ہے۔ اُس کو جوش کی بجائے ہوش سے کام لیتے ہوئے مصلحتاً واپس چلے جانا چاہیے تھا۔''

''اچھا۔ چلا جاتا؟ واہ کیا بات کہی۔ جا کر کونسا اُس کے مما پاپا مان جاتے؟ جب تک وہ یہاں لانے کے لیے راضی کرتا تم مسز کامران بن چکی ہوتی۔ بات کرتی ہے چلا جاتا۔ ہنہ۔ آخر حد تک کوشش کی اُس نے۔''

''مسز کامران بننے کی بجائے میں موت کو ترجیح دیتی۔ کفن پہن لونگی لیکن کامران کے نام کا جوڑا۔ کبھی نہیں۔'' اُس کے ارادے سن کر نبیلہ کانپ گئی۔

''تم بلاوجہ خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ اس طرح غصہ کرنے سے کچھ ہونے والا تو ہے نہیں۔ پھر فائدہ جلنے کڑھنے کا۔'' نبیلہ نے رسان سے سمجھایا۔

''بلا وجہ؟ میں بلا وجہ بول رہی ہوں؟ میں آپ کو پاگل لگ رہی ہوں کیا۔ بلاوجہ۔ ہنہ۔ آپ نے محبت کی ہوتی تو پتہ چلتا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کسی کو چاہ کر کسی اور کا ہو جانا۔ زندگی ویران ہو جاتی ہے، دَم گھٹنے لگتا ہے، سب کچھ برا لگتا ہے حتیٰ کہ اپنا آپ بھی۔'' بنا سوچے سمجھے بولتے ہوئے وہ نبیلہ کے جذبات مجروح کر گئی۔

''صحیح کہتی ہو زندگی ویران ہو جاتی ہے اور ویران جگہوں میں آسیب بسیرا کرتے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اُس کی بڑبڑاہٹ عنایہ سن نہ پائی۔ سن بھی کیسے سکتی تھی وہ اپنے عشقِ غم میں مبتلا تھی۔ ہاشم کو کھو دینے کا تصور جان لیوا و سوہانِ روح تھا۔

☆......☆......☆

''نہ یہ بتا تجھے کس بیوقوف نے کہا تھا جانے کو۔ ہم میں سے کسی کو ساتھ نہیں لے سکتا تھا؟ ایڈا توں (اِتنے تم) پھنے خان۔'' چوہدری کبیر نے جی بھر کر اُس کو سنائیں۔

''آ آ۔ آرام سے یار۔ کس چیز کا بدلہ لے رہا ہے مجھ سے۔'' گرم گرم سکائی کرنے سے ہاشم کی چیخیں نکل گئیں۔

''بدلہ تو تم نے خود سے لیا ہے صاب بہادر۔ ایڈا تو شیر ٹھیر دا۔ کلا ہی ٹر پیا (اتنے تم شیر ٹھہرتے۔ اکیلے ہی چل پڑے)۔'' کبیر بولا۔

''دیکھ ہاشم بڑوں کے کیے گئے فیصلے نہ صرف درست بلکہ پائیدار ہوتے ہیں۔ تم انکل سے بات تو کرتے شاید وہ مان جاتے۔ اب بھی کسی نہ کسی طرح راضی کرو۔ باعزت طریقے سے رِشتہ جائے گا تو اِنکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔'' شجاعت نے کہا۔ کبیر اور نبیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شجاع ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگر تم کہو تو ہم بات کریں انکل سے۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ مرتے مر جائیں گے لیکن ذات پات کے خول سے باہر کبھی نہیں نکلیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

''کم از کم امی ہی ساتھ چل پڑتیں مجھے یوں اکیلے نہ جانا پڑتا رِشتہ لے کر نہ یہ سب ہوتا۔ آہ آ آ۔ یار ہتھ ہولا رکھ۔''

''وہ کبھی انکل کیخلاف گئی ہیں جو اب جاتیں۔'' نبیل نے کہا۔

''کورٹ میرج کر لو۔'' کبیر نے مشورہ دیا۔

''دماغ خراب ہے تیرا۔'' پیٹھ کے بل لیٹتے ہوئے بڑبڑایا۔

''ایسے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا یار۔'' کبیر نے سکائی والا کپڑا تقریباً پٹختے ہوئے کہا۔

''نہ جب تجھے پتہ تھا تیرے خاندان میں برادری سے باہر شادی نہیں کرتے تو کیا ضرورت تھی عنایہ کو اِس مقام تک لانے کی؟'' کبیر سخت تپا ہوا تھا۔

''نبیل صحیح کہہ رہا ہے۔ محبت کرنے سے پہلے اپنے والدِ محترم سے اِجازت لے لیتے کہ ابا میں برادری سے باہر لڑکی سے محبت کرنے کی اِجازت ہے۔ کم از کم کسی لڑکی کی زندگی برباد نہ ہوتی۔'' نبیل کے لہجے میں چھپا طنز وہ صاف محسوس کر سکتا تھا۔

وہ ذات پات کے سخت خلاف تھا۔ وہ ہاشم کے خاندان سے متنفر ہو چکا تھا جنہوں نے نبیل کا رِشتہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا کہ وہ لوگ اپنی برادری سے باہر رِشتہ نہیں کرتے۔ برادری سے باہر کسی صورت نہیں جانا۔

چاہے لڑکی ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی رہ جائے یا کماؤ پوت لڑکا بڑھاپے کو پہنچ جائے۔ نبیل ہاشم کی بہن ہادیہ کو پسند کرتا تھا۔ نبیل نے ہاشم کے کہنے پر اپنی والدہ کو اِس آس پر بھیجا کہ ہاشم سے پرانی دوستی ہے چوہدری وجاہت سے بھی اچھی سلام دُعا ہے وہ ضرور مان جائیں گے۔ لیکن سب برعکس ہوا۔ ذات برادری جان پہچان پر بھاری پڑ گئی۔ ہاشم خوب تلملایا باپ کو سمجھایا مگر بیکار گیا۔

''غلطی تمہاری ہے ہاشو۔ نہ تم ہٹ دھرمی دِکھاتے نہ بات بڑھتی۔ جتنا تم نے بتایا اُس سے صاف ظاہر تھا کہ انکل آنٹی جاتے تو وہ لوگ اِنکار نہ کرتے۔ تم سیدھی طرح اُٹھ کر آ جاتے۔ پھر گھر والوں کو منا کر لیجاتے۔'' نبیل صاف گوئی سے بولا۔

''میں مر بھی جاتا تو بھی پاپا نہ مانتے۔ امی نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ مجھے خود ہی جانا پڑا۔''

''نہ کونسا تیر مار لیا تو نے جا کر۔'' کبیر تڑخ کر بولا۔

''تو اپنی بکواس بند نہیں کر سکتا کیا۔ کس بات پر تڑخ رہا ہے اِتنا۔'' ہاشم کو غصہ آ گیا۔

''مرد اور عورت کی محبت میں فرق ہوتا ہے ہاشو۔ مرد کبھی نہ کبھی اپنی محبت بھول جاتا ہے پر عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھولتی۔ عنایہ تمہارے معاملے میں بہت پوزیسو ہے۔'' نبیل نے رسان سے کہا۔ ہاشم کے چہرے پر بکھرے دھنک رنگ بتا رہے تھے وہ بھی عنایہ کو لے کر سنجیدہ ہے۔ اُس کو بے پناہ چاہتا ہے۔

''جانتا ہوں وہ مجھے بے تحاشا چاہتی ہے، بے پناہ، خود سے بھی زیادہ۔ میں بھی اُسے بہت محبت کرتا ہوں نبیل۔ اِس لیے گیا تھا رِشتہ لے کر۔ ورنہ وہ کامران کا بچہ لے اُڑتا۔''

''لے آیا رِشتہ پھر؟ کر دی اُس کے کار (گھر) والوں نے ہاں؟ منکر ہو گئے کامران کے رِشتے سے؟ آیا وڈا چوہدری (آیا بڑا چوہدری)۔ مار کھا کر آ گیا۔ تیری جگہ میں ہوتا تو لڑکی ساتھ لے کر ہی آتا۔ مرتا یا مار دیتا۔'' کبیر کی جلی کٹی باتوں سے اُس کے غصے کا صاف پتہ چل رہا تھا۔

''جا جا آیا بڑا چوہدریوں کا علمبردار۔ زیادہ باتیں نہ بنا۔ چائے بنا۔'' ہاشم نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ مزید باتوں کے موڈ میں نہ تھا۔

☆......☆......☆

''عنایہ کچھ کھا لو۔ کب تک یوں بھوکی پیاسی بیٹھی رہو گی؟'' نبیلہ نے التجائیہ لہجے میں کہا تو عنایہ نے عجیب نظروں سے دیکھا۔ نبیلہ کو جھرجھری آ گئی۔

''اگر ہاشم کے والدین آ جاتے تو یہ نوبت نہ آتی۔'' نبیلہ نے کہا۔

''اب سارا ملبہ ہاشم پر گرا رہی ہیں۔ اُس وقت تو بہت سپورٹ کر رہی تھیں کہ وہ خود آ گیا وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود آ گیا کیا یہ کافی نہ تھا؟ یہاں سے رسوا ہو کر چلا گیا اور مجھے کسی نے بتانے کی زحمت بھی نہ کی۔ غصہ تو اِس بات کا ہے اُس نے بھی ایک میسج تک کرنا گوارا نہ کیا کہ آ رہا ہے۔ آیا اور مار کھا کر چلا گیا۔ اِتنی بے عزتی۔ پاپا ایک بار مجھ سے پوچھ لیتے کہ میں واقعی انٹرسٹڈ ہوں یا نہیں۔ کیا فائدہ اِتنی تعلیم دِلانے کا، شعور کا جب لڑکیوں کو گائے کی طرح اپنی مرضی سے کہیں بھی ہانکنا ہوتا ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے ہانپ سی گئی۔

''ہم لڑکیوں کو جتنی بھی تعلیم دِلا دی جائے، کتنا بھی اعتماد بخش دیا جائے، خود مختار بنا دیا جائے مگر زندگی کا اہم فیصلہ کرتے وقت اِس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ پوچھ لیا جائے آیا مرضی ہے بھی یا نہیں۔'' بات مکمل کی۔

''تم غلط بیانی کر رہی ہو عنایہ۔ کوئی تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر رہا۔ مما پاپا سمجھدار ہیں۔ ہاشم کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ تمہارے کہنے پر ہی وہ آیا ہے۔ اُنہوں نے بس ایک شرط رکھی ہے کہ ہاشم کے والدین کی رضامندی سے شادی ہوتا کہ تمہیں عزت و مقام کے ساتھ اپنایا جائے۔ اور تم ہی بتاؤ اِس میں غلط کیا ہے؟''

''اب ایسا بھی نہیں ہے آپی۔ تایا ابو نے ندرت آپا کی شادی اُس جگہ کی جہاں اُن کی رضامندی تھی حالانکہ نصیر بھائی کی فیملی بھی راضی نہیں تھی نہ اُنہوں نے شرکت کی۔''

''دمن پھپھو کی غزالہ، گڈی خالہ کا بیٹا زوہیب،

چھوٹی پھپھو کے دونوں بچے۔ دُور نہ جائیں تو ہمارے اپنے بھائیوں نے پسند کی شادیاں کیں سوائے احسن بھائی کے اور سب کے والدین کی رضامندی سے رشتے طے ہوئے نہ کہ۔'' الوینہ کے آنے پر نبیلہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

''تمہارا فون ہے۔'' نبیلہ کا رنگ اُڑ گیا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ واپس لے کر جاؤ۔''

''ایک منٹ ایک منٹ۔ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی اِس گھر میں کیا چل رہا ہے۔ مجھے یونیورسٹی جانے سے منع کردیا، گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادی، موبائل فون لے لیا۔ اب فون سننے پر قیامت کا آنا۔ چہ معنی دارد؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

''تم پہلے بات کرلو پھر بتاتی ہوں۔ وہ کئی بار فون کر چکا ہے۔'' الوینہ نے نبیلہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''الوینہ یہ فون لے کر جاؤ۔'' نبیلہ نے فون آف کر کے اُس کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بات کرنی ہے ہاشم سے۔'' عنایہ اُڑ گئی اور فون جھپٹنے کی کوشش کی۔

''الوینہ تم بتاؤ آخر میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ مجھ سے میرا فون لے لیا گیا، یونیورسٹی جانے پر پابندی لگادی ہے اور اب یہ۔''

''پرسوں تمہارا نکاح ہے کامران کیساتھ۔'' عنایہ کے سر پر پہاڑ توڑا۔ الوینہ کے حقیقت بتانے پر نبیلہ نے نظریں جھکالیں۔ عنایہ نے ملامتی نظروں سے اپنی بہن کو دیکھا۔

''اوہ تو یہ بات ہے۔ میرے موت کا سامان کیا جا رہا ہے اور مجھ ہی کو خبر نہیں۔ واہ۔ کیا بات ہے۔'' اُس کا غم و غصے سے برا حال ہوگیا۔

''دیکھو عنایہ ہاشم کو موقع دیا کہ وہ اپنے والدین کو''

''بس نبیلہ آپی۔ چلی جائیں آپ۔ میں آپ کو اپنا خیر خواہ سمجھ رہی تھی لیکن آپ بھی سب کیساتھ شامل ہیں۔'' اُس نے نبیلہ کی بات کاٹ دی۔

''بھابھی کتنا سپورٹ کریں گے اپنے بھائیوں کو؟ آپ نے ارصم بھائی جیسے ہیرے کو گنوا کر اپنی زندگی برباد کرلی اب کم از کم اپنی بہن کی تو تباہ نہ کریں۔ وہ لوگ بھی ذات پات کے قیدی تھے اُن سلاخوں سے باہر نہ جانا چاہتے تھے تب بھی یہی شرط رکھی تھی شبیر بھائی اور چچا جان نے کہ اپنے پیرنٹس کو لاؤ۔ ارصم بھائی نے آپ کو کورٹ میرج کرنے کو کہا مگر آپ۔ آپ اپنے پاپا اور بھائیوں کی عزت کی علمبردار بنی اپنا آپ قربان کر بیٹھیں۔ کیا ملا جنید بھائی کیساتھ شادی کر کے؟ جبکہ خوشی تو آپ کی ارصم بھائی تھے۔ کتنی محبت کرتی ہیں آپ جنید بھائیسے؟۔'' الوینہ کا لہجہ اُس کے غصے کا غماز تھا۔

''جواب نہیں ہے نہ۔ ہوگا بھی کیوں آپ بھلا کیوں پیار کرنے لگیں۔ آپ اُن کی زندگی میں تو شامل ہوگئی ہیں لیکن دِل۔ دِل آپ کا اب بھیا رصم بھائی کی طرف ہے۔'' الوینہ کا حد درجہ سچ اُس کو بے مول کر گیا۔ وہ اپنی ہی نظروں سے گر گئی۔

''اللہ کے واسطہ اپنی بہن پر رحم کھائیں۔ ہر کسی کا دِل آپ کی طرح بڑا نہیں ہوتا کہ ایسی دوغلی زندگی جیئے۔'' الوینہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''میں نے مما پاپا سے بات کی تھی۔ اُن دونوں نے فیصلہ بیٹوں پر چھوڑ دیا ہے۔ میں شبیر بھائی اور زبیر کے پاس بھی گئی لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ ہاشم اُس دِن ہٹ دھرمی دِکھانے کی بجائے شرافت سے چلا جاتا اور پیرنٹس کو ساتھ لے آتا تو یہ نوبت آتی ہی نہیں۔ وہ اِن سکیور ہو گئے کہ کہیں تم کوئی غلط قدم نہ اُٹھالو اِس لیے تم سے۔''

''بس اِتنا بھروسہ تھا اُن کو اپنی بہن پر؟ اِتنا جانتے تھے وہ عنایہ کو؟ خوشی ہوئی جان کر۔ آئی ایم سو ہیپی ٹوڈے ٹو نو ڈیٹ۔'' تالیاں بجاتے ہوئے نم لہجے میں بولی تو نبیلہ نے اُسے گلے سے لگالیا۔ عنایہ نے اُس کو پیچھے دھکیل دیا۔

''مجھے اُن سے شکوہ نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ بھائی ہیں کچھ بھی سوچ سکتے ہیں میرے بارے میں۔ مگر مما پاپا۔ وہ کیسے سوچ سکتے ہیں میرے بارے میں کہ میں۔ بدنصیبی میری۔'' سر گھٹنوں میں دیئے وہ رو پڑی۔

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر لسٹ 2018ء

1	جنوری	دیوار کا پھول	حاجرہ ریحان
"	جنوری	واپسی	غزالہ عزیز (اُمِ ایمان)
2	فروری	تجدید ایمان ضروری ہے	عقیلہ حق
3	مارچ	دلخراش گھونٹ	نگہت سیما
4	اپریل	دھوپ چھاؤں	آسیہ بنت عبداللہ
5	مئی	سراغ جادہ	تسنیم منیر علوی
6	جون	مضبوط ڈھال	تحسین انجم انصاری
7	جولائی	غوطہ کی ابابیلیں	زرافشاں فرحین
8	اگست	نیون سائن	سید علی ارسلان
9	ستمبر	پرسونا	حاجرہ ریحان
10	اکتوبر	ناسور	فائزہ مشتاق
11	نومبر	نمکین پانی	غزالہ فرخ
"	نومبر	لیزی ڈیزی	تسنیم منیر علوی
12	دسمبر	میں ہاری سیاں	سعدیہ سیٹھی

''یہی دُکھ مجھے ہے۔ پہلے نبیلہ بھابھی اور اب تم۔ پیرنٹس تو بعد میں مان ہی جاتے ہیں پھر کیوں لڑکی کے جذبات کی قدر نہیں کی جاتی۔ کیوں گائے بیل کی طرح کہیں بھی ہانک دیا جاتا ہے جہاں وہ دِل سے شوہر کو چاہ نہیں سکتی کیونکہ اُن کی چاہت کوئی اور ہوتا ہے۔ آپ بتایئے بھابھی۔ کتنا چاہتی ہیں جنید بھائی کو؟ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں، اُن کی عزت کرتی ہیں، اُن کی ہر بات پر لبیک کہتی ہیں۔ مگر۔ مگر ارصم بھائی کو بھلا سکتی ہیں کیا؟'' الوینہ نے اپنی بازو عنایہ کے گرد لپیٹ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے نبیلہ سے پوچھا تو اُس نے سر جھکالیا۔ کیا جواب دیتی کہ عورت سب بھول جاتی ہے مگر پہلی محبت نہیں بھول سکتی۔ وہ بھی چاہتے ہوئے نہیں بھول سکتی۔

''جنید بھائی کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کسی اور کو پسند کرتی تھیں ورنہ وہ یہ شادی نہ کرتے۔ اللہ سے دُعا ہے اُن کو پتہ چلے بھی نہ تاکہ وہ اِسی طرح آپ سے محبت کرتے رہیں۔ وہ میرے بھائی ہیں میں چاہتی تھی اُن کی زندگی میں مکمل لڑکی شامل ہو جس کے دِل میں۔''

''بس الوینہ۔ میرے جذبے اِتنے ارزاں نہیں جنہیں تم یوں بے مول کر دو۔ ہاں یہ سچ ہے میں اِس شادی سے خوش نہیں تھی، میں نے شادی مجبور ہو کر کی تھی لیکن اُن کی عزت کرنا میری مجبوری نہیں۔ اُن کی محبت، خلوص اور چاہت دیکھ کر میرے دِل میں اُن کا مقام خود بخود بن گیا مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ مجھے لگتا تھا میں ارصم کے بغیر نہیں رہ سکتی، اُس کو کو بھول نہیں سکتی لیکن اُس کا نام ماضی کی کسی کتاب میں بند ہو چکا ہے بلکہ کب کا بند ہو چکا ہے۔ چار سال۔ ہاں اِس نام پر دِل میں ٹیسیں اُٹھتی ہیں مگر شدت ویسی نہیں رہی۔ میرا حال میرا مستقبل صرف جنید ہیں۔ اُن کا خیال رکھتی ہوں، عزت کرتی ہوں اور ایک دِن آئے گا دِل سے محبت بھی کرونگی اِس سے بھی زیادہ جتنی اب کرتی ہوں۔ خدارا آئندہ میرے جذبوں پر شک مت کرنا۔''

وہ تینوں خاموش تھیں۔ عنایہ کی سسکیاں دَم توڑ چکی تھیں۔ فون بار بار بج کر بند ہو رہا تھا۔ الوینہ نے دیکھا۔ ہاشم کی سترہ مسڈ کالز دیکھ کر نبیلہ نے فون عنایہ کی طرف بڑھا دیا۔

''کرلو بات۔'' عنایہ نے منہ پھیرلیا۔

''ممکن ہے پھر کبھی بات نہ ہو۔ بہتر ہے جو بات کرنی ہے کرلو۔'' نبیلہ کا لہجہ غیر متوازن ہوا۔ وہ جانتی تھی محبوب کو کھونا اِتنا آسان نہیں ہوتا۔ ہمت وحوصلہ چاہیے ہوتا ہے۔ الوینہ کمرے سے جا چکی تھی۔

''ہاشم۔'' جیسے ہی اُس نے کال اُٹھائی عنایہ کی سسکتی آواز سن کر بے چین ہو گیا۔

''کیسی ہو عنایہ؟ یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہی۔ تمہارا نمبر بھی بند جا رہا ہے۔ سب خیر تو ہے؟'' ایک ساتھ سوالات پوچھنے پر وہ پھیکی سی ہنسی۔

''پرسوں میرا نکاح ہے۔''

''واٹ؟ ہوش میں تو ہو؟ کک کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''ہوش وحواس میں ہی تم سے بات کر رہی ہوں۔ اِس سے پہلے کہ حواس کھو بیٹھوں اور کچھ کر جاؤں مجھے یہاں سے لے جاؤ۔'' نبیلہ نے حیرانگی سے اُسے دیکھا جیسے اپنی سماعت پر شبہ ہو۔

''عنایہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' نبیلہ نے اُس کو مخاطب کیا جسے اُس نے اَن سنا کر دیا۔

''ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔'' نبیلہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ عنایہ کی باتوں سے، لہجے سے۔ تاثرات سے بغاوت کی بو آ رہی تھی۔

''یار تمہارے گھر والے تھوڑا سا صبر نہیں کر سکتے۔ میں نے وقت مانگا تھا پاپا کو راضی کرنے کے لیے۔''

'تم نے صبر کرنے کی کسر چھوڑی کہاں ہاشم۔ بلاوجہ اُلجھنے کی بجائے چپ چاپ چلے جاتے پھر کسی بڑے کو لے آتے تو شاید بات بن جاتی۔ مگر تم نے لڑائی کر کے بات ہی ختم کر دی'' اُس نے جان بوجھ کر بات ہاشم پر ڈال دی۔ حالانکہ وہ بھی جانتی تھی کہ شبیر نے کام خراب کیا تھا۔

''کیسے آ جاتے بڑے؟ تمہاری امی نے صاف منع کر دیا کہ کامران کیساتھ ہی شادی ہوگی۔ مجھے اپنے

والدین کو لانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات والدین کو منانے میں وقت لگتا لیکن تمہارے گھر والے تو سب طے کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ کامران سیشادی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔'' ہاشم نے صفائی دی' وہ خاموش رہی۔

''اُس دِن کے لیے آئی ایم سوری۔'' اُس نے معذرت کی۔

''سوری کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پرسوں نکاح ہے۔ آ سکتے ہو تو وقت سے پہلے آ جانا ورنہ۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون کاٹ دیا۔ سیل بند کر کے نبیلہ کو پکڑا دیا۔ ہاشم ہیلو ہیلو کہتا رہ گیا۔

''تم نے کیا کہا؟'' نبیلہ نے تصدیق چاہی

''جو آپ نے سنا۔ یا تو وہ مجھے لے جائے یا۔'' ادھوری بات کر کے وہ خاموش ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب تاثر دیکھ کر نبیلہ کو جھرجھری آ گئی۔

''عنایہ۔''

''بولیں۔''

''تم نے کہا تھا کہ تم اپنے گھر کی عزت خاک میں ملانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ابھی تو تم بھائیوں اور مما پاپا کی سوچ پر کڑھ رہی تھی۔ پر اب۔ اب تم وہی کرنے کا سوچ رہی ہو جس کو نہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تم۔ قول و فعل میں تضاد نہیں؟'' نبیلہ دِل کی بات زبان پر لے آئی۔

''اُن کو مجھ پر بھروسہ ہے ہی نہیں جس کا ثبوت میرا یونیورسٹی پر پابندی اور سیل فون لینا ہے۔ اگر کر گزروں گی تو زیادہ دُکھ نہ ہوگا کیونکہ وہ یہ توقع مجھ کر بیٹھے ہیں کہ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' اُس کا لہجہ، اُس کے الفاظ تاثرات سے عاری تھے۔

''مما پاپا نے میری زندگی کی دوڑ بھائیوں کے ہاتھ میں تھما دی۔ آخر کیوں؟ یہ میری زندگی ہے۔ فیصلے کا اِختیار بھی مجھے ہونا چاہیے نہ کہ اُن کو۔ اور ویسے بھی ہاشم نے وقت مانگا تھا نہ۔ اِنتظار کر سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ کرنا وہیں ہے جہاں اُن کی مرضی ہوگی، جہاں زبان دی ہے۔ عزت پر حرف نہ آئے بھلے بیٹی کی خوشیاں داؤ پر لگ جائے۔ مجھ سے اِس بابت کسی نے بات تک نہیں کی۔ پرسوں نکاح ہے میرا اور مجھ ہی کو خبر نہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے بھی بتانا گوارا نہ کیا۔'' وہ سب سے متنفر ہو چکی تھی۔

''سب جانتے ہیں کہ میں اور ہاشم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں پھر مجھ سے پوچھے بغیر، میری رضامندی کے بغیر کیسے خالہ کو نکاح کے لیے ہاں کر دی؟ میں پسند کی شادی کروں یہ کسی کو منظور نہیں اِسی لیے ہاشم کو ذلیل کر کے گھر سے نکالا گیا تا کہ وہ پلٹ کر نہ آئے۔'' نبیلہ خاموشی سے اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی اگر اُن کو ہاشم سے شادی پر اعتراض نہ ہوتا تو اُسے بے عزت کر کے نہ نکالا جاتا۔ عنایہ کی پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُس کو وقت دیا جاتا تا کہ اپنے والدین کو راضی کر کے لائے۔

عنایہ کیساتھ وہی کچھ کیا جا رہا تھا جو نبیلہ کیساتھ چار سال پہلے ہوا۔ چار سال پہلے اَرصم اُسی صوفے پر بیٹھا نبیلہ کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔ اُس کو خوش رکھنے کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ پروفیسر ماجد اور بھائی اِسی طرح اُس کو باتوں کے جال میں اُلجھا رہے تھے کہ والدین کی رضامندی کے بغیر بیٹی نہیں دینی۔ اُس کے جاتے ہی ہفتے کے اندر اندر اُس کی شادی جنید سے کر دی گئی۔ ایک ماہ بعد اَرصم والدین کو منا کر لایا تو وہ نبیلہ ماجد سے نبیلہ جنید بن چکی تھی۔ کس قدر کٹھن اور تکلیف دہ سفر تھا اُس سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا۔ اُس میں والدین کے خلاف جانے کی ہمت نہ تھی۔ محبت جیسی مضبوط چٹان سر کرنے والی وہ کمزور دِل لڑکی تھی جس کو والدین کی عزت عزیز تھی۔ جانے کیسے والدین تھے جنہوں نیز بان کا بھرم رکھنے کے لیے پہلے ایک بیٹی کی خوشیوں کو قربان کیا۔ اب دُوسری بیٹی کی باری تھی۔ پہلی بیٹی نے تو سر خم کر دیا تھا۔ پر عنایہ کے اندر باغی جذبے سر اُٹھا رہے تھے۔ وہ یہ نہ اِنصافی نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

محبت اِنسان کو طاقت وَر بنا دیتی ہے۔ یا اُس میں اِتنی طاقت آ جاتی ہے کہ اپنے حق کے لیے سب سے لڑ پڑے۔ کمزور سے کمزور اِنسان اپنی محبت کو کھو دینے کے ڈر سے بزدلی کے خول سے نکل آتا ہے، سب سے لڑتا

ہے، اُلجھتا ہے۔اپنے حق کو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔عنایہ بھی اُن میں سے ایک تھی۔

''میں مما پاپا کے پاس جا رہی ہوں بات کرنے۔ آ کر تمام صورتحال سے مطلع کرتی ہوں۔'' نبیلہ سے سیل لے کر ہاشم کو میسج کیا۔

یہی تاریخ کہتی ہے یہی حالات کہتے ہیں
عداوت تم نہ بھولو گے محبت ہم نہ بھولیں گے!!

☆......☆......☆

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' دروازہ کھٹکھٹا کر اجازت ملنے کا اِنتظار کئے بغیر وہ اندر داخل ہوگئی۔

''بیٹھو۔ کہو کیا بات کرنی ہے۔'' پروفیسر ماجد نے کہا۔

''اگر ہاشم سے متعلق کوئی بات ہے تو ہمیں اِس پر مزید نہ کچھ کہنا ہے نہ سننا۔ ہاں کوئی اور بات ہے تو ہم سن رہے ہیں۔'' مسز ماجد کا رویہ عنایہ کے لیے نیا تھا۔اُس نے حیرانگی سے ماں کو دیکھا۔پرفیسر ماجد نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

''لیٹ ہر سپیک۔'' اُنہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

''آپ لوگ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے پاپا۔'' وہ براہِ راست باپ سے مخاطب ہوئی۔

''میں بالغ ہوں۔ میری مرضی کے بغیر کیسے میری شادی کہیں بھی کر سکتے ہیں۔''

''تمہاری شادی 'کہیں بھی' نہیں ہو رہی تمہاری خالہ کے بیٹے سے ہو رہی ہے۔'' وفیسر ماجد کے بولنے سے پہلے مسز ماجد نے جواب دیا۔

''کیا آپ مجھے پاپا سے بات کرنے دیں گی؟'' عنایہ نے منہ موڑے ماں سے پوچھا۔

''میرا جواب تمہاری ماں کے جواب سے الگ نہیں ہوگا بیٹا۔تم کیسے ایک شخص کیساتھ زندگی گزار سکتی ہو جہاں اُس کے گھر والے تمہیں اپنانے کو تیار نہ ہوں؟ یہاں بات پسند ناپسند کی نہیں ہے بیٹا۔ ذات پات کی ہے۔وہ لوگ اپنی برادری کو اہمیت دیتے ہیں اُس شیل سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے۔تم وہاں مس فٹ ہوگی۔''

''ہاں یہ سچ ہے کہ وہ لوگ ذات برادری کے حصار سے نہیں نکلنا چاہتے۔ٹھیک ہے نہ۔مت نکلیں۔ مجھے پروا نہیں۔ میں نے زندگی ہاشم کیساتھ گزارنی ہے نہ اُس کے والدین کیساتھ۔ اُس کا اپنا گھر ہے ہم وہاں رہیں گے۔'' عنایہ نیا پنے طور مسئلے کا حل پیش کیا۔

''نورین آپا تمہاری خالہ ہیں۔ کامران کو تم بچپن سے جانتی ہو۔ دیکھے بھالے گھر میں جاؤ گی ایڈجسٹ ہونے کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ تمہیں خوش رکھیں گے۔ نبیلہ کو ہی دیکھ لو۔ کتنا خوش ہے اپنے گھر۔ جنید کتنا چاہتا ہے اُسے۔'' مسز ماجد نے اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''جب دِل بار بار دِل میں بسنے والی کی چاہ کرے تو کسی اور کیساتھ زندگی گزارنیکے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا مما۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا خوش رکھیگا یا کتنا نہیں۔ میری خوشی ہاشم ہے۔رہی بات ایڈجسٹ منٹ کی تو مما یہ لڑکی کو ہر جگہ کرنی ہی پڑتی ہے چاہے شادی اپنوں میں ہو یا غیروں میں۔''

''بہت بدلحاظ اور بے شرم ہوگئی ہو۔ یہ اُسی محبت کا اعجاز ہے جس نے تمہیں بے لگام گھوڑے کی طرح ماں باپ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔''

''کچھ بھی کہہ لیں مما۔ یہ طے ہے کہ مجھے کامران سے شادی نہیں کرنی۔ بالکل بھی نہیں، کسی صورت نہیں۔'' اُس نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔

''یہ کس انداز میں بات کر رہی ہو اپنی ماں سے۔'' پروفیسر ماجد نے ڈپٹا۔

''بالکل اُسی طرح جیسے یہ مجھ سے بات کر رہی ہیں نورین خالہ کی بہن بن کر۔ میرے ساتھ ناانصافی ہے پاپا۔'' وہ گڑگڑائی۔

''ماں باپ اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔'' پروفیسر ماجد نے کہا۔

''میری مرضی کے بغیر شادی کر کے کیا اچھا کیا جا رہا ہے؟''

''پرسوں تمہارا نکاح ہے تیار رہنا۔اب جاؤ۔'' مسز ماجد نے بات ختم کی۔

''میں اِنکار کر دونگی۔'' وہ اکڑ گئی۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ تمہارے اِنکار کے بعد میں نے خود کو ختم نہ کر لیا تو نگین ماجد نام نہیں میرا۔" عنایہ جو دروازہ کھول کر جانے کو تھی پلٹ کر ملامتی نظروں سے ماں کو دیکھا جنہوں نے کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

"ہاں تمہارے کورٹ میں ہے۔" عنایہ نے جاتے جاتے سنا۔

☆......☆......☆

"آپ کو کیا ہوا ماجد؟ خاموش بیٹھے ہیں۔" ہاتھوں میں لوشن لگاتے ہوئے وہ پروفیسر ماجد سے مخاطب ہوئیں۔

"نگین آپ کو نہیں لگتا کچھ غلط ہو رہا ہے؟ جانے انجانے میں ہم اپنی اولاد کیساتھ زیادتی کر رہے ہیں؟ نبیلہ، احسن۔ اب عنایہ۔ شبیر اور زبیر نے اپنی مرضی سے شادی کی حالانکہ زبیر کے لیے مجھ سے صدیق نواز نے اپنی یتیم بھتیجی کی بات کی تھی۔ آپ کی رضامندی سے ہم نے شگن ڈالا۔ پر کیا ہوا۔ اُس نے اپنی پسند کی شادی کر لی ہماری رضامندی و مرضی کیخلاف۔" پروفیسر ماجد کے چہرے پر فکرمندی کے آثار گہرے ہو گئے۔

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ نبیلہ نے ہماری پسند کی شادی کی۔ دیکھ لیں کتنا خوش ہے اپنے گھر میں۔ احسن بھی اُس چڑیل کو بھلا کر رومیسہ کا ہی ہو گیا ہے۔ عنایہ کا رونا دھونا بھی وقتی ہے۔ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ کامران اُس کو بہت خوش رکھے گا۔"

"بالکل اُسی طرح جیسے اُس کی بہن نے ہم سب کو خوش رکھا ہوا ہے۔" اُن کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اقصیٰ کی چرب زبانی سے سبھی خائف تھے۔ پرفیسر ماجد کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ اور بدتمیز تھی۔ بہت کم کسی کا لحاظ کرتی تھی وہ بھی اپنے مطلب کے لیے۔ شبیر کی پسند نہ ہوتی تو وہ یہ شادی کبھی بھی نہ ہونے دیتے۔

"آپ بھی نہ۔ اقصیٰ دِل کی بری نہیں ہے۔ صاف گو ہے جو دِل میں ہوتا ہے کہہ دیتی ہے۔" نگین شرمندہ ہو گئی۔ کبھی کبھی اقصیٰ اُس کا بھی لحاظ نہ رکھتی تھی۔

"اِتنی صاف گوئی اچھی نہیں ہوتی نگین۔ بہرحال۔ مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں۔ تم جانو تمہاری بھانجی۔ میں عنایہ کی بات کر رہا تھا۔ ویسے بھی وٹہ سٹہ ایک نہیں دو گھر برباد کرتا ہے۔ چار لوگوں کی زندگیاں برباد کرتا ہے۔"

"حد ہو گئی ماجد۔ اپنے خدشات اپنے پاس رکھیں۔ آپا میری سگی بہن ہے اور بچے ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اپنا اچھا برا سب سمجھتے ہیں۔"

"ویسے بھی آپ نے خود ہی تو اُس لڑکے کو کہا کہ ماں باپ کے بغیر شادی کرنے سے ہماری بیٹی کی کوئی عزت نہیں کرے گا وغیرہ۔ اب خود ہی بلاوجہ کے واہموں میں الجھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ کمال ہیں آپ بھی۔" کمبل اوڑھتے ہوئے بولیں۔

"نگین بیگم آپ شاید بھول رہی ہیں ہمارے بیٹے نے بھی ہماری مرضی کیخلاف جا کر شادی کی۔ ہم کتنا عرصہ ناراض رہے؟ آخر کو مان ہی گئے نہ۔ اُس کے والدین بھی مان ہی جاتے۔ ابھی بھی وقت ہے اگر ہم۔"

"آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ پرسوں نکاح ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ۔ میں کہاں جا کر سر پھوڑوں اپنا۔" پروفیسر ماجد کی بات کاٹ کر بولتے ہوئے منہ کمبل کے اندر کر لیا یعنی مزید بات کی گنجائش نہیں۔ وہ تاسف اور افسوس سے اپنی شریکِ حیات کو دیکھتے رہے جو منہ موڑے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ وہ ہمیشہ نگین کی سنتے آئے تھے، ہر معاملے میں اُنہوں نے نگین کی بات کی مانی حتیٰ کہ بچوں کے مستقبل کے فیصلے کا اِختیار بھی اپنی بیوی کو سونپ دیا۔ اُنہیں ایسا احساس پہلے کبھی نہ ہوا جیسا اِس وقت ہو رہا تھا۔ دِل انجانے خدشے سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کچھ ہونیوالا ہے۔ کوئی انہونی ہونے کو تھی۔ وہ یہ بات نگین کو بتانا چاہتے تھے مگر وہ پرسکون سو رہی تھیں۔ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے اُن کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ کسی پل چین نہ آ رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی مگر وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن تھے۔

"اندر آ جاؤ۔" پروفیسر ماجد نگین کی آواز سن کر ایکدم چونکے۔

"تم دونوں اِس وقت۔ خیر تو ہے؟ کیا بات

ہے؟'' پروفیسر ماجد کا دل لرز گیا۔

''آپ دونوں سے ضروری بات کرنی تھی۔'' پروفیسر ماجد نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

''آپ ہمارے بڑے ہیں ہم پر آپ کا ہر حکم بجالانا فرض بنتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ آپ دونوں جو بھی فیصلہ کریں گے صحیح کریں گیمگر ضروری نہیں ہر بار فیصلہ درست ہو۔'' احسن نے تمہید باندھیبغیر بات شروع کی۔

''جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ پہیلی مت بجھواؤ۔'' نگین نے کہا۔

''میں۔ میں عنایہ کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ تھوڑا جھجک گیا۔

''اوہ۔ تم دونوں بھی اُس کی اُس کی وکالت کرنیآ گئے۔ ایسا کرو سب کو اکٹھا کرواور پوچھو کس کس کو مجھ سے جرح کرنی ہے اِس معاملے میں۔ تاکہ میں ایک کی بار سب سے نپٹ لوں۔'' نگین بلاوجہ تپ گئیں۔

''اِتنا ہائپر ہونے کی ضرورت نہیں نگین۔ بچوں کی بات سن لو۔'' پروفیسر ماجد نے اُن کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا سنوں۔ یہ وہی کہیں گے جو تھوڑی دیر پہلے آپ کہہ چکے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا اِس معاملے کو اِتنا سنجیدہ کیوں لیا جا رہا ہے؟ سب کی شادیاں اپنی مرضی اور پسند سے کی ہیں ہیں اِتنا مسئلہ نہیں بنا جتنا اِس مسئلے کو ہوا دے کر۔''

''مما مما آپ پلیز تحمل سے ہماری بات سنیں۔ اِس معاملے کو سنجیدہ لینا پڑ رہا ہے کیونکہ یہ معاملہ سنجیدہ ہے۔ عنایہ کی زندگی کا سوال ہے، اُس کی خوشیوں کا سوال ہے۔'' احسن بات کاٹ کر اِلتجائیہ انداز میں بولا۔

''سب کی مرضی کی شادیوں میں شبیر اور زبیر نہیں آتے نگین۔'' پروفیسر ماجد نے کہا۔

''تم لوگ زیادہ خیر خواہ ہو اُس کے۔ میری تو وہ کچھ لگتی نہیں۔ تمہاری شادی کی اِس سے (رومیسہ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے) کتنا ناخوش ہو؟ بتاؤ؟ نبیلہ کو بلاؤ اور پوچھو جنید نے کتنا سولی پر لٹکا کر رکھا ہے۔ خوش ہے نہ اپنے گھر۔ تم نے تو خیر نہیں مگر اُس نے کتنا واویلہ کیا تھا جنید سے شادی نہیں کرونگی خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ خود دیکھو کتنا خوش ہیں دونوں۔''

''ایک فارمولا ہر جگہ اپلائی نہیں کر سکتے مما۔ ضروری نہیں ہر بار مساوات برابر ہی ہو۔ رہی بات ہماری تو میرا اور نبیلہ باجی کا معاملہ الگ ہے۔''

''اچھا۔'' نگین نے اچھا کو لمبا کر کے کھینچا۔

''تم کہنا چاہتے ہو اصل محبت عنایہ نے کی اور تم دونوں۔ تم نے اور نبیلہ نے جھک مارا۔ یہی بات نہ۔'' وہ کسی بھی بات ماننے کو تیار نہ تھیں۔

''محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ یہ اصل یا نقل نہیں ہوتی۔ اصل نقل ہماری نیت ہوتی ہے، ہمارے اِرادے ہوتے ہیں، یقین کی پختگی ہوتی ہے۔ میں نے اور نبیلہ باجی نے آپ کے حکم پر سرخم کر لیا۔ عنایہ نہیں کرے گی آپ جانتی ہیں اُسے۔''

''میں اپنی زبان سے نہیں پھر سکتی۔ کیا عزت رہ جائے گی آپا کے سامنے؟'' دوٹوک انداز۔ بات ختم۔

''یعنی زبان کی پاسداری کی خاطر بیٹی کی خوشیاں داؤ پر لگا سکتی ہیں۔''

''ممانی شادی کے لیے لڑکا لڑکی دونوں کا راضی ہونا ضروری ہے۔ مانتی ہوں احسن اور نبیلہ باجی نے آپ کی پسند پر سر جھکا لیا مگر عنایہ باغی طبیعت کی ہے۔ ایسا نہ ہو وہ بغاوت پر اُتر آئے اور کچھ غلط کر لے۔ ہاشم اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ کامران سے اچھی جاب۔'' رومیسہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

''بس۔'' نگین نے ہاتھ کے اِشارے سے منع کیا۔

''زبان سے پھرنا ہماری شان کیخلاف ہے۔ اِسکی مثال تم ہو۔ تم۔ جو آج میرے گھر پر راج کر رہی ہو۔'' رومیسہ کا سر جھک گیا۔

''ہر مرد کا ظرف آپ کے بیٹے کی طرح ہوتا ہے نا بیٹی میں حوصلہ کہ اپنی پسند، چاہت، خوشی اپنے والدین کی زبان کی پاسداری کے لیے قربان کر دے۔'' رومیسہ نے آخری بار کوشش کی۔

''بلاوجہ بات کو طول دینے کا فائدہ۔ تمہاری ماں

ٖزبان دے چکی ہے۔ جاؤ جا کر تیاریاں کرو۔'' پروفیسر ماجد نے شکستہ لہجے سے کہا۔

☆......☆......☆

کمرے میں آ کر وہ زاروقطار رو پڑی۔ نبیلہ وہیں اُس کا اِنتظار کر رہی تھی۔ جانتی تھی مما پاپا نے کیا کہا ہوگا۔ بات زیادہ پرانی نہیں تھی۔ فرق نفوس کا تھا اُس وقت نبیلہ نے گڑگڑا کر محبت کی بھیک مانگی تھی۔ آج عنایہ کاسہ لے کر بھیک مانگنے گئی تھی۔ اُس وقت نبیلہ کے آنسو پوچھنے والا کوئی تھا نہ دِلاسہ دینے والا۔ مگر عنایہ کو نبیلہ نے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ماضی کیلئے گھاؤ سے خون رِسنے لگا۔ زخم تکلیف دینے لگے۔ یہ تکلیف ارصم کو کھونے کی نہیں تھی بلکہ والدین کے غیر منصفانہ سلوک و نا اِنصافی کی تھی جنہوں نے اولاد کی خوشیوں پر ہمیشہ اپنی زبان و بھرم کو فوقیت دی۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اچھا برا سمجھا کر، پڑھا لکھا کر، عقل وشعور کی سیڑھیاں چڑھا کر اپنی مرضی سے گائے کی طرح کہیں بھی ہانک کر سمجھتے ہیں حق اَدا کر دیا۔'' نبیلہ اُس کے ساتھ سسک رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔

''عنایہ ایسا کوئی قدم نہ اُٹھانا جس سے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔'' اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے نبیلہ نے نم لہجے سے کہا۔

''جانتی ہوں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' عنایہ نے تڑخ کر جواب دیا۔ جانے وہ لوگ کیوں بدگمان ہو رہے تھے کہ عنایہ ایسا ویسا کچھ کرے گی۔ شاید وہ کر گزرے لیکن ماں کی دھمکی اُسے بہر حال یاد تھی۔

''ہم لڑکیاں کتنا بھی پڑھ لکھ جائیں، اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائیں لیکن اپنی زندگی کے فیصلوں کے لیے خود مختار نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ یوں کہہ لو ہمارے پیرنٹس اُن پیرنٹس میں سے ہیں جو بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دے کر بھی خود مختاری کی اِجازت نہیں دیتے۔ ایسا ہی ہم دونوں کے معاملے میں ہوا۔'' نبیلہ نے کہا۔

''آپ نے نا اِنصافی برداشت کر لی۔ میں نہیں کرونگی۔ اپنے حق کے لیے آخری حد تک جاؤنگی۔'' عنایہ کا فیصلہ حتمی تھا۔

''آخری حد۔ ہنہ۔ اِسکا مطلب جانتی ہو۔ بدنامی۔ بے عزتی۔ لوگوں کے سوالات، اُن کی ذلت بھری وتمسخرانہ باتیں مما پاپا اور بھائیوں کو جیتے جی مار دیں گی۔'' نبیلہ سہم چکی تھی۔

''واہ واہ!! آپ کو اب بھی سب کی پروا ہے بلکہ سب کی کہاں عزت کی فکر ہے۔ لوگ کیا کریں گے؟ ماں پاپا بھائی کیسے سامنا کریں گے لوگوں کی نظروں کا، دِس اینڈ ڈیٹ۔'' اُس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''عزت کی پروا کر کے قربانی دینے کے لیے آپ اور آپ جیسی ڈرپوک و بزدل لڑکیاں کافی ہیں۔ میں عزت کی خاطر اپنا آپ قربان کر سکتی ہوں، اپنی خوشیوں کو قربان کر سکتی ہوں لیکن کسی اور سے شادی کر کیا اپنا آپ کسی اور کو سونپنے کی ہمت نہیں۔ اپنی زندگی کسی اَن چاہے مرد کیساتھ گزار کر میں اللہ کی بارگاہ میں گناہ گار نہیں ہونا چاہتی جہاں میرے دِل کی مسند میں کوئی اور براجمان ہو اور زندگی کسی دوسرے کے کیساتھ گزاروں۔ یہ دوغلی زندگی میں نہیں جی سکتی۔'' چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ رو پڑی۔

''کہیں سنا تھا۔ کسی نے کہا تھا نہیں نہیں شاید پڑھا تھا۔'' نبیلہ نے کہا اور خاموش ہو کر اُس کے پیروں کے قریب گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ عنایہ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آنکھیں رونے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں، پپوٹے سوجھے ہوئے تھیں۔

''تعلق بغیر محبت کے محض بوجھ ہوتا ہے اور بوجھ ہمیشہ کے لیے نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں پھینکنا پڑتا ہے۔ پہلے پہل مجھے بھیلکتا تھا کہ میں زیادہ دِن اِس رِشتے کو نہیں نبھا پاؤنگی۔ کسی موڑ پر، کسی مقام پر تھک کر اِس بوجھ کو اُتار پھینکوں گی یا جنید مجھے بوجھ سمجھ کر خود سے اُتار پھینکے گے۔ آہ!!'' وہ لمحے بھر کے لیے چپ ہوئی۔

''دیکھ لو۔ یہ بوجھ کب مجھے متاعِ عزیز ہو گیا، میرے لیے کب لازم وملزوم ہو گیا خبر ہی نہ ہوئی۔ جنید کی پرخلوص چاہت، بے لوث محبت، عزت و مانسے میرے دل میں ارصم کی محبت کے رنگ پھیکے پڑتے چلے گئے۔

پھر میرا دِل سفید چادر کی طرح ہو گیا جس میں جنید کی محبت نیلئے، خوبصورت اور دِلکش رنگ بکھیر دیئے۔ میرا ہر رنگ ہر رُوپ اُن کا عنایت کردہ ہے عنایہ۔ مجھے اُمید ہے ایک نہ ایک دِن تم بھی میری طرح کامران کے رنگ میں رنگ جاؤ گی۔''

''ہر لڑکی آپ کی طرح نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی ضروری نہیں سب کا دِل آپ کی طرح ہو۔ آپ کو بے بقول ممکن ہے زندگی کے جھمیلوں میں اُلجھ کر کبھی نہ کبھی بھلا دوں۔ اوہ۔ آہ!! نہیں نہیں۔ یہ سوچ آتی ہی نہیں۔ اُس کو بھولنے والی بات نہیں مجھ میں۔ میں نبیلہ نہیں۔ میں اُن لڑکیوں کی طرح نہیں جو بھول جائیں اپنی پہلا پیار، پہلی چاہت، پہلی نظرِ محبت۔ نہ نہ۔ میرا دِل اِتنا مضبوط نہیں ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کو مار سکتی ہوں لیکن اپنا آپ کسی کو سونپ اُن کو پامال نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' ہانپتے ہوئے وہ رو پڑی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہاشم سے خود کو الگ کر کے اُسیا پنا دَم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

''جانتی ہوں مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ بہت زیادہ مشکل ہے۔ اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ مگر میرے کہنے پر یہ کڑوا گھونٹ بھر لو۔ مما پاپا کی عزت کی خاطر۔'' نبیلہ نے اِلتجا کی۔

''کن کی عزت کی خاطر۔ جنہیں اولاد کی خوشیوں کی پروا نہیں؟ جو زبان اور بھرم رکھنے کی خاطر اپنی اولاد کی پسند کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔ طنزیہ و کھوکھلی ہنسی!

''آپی کیا یہ ظلم نہیں کہ ہم لڑکیاں ہمیشہ اپنے والدین کی عزت کی پروا کریں مگر کیا اُن پر لازم نہیں کہ اولاد کی خوشی کو سمجھیں؟ اُن کی خواہش کا احترام کریں؟ اگر والدین ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر لڑکیوں کی مرضی کے رِشتے منسوخ نہ کریں تو کوئی لڑکی گھر سے نہ بھاگے، خودکشی کا نہ سوچے نہ ایسا قدم اُٹھائے جس سے پیرنٹس کی عزت پر حرف آئے۔'' لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔

''اولاد کی خوشیوں کو، اُن کی خواہشات کو قربان کر کے کونسا تمغہ مل جاتا ہے ایسے والدین کو جو ذات برادری کو مانتے ہیں؟ کوئی اپنی زبان سے پھر جانے کو

توہین سمجھتا ہے تو کوئی غیروں میں بیاہ کرنے کو۔'' نبیلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کوئی چیز اُٹھا کر اُس کے سر پر مار دے۔ اِتنی دیر سے وہ مغزماری کر رہی تھی حاصل کچھ نہ ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جو تمہارے دِل میں آتا ہے کرو۔ لیکن۔'' وہ الفاظ کو ترتیب دینے لگی۔ اب بھی نہ کبھی تو کبھی نہیں۔

''میری۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ گھر سے بھاگ کر شادی کرنیوالی لڑکیاں کبھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جاتیں۔ ہمیشہ ناقابلِ یقین، نامراد اور بے اعتبار رہتی ہیں۔ جس اِنسان کی خاطر والدین کی محبت کو بے مول کر کے عزت کو داؤ پر لگاتی ہیں، بھائیوں کا سر جھکاتی ہیں، بہنوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں کبھی عزت نہیں پا سکتیں۔'' نبیلہ نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جو باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔ اُس کی بے توجہی پر نبیلہ تپ گئی۔ عنایہ کے چہرے پر سوالیہ تاثرات نمودار ہوئے تو اُس نے اپنی بات مکمل کرنے کے لیے لمبا سانس لیا۔ ہوو آہ۔

''جو شخص آپ کی خاطر سب سے لڑتا ہے، سماج سے ٹکر لیتا ہے، ہزاروں وعدے وعید کرتا ہے، خطرہ مول لے کر گھر سے بھگاتا ہے وہی۔ وہی شخص آپ کی ہر ایکٹیویٹی کو مشکوک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب۔'' اُس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''جب۔'' عنایہ کے پوچھنے کا انداز عجیب سا تھا۔

''ایک وقت آتا ہے جب اِس بات کا طعنہ دیتا ہے کہ جو اپنے والدین کی نہ ہوئی وہ اُس کی کیا ہو گی۔ جس نے والدین کی برسوں کی محبت کو چند ماہ کی محبت کے لیے چھوڑ دیا کل کو وہ کسی کی خاطر اُس کو بھی چھوڑ سکتی ہے۔ تلخ حقیقت ہے عنایہ، سچائی ہے۔ اِسی لیے کہہ رہی ہوں مان جاؤ۔ کوئی ایسا قدم مت اُٹھانا جس سے سب کے سر جھک جائیں اور تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔ تمہیں کل کو پچھتانا نہ پڑے۔ واپس ہو جاؤ۔'' نبیلہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ عنایہ نے سہولت سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔ اُس نے

کچھ کہنے کو لب کھولے تو نبیلہ بول پڑی۔

"یہ مت کہنا ہاشم ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی مرد ہے اور ہر مرد کسی نہ کسی روپ میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ عادات مختلف ہوتی ہیں خصائل نہیں۔" عنایہ نے سر پر ہاتھ مارا۔

"وکالت اچھی کر لیتیں ہیں آپ۔" طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے نبیلہ سے کہا تو اُس نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل سمجھا رہی تھی، اونچ نیچ بتا رہی تھی مگر وہ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھی۔ وہ پیر پٹختے کمرے سے نکل گئی۔ اُس سے مزید بحث کرنا بیکار تھا۔

جو اِنسان بات سمجھ کر بھی نہ سمجھنا چاہے اُسے کم عقل کہتے ہیں اور وہ کم عقل تھی۔ پوزیشن ہولڈر کی عقل کو عشق نام کے کیڑے نے چاٹ لیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صلب کر کے رکھ دی تھی۔

نبیلہ کے جاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کمرے کی ہر شے تہس نہس کر کے بھی اُس کو سکون نہ ملا تو اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ سوائے تکلیف کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اُسے اپنے گھر والے بھی اِس دیوار کی مانند لگے جن پر سر پٹخنے سے سوائے تکلیف کے کچھ حاصل نہ ہو رہا تھا۔ چوٹ خود کو ہی لگی۔

"میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے آپ لوگ۔ کبھی معاف نہیں کرونگی۔ کبھی نہیں۔ میں اپنی خوشیاں حاصل کر کے رہونگی۔ میری منزل ہاشم ہے میرا راستہ اُسی طرف جاتا ہے۔" اُس کی، سسکیاں، آہیں، بے قراری و تڑپ کمرے کی چار دیواری میں دم توڑ رہی تھی۔

"ماں باپ کی عزت خاک میں ملا کر کیا خوش رہ پاؤ گی؟" ضمیر کی آواز نے ملامت کیا۔

"ماں باپ نے میری خوشیوں کا خیال کیا؟" اُس نے ضمیر سے سوال کیا۔

"کیا پتہ وہ تمہارے لیے اچھا سوچ رہے ہوں۔ جو قدم تم اُٹھاؤ گی وہ تباہی و بربادی کی طرف تو جا سکتا ہے عزت، قدر و منزلت اور خوشیو کی طرف نہیں۔"

"ہنہ۔" عنایہ ہنکاری

"غلط اُس کے والدین ہیں جو کاسٹ کو مانتے ہیں نہ کہ تمہارے۔ تمہارے گھر والوں کی بات جائز ہے، اُن کا مطالبہ جائز ہے، وہ صحیح تو کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے والدین کو لائے اور تمہیں عزت سے لے جائے۔ جو آپ غیر برادری کی لڑکی کو بہو بنانے کو تیار نہیں وہ کل کو کیا اپنائیں گے؟ ہو سکتا ہے ہاشم کو خاندان میں دوسری شادی کرنی پڑے۔ اُن کے خاندان میں یہ بات عام ہے جو تم سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ بغیر ماں باپ کی رضامندی کے وہ زیادہ دِن تمہارے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔" ضمیر نے عقل کی بات کی تو عنایہ نے بلا اِرادہ اثبات میں سر ہلا دیا جیسے وہ ضمیر کی آواز سے متفق ہو۔ پھر ایکدم نفی میں سر ہلانے لگی۔

ضمیر سے باتیں کرتے کرتے جانے جب وہ نیند کی وادیوں میں کھوگئی پتہ نہ چلا۔ الوینہ نے دیکھا بیڈ کے کنارے لیٹی وہ ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ماتھے میں خون جما ہوا تھا۔ الوینہ نے دیوار کی طرف دیکھا جہاں پر خون کا دھبہ لگ گیا تھا۔ گالوں پر آنسوؤں کے خشک نشان خشک اِس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ وہ روتی رہی ہے۔

اُس نے عنایہ کو ہلا کر اُٹھایا۔ عنایہ نے ملتے ہوئے آنکھیں کھولیں، ایک نظر الوینہ کو دیکھا، ایک نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے کلاک کو دیکھا جو رات کے دو بجا رہا تھا۔

عنایہ نے سوالیہ نظروں سے الوینہ کو دیکھا۔

"ہاشم بار بار کال کر رہا تھا۔ شزاء کی وجہ سے بات نہیں کر سکی۔ ٹیکسٹ کر دیا تھا کہ جیسے ہی وقت ملا تمہارے روم میں آکر بات کرواتی ہوں۔ میں جاتی ہوں۔ تم سکون سے بات کر لو۔" اُس نے فون عنایہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سکون تو کب کا ختم ہو چکا ہے۔" الوینہ کے جاتے جاتے وہ بڑبڑائی جسے الوینہ سن نہ سکی۔ ہاشم کا نمبر ڈائل کیا۔ اُس نے کال کاٹ کر کال بیک کی۔

"عنایہ۔ میں ہاشم۔"

"اچھا۔ آج سے پہلے کبھی بتانے کی ضرورت پڑی جواب بتا رہے ہو۔" عنایہ نے طنز کیا۔ ہاشم چپ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا جب بھی وہ ڈپریشن میں ہوتی ہے چڑچڑی ہو جاتی ہے۔

''خاموش رہنے کے لیے فون کیا تھا؟''
''میں شام سے تمہارے فون کا اِنتظار کر رہا تھا۔تم انکل آنٹی سے بات کرنے گئی تھی۔کیا کہا اُنہوں نے؟''

سوگ مناؤ کہ تمہارے نہ رہیں گے اب
تیرے معیار تک آتے آتے مر جائیں گے!

''یہ شاعری کا وقت نہیں۔ مجھے بتاؤ کیا کہا انکل آنٹی نے؟''
''اِس شعر میں تمہارے سوال کا جواب موجود ہے ہاشم۔'' عنایہ روبوٹک انداز میں بولی۔ ایک بے جان وجود کی طرح جس کے لب ہل رہے تھے وجود ساکت تھا۔
''اِنکار۔''
''نہیں۔اُن کی طرف سے اِنکار نہیں ہے نہ تھا۔'' عنایہ بات کاٹ کر بولی۔
''تم نے ہی تو کہا اگر جواب ہاں میں ہوتا تو کال کرتی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا۔کھل کر بتاؤ کیا بات ہے۔'' وہ کنفیوز ہو گیا۔
''پرسوں مجھے نکاح کے نام پر قربان کیا جا رہا ہے۔ بلکہ ایک دِن تو گزر چکا۔ آج کا دِن باقی ہے جس کے طلوع ہونے میں کچھ گھنٹے ہیں۔ پھر کل کا دِن آ جائے گا اور پھر۔'' وہ سسک پڑی۔
''عنایہ رومت۔ میرا دِل پھٹ جائے گا۔مم میں کل آؤں گا انکل آنٹی سے دوبارہ بات کرنے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔انکل تو اچھے خاصے پڑھے لکھے ہیں وہ کیوں نہیں سمجھتے ہماری بات۔'' اُس نے دِلاسہ دیا۔
''پڑھے لکھے تو تمہارے پاپا بھی ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھے؟ بتاؤ مجھے۔ کیوں نہیں سمجھے وہ؟ کیوں نہیں آئے؟ عقل و شعور تعلیم و علم کی پابند نہیں۔''
''اِنصاف سے بتانا۔تمہارے گھر والوں نے وقت دیا ہی کب؟۔ ایکدم تمہارے نکاح کا بندوبست کر دیا۔ اِنتظار کیا ہوتا، کچھ کہا ہوتا۔ میں نے پاپا سے بات کی ہی کب۔ میں تو تمہارے پیرنٹس کو پابند کرنے آیا تھا کہ میں اُن کو منا کر لاؤں گا۔'' وہ خاموش رہی کیا کہتی۔ یہ گلہ تو اُسے بھی سب سے تھا۔
''عنایہ! میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔تم کچھ کرو۔''
''ایک ہی حل ہے۔آ کر مجھے لے جاؤ۔''
''آر یو اِن سینسس (are you in senses)۔ایسا کیسے ممکن ہے؟ تمہارے گھر والوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔'' ہاشم اُس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔
''اُن کی عزت کا چھوڑو۔اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچو۔'' عنایہ نے جان بوجھ کر کہا۔ وہ اُس کے خیالات جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ ہاشم کو وہ خود غرض لگی۔
''اپنے ماں باپ کو بے عزت کر کے کوئی اولاد خوش رہ سکتی ہے بھلا۔ یہ حل نہیں فرار ہے۔ایسا فرار جس میں ذلت ہے، رسوائی ہے، بدنامی و جگ ہسائی ہے۔میں ایسا نہیں کر سکتا۔تمہارے پاپا کی برسوں کی عزت ایک پل میں مٹی میں مل جائے گی، جیتے جی مر جائیں گے انکل آنٹی، تمہارے بھائی سر اُٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہیں گے۔لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ہرگز نہیں عنایہ۔ اِس کانٹوں بھرے راستے کا اِنتخاب کر کے ہم ایک تو ہو جائیں گے لیکن خوش نہیں رہ سکیں گے۔ حقیقی خوشیوں بھری زندگی کبھی نہیں جی پائیں گے۔'' ہاشم کی باتوں سے اُس کا اندر تک سرشار کر ہو گیا۔اُسے فخر ہوا کہ جس کو اُس نے چاہا وہ عام مردوں کی طرح نہیں سوچتا۔وہ واقعی سب سے الگ ہے، سب سے منفرد، سب سے جدا۔عنایہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
''یعنی مجھے یہ شادی کر لینی چاہیے۔'' عنایہ نے پوچھا
''ایسا سوچنا بھی مت۔تمہارے بغیر میں۔ میری زندگی میں کچھ نہیں رہ جائے گا۔'' اُس کی سانس پھول گئی۔عنایہ کو کھونے کا تصور ہاشم کے لیے اُسی قدر تکلیف دہ تھا جیسا عنایہ کے لیے ہاشم کو کھونے کا تصور۔
''ایک کام کرتے ہیں۔''
''بولو۔''

''ایک ساتھ مر جاتے ہیں۔ اوپر جا کر مل جائیں گے۔ وہاں ذات پات ہوگی نہ زبان کی پاسداری کا بھرم۔''

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' ہاشم نے ڈپٹا۔

''مذاق کون کر رہا ہے۔ آئی ایم سیریس۔ رئیلی آئی ایم۔''

''پاگل ہو؟ خودکشی کا مطلب بھی جانتی ہو؟ پڑھی لکھی سمجھدار ہو کر ایسی فضول باتیں کر رہی ہو۔ اللہ کی مرضی کے بغیر مرنا حرام موت ہے جو مجھے قطعاً قبول نہیں۔ اور تم۔ تم حرام موت اپنا کر سمجھتی ہو وہاں جا کر ایک ہو جائیں گے۔ ہنہ۔'' ہاشم کو اُس کی سوچ پر حیرت ہوئی۔

''عنایہ تم ابھی آرام کرو۔ میں کل آؤنگا بات کرنے۔'' ہاشم کو لگا وہ حواسوں میں نہیں ہے۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے بات کر کے دیکھ لیا ہے۔ اُن کا جواب نہ ہی ہوگا۔ کاش تمہارے ماں پاپا آ جاتے۔ کاش!''

''کیا پتہ وہ مان جائیں۔'' وہ پراُمید ہوا۔

''ہنہ۔''

''مجھے ایک بات کی خوشی ہے ہاشم کہ میرا مان نہیں توڑا تم نے۔ اگر تم بھاگ کر شادی کرنے کے لیے حامی بھر لیتے تو میرا یقین، مان اور بھرم ٹوٹ جاتا۔ مجھے اپنے اِنتخاب پر فخر ہے۔ ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ کبھی بدلنا مت''

''زندگی مکافاتِ عمل ہے عنایہ۔ جیسا ہم اپنے پیرنٹس کیساتھ کریں گے ویسا ہی ہماری اولاد ہمارے ساتھ کرے گی۔ اِس لیے آج تک ہم میں سے کسی نے پاپا کے فیصلے سے رُوگردانی نہیں کی۔ تمہارے گھر والے وقت دے دیتے تو کیا جاتا۔ کچھ نہ کچھ کر کے میں کم از کم ماما اور بہنوں کو ہمت دے کر منا لیتا۔ پاپا کبھی نہ کبھی مان ہی جاتے۔'' اُس کی سوچ پر عنایہ کو فخر ہوا۔ وہ ایسے ہی جیون ساتھی کی طلبگار تھی جو اُسے مل کر نہ مل رہا تھا۔

''مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟''

''ایسی کوئی بات مت کہنا جو میں پوری نہ کر سکوں۔''

''بے فکر۔ نہ کورٹ میرج کا کہونگی نہ مرنے کے لیے۔'' وہ کچھ نہ بولا۔ عنایہ نے خود ہی سلسلہ کلام جوڑا۔

''تم غصہ کرنا چھوڑ دو۔ میرا مطلب بلاوجہ غصہ مت کیا کرو۔ ہر کسی سے اُلجھنا، بحث کرنا، لڑنا، الگ تھلگ رہنا چھوڑ دو۔''

''کر لو گل۔ یہ بات تم مجھے بہت ٹائم سے کہتی آ رہی ہو۔ کبھی نہ مانی ہو بتا دو۔'' ہاشم نے پوچھا۔

''بس ایسے ہی رہنا۔ بدلنا مت۔'' عنایہ نے تصدیق چاہی۔

اچھا جناب۔ ڈن۔ اور کچھ۔'' وہ شوخ ہوا۔

''خوشی کی طرح غم، دُکھ اور اُداسی زندگی کے حصوں میں سے ایک ہے۔ مجھے لے کر کبھی اُداس مت ہونا، میرے لیے اُداس مت ہونا۔ کرو وعدہ۔'' عنایہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ہاشم کو جھرجھری آ گئی۔ وہ سہم گیا۔

''یہ کیا بکواسیات ہے۔ غصہ نہیں کرونگا۔ جھگڑونگا نہیں، سب سے گھل مل کر رہونگا۔ مگر جو بکواس تم نے کی ہے نہ وہ۔ وہ بہت غلط ہے۔ اِسکا مطلب ہے تم اپنے کزن سے شادی کرنے کا اِرادہ کر چکی ہو۔'' ہاشم تپ گیا۔ عنایہ سے دُوری کا خیال اُس کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

''ہرگز نہیں۔ یہ شادی کسی صورت نہیں ہو گی۔ تم سے جدائی موت ہے۔ تم سے ہٹ کر سوچنا عذاب۔ میں کسی کیساتھ نہ خوش رہ سکتی ہوں نہ اُس کو خوش رکھ سکتی ہوں۔ وعدہ کرو اب۔ جب جب میرا نام سنو گے تمہارے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رقص کرے گی۔ رقصِ محبت۔ رقصِ عاشقانہ۔'' اُس نے تسلی دی۔

''تم میری زندگی کا حصول ہو عنایہ۔ تمہارا وجود میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے تم جانتی نہیں شاید۔ تبھی اِسطرح کہہ رہی ہو۔'' ہاشم اچھا خاصا خوفزدہ ہو گیا۔ اُس کی باتیں الجھا رہی تھیں۔ پریشان کر رہی تھیں۔ آج تک عنایہ کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی دیکھی نہ اُداسی کی لہر۔ آج اُس کی باتیں۔ وہ ایک نئی عنایہ لگی اُسے۔

''عنایہ بہت باتیں کر لیں۔ ایک کام کرو۔ سو جاؤ۔ میں کل آؤنگا۔ سب اچھا ہو جائے گا اِنشاء اللہ۔ تم

ڈپریس مت ہونا پلیز۔"

"فائدہ نہیں۔ پر ایک کوشش اور صحیح۔ کوئی حرج نہیں۔ تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ مگر اب کی بار بھی پٹ کر جاؤ گے۔" عنایہ نے طنز کرتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

ہاشم کو پہلے تو غصہ آیا۔ پھر مار کھانے کے بعد والی صورتحال یاد کر کے ہنس پڑا۔

☆......☆......☆

اگلے دِن وہ ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ عنایہ کی باتوں نے اُسے اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا۔ اُس کا دِل رات سے عجیب ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کچھ غلط ہونیوالا ہے۔ خود کو تسلی دیتے دیتے رات آنکھوں میں کاٹی۔

گھڑی پونے نو بجا رہی تھی جب وہ اُس کے گھر پہنچا۔ عنایہ کی بھابھی رومیسہ نے اُسے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اور اپنے ساس سسر کو اطلاع دینے چلی گئی۔

"وعلیکم السلام! کہو برخوردار! کیسے آنا ہوا؟"

پروفیسر ماجد کے آتے ہی ہاشم نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"عنایہ کے نکاح کی مبارکباد دینے آیا ہوگا۔" نگین ماجد نے کہا۔ ہاشم کو غصہ تو بہت آیا پر وہ برداشت کر گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ میرے آنے کی وجہ جانتے ہیں۔" لہجے کو حتیٰ الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"اچھا۔ ہم جانتے ہیں۔ کمال ہے۔ ہمیں علم نہیں اور تم کہہ رہے ہو ہم وجہ جانتے ہیں۔ کیا خوب کہی۔" پردے کے پیچھے کھڑی عنایہ نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ نگین ماجد سے ایسے رویے کی توقع ہرگز نہ تھی۔ ہاشم کے چہرے پر خفت و غصے کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ عنایہ دیکھ سکتی تھی وہ کس قدر ضبط کر رہا ہے۔

"انکل میں عنایہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جانتا ہوں۔ تم ہی نے بتایا تھا۔ بہتر ہے پیرنٹس کو بتاؤ بلکہ اُن کو تو بہت پہلے بتانا چاہیے تھا تا کہ بروقت مناسب فیصلہ کیا جا سکتا۔ اب آنے کی وجہ؟ کل نکاح ہے عنایہ کا۔" وہ ویل چیئر گھسیٹ کر جانے لگے۔

"انکل۔ ایسا مت کریں۔ آج بہت آس لے کر حاضر ہوا ہوں۔" اُن کی ویل چیئر روک کر اُن کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"انکل عنایہ اِس رِشتے پر خوش نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ پائے گی۔" خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ پروفیسر ماجد کا دِل پگھلا۔

"مجھے کچھ باتیں واضح کر لینے دو! پہلی بات عنایہ کا رِشتہ بچپن سے کامران کیساتھ طے تھا۔ پھر بھی ماجد نے گنجائش نکالی کہ اگر تمہارے والدین ساتھ ہوتے تو ہم اِنکار نہ کرتے۔ اُن کا ساتھ نہ آنا اِس بات کی دلیل تھا کہ وہ لوگ تمہاری شادی یہاں نہیں کرنا چاہتے۔ میں کیسے اپنی بیٹی کو ایسی جگہ بیاہ دوں جہاں اُس کو وہ مان نہ دیا جائے جو بہو کا حق ہے۔" نگین کا لہجہ سخت تھا۔

"ہماری جگہ خود کو رکھ کر سوچو برخوردار۔" پروفیسر ماجد نے اِلتجا کی۔

"آپ کی کسی بات سے اِنکار نہیں۔ پر مجھے کچھ وقت تو دیا ہوتا کہ میں مما پاپا کو ساتھ لا سکتا۔"

"تمہارا پہلا پڑاؤ ہی کمزور تھا بیٹے۔ پہلا قدم ہی غلط اُٹھایا اور اکیلے چلے آئے بجائے اِس کے کہ اُن کو راضی کرتے۔ اور برخوردار ہم کیا اِنتظار کرتے؟ کہ جب دِل کرے آ جانا بیٹی لینے ہم نے آپ کی رضامندی کے اِنتظار میں بیٹھا رکھی ہے۔ لے جاؤ۔ جب دِل مانے کر لے جاؤ۔ بیٹی نہ ہوئی کوئی چیز ہوگئی۔" وہ چلے گئے

ہاشم زمین پر بیٹھا رہا۔ رومیسہ ایک مرد کو محبت کی بھیک مانگتا دیکھ کر دُکھی ہوگئی۔

"محبت کبھی نہیں مرتی، کبھی بھی نہیں۔ یہ مار دیتی ہے، ختم کر دیتی ہے خودداری کو، خود پسندی کو، اَنا کو۔ کہیں محبوب کو پانے کے لیے خوداری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ کہیں اُس کو منانے کے لیے اَنا و خود پسندی کو مارنا پڑتا ہے۔" رومیسہ کو احسن کی کہی بات یاد آئی جب وہ اُس سے ناراض تھی۔

وہ اب تک اُسی انداز میں بیٹھا تھا جیسے کسی معجزے کا منتظر ہو۔ اُس کو ہاشم پر رحم آیا۔ بے حد، بے تحاشا!!

''محبت ایک وقت میں ایک بار ہوتی ہے ایک شخص سے ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایک وقت میں ایک ہی محبت کی جس کے لیے اپنی خودداری کو ایک طرف رکھ کر دستِ سوال ہوا۔''

''پھر ملی محبت؟'' منہ دِکھائی میں دی گئی انگوٹھی کو اُنگلی کے گرد گھماتے ہوئے پوچھا

''وہ ملتی تو تم یہاں ہوتی؟ میرے ساتھ۔'' احسن نیا اُلٹا سوال کیا اور آنسو چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔

''یعنی میں من چاہی نہیں۔'' اُس کا لہجہ بھرّا سا گیا۔ گلے میں جیسے پھندہ لگا۔

''ایسی بات نہیں۔ تم بہت اچھی ہو اور اُمید ہے اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ تمہارا ساتھ چاہیے تا کہ اُس کی یادوں کو منہدم کر کے میں یہ خوبصورت و پاکیزہ رِشتہ خلوص اور چاہت سے نبھا سکوں۔ مجھے اللہ اور اُس کے رسول کو جواب دینا ہوتو شرمندگی نہ ہو۔'' احسن نے کہا۔

''ایک بات بتائیں گے؟'' احسن نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے اُس سے شادی کیوں نہیں کی؟ ایک لڑکی کو محبت کے خواب دِکھا کر بیچ راستے میں چھوڑ کر سمجھتے ہیں کہ آپ بروزِ قیامت بچ جائیں گے؟ سوال تو اُس بابت بھی ہوگا۔'' وہ اُس کے سوال کے پیچھے چھپی بات کا مقصد سمجھ چکا تھا۔

''میں نے مما پاپا سے بات کی تھی مگر نہیں مانے کیونکہ وہ پھپھو سے تمہارے لیے بہت پہلے بات کر چکے تھے۔ زبان سے پھرنا مما کی شان کیخلاف ہے۔'' وہ تھوڑا تلخ ہوا۔

''اُس نے کہا کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ میں نہیں مانا حالانکہ اُس کی ماما کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بھائی دُبئی ہوتے ہیں وہ بھی راضی تھے مگر میرا دِل کورٹ میرج کے لیے نہیں مانا۔ کیا فائدہ جب والدین ہی خوش نہ ہوں۔''

''کیوں نہیں مانے آپ؟ ایک دوسرے کو چاہتے تھے تو کر لیتے شادی۔ انکل آنٹی بعد میں مان ہی جاتے۔''

''مکافاتِ عمل سمجھتی ہو؟'' وہ نا سمجھی میں اُسے دیکھتی گئی۔

''یہ کوئی کتابی لفظ یا اِصلاح نہیں۔ اِس ایک لفظ میں پوری زندگی ہے۔ آج میں کورٹ میرج کرونگا تو کل کو میری اولاد بھی وہی کرے گی۔ جیسا میں کرونگا ویسا مجھے واپسی میں ملے گا اور میں نہیں چاہتا مجھے وہ ملے جس کے لیے مجھے دُکھی، پشیمان اور شرمندہ ہونا پڑے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' رومیسہ کا دِل سرشار ہو گیا۔ اِتنی اچھی سوچ والا اِنسان اُس کا جیون ساتھی تھا۔

''حمیرا کو بھلانے میں وقت لگے گا۔ اِتنی آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں وہ مجھے با آسانی نہیں بھول سکتی مگر میں نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ وہ بھی شادی کر لے تا کہ زندگی کو نیا موڑ مل سکے۔ زخم یونہی بھرتے ہیں، مندمل ہوتے ہیں۔'' رومیسہ کے چہرے پر اِطمینان پھیل گیا۔ سکون رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ اُس کے ماضی میں جو بھی تھی اُس کا حال اور مستقبل صرف وہ تھی۔ اُس کی سچائی رومیسہ کے دِل پر پھوار بن کر برسی تھی۔

''بھابھی۔'' ہاشم کی آواز سن کر وہ ایکدم چونکی اور خیالات سے باہر آئی۔

''جی۔''

''آپ بات کر کے دیکھیں شاید۔'' منت کرتا وہ رومیسہ کو محبت کا بھکاری لگا۔

''کر چکے ہیں۔ تاویلیں بیکار گئیں، بحث لاحاصل رہی۔ میں نے اور احسن سے ماموں ممانی سے بات کی تھی۔ بہت سمجھایا۔ کافی دیر بحث ہوئی مگر اُن کی وہی ایک بات وہ کامران کی امی کو زبان دے چکے ہیں۔''

''بھابھی میں انکل آنٹی کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ایک طرف اُن کو اعتراض نہیں اگر میرے پیرنٹس آتے رِشتہ لینے۔ دوسری طرف اِنتظار کئے بغیر ہی عنایہ کے نکاح کی تاریخ مقرر کر دی۔ کیا پتہ میں اُن کو جلد منا کر لے آتا۔ اُن کے رویوں سے لگتا ہے وہ لوگ یہ رِشتہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔''

''آپ بالکل ٹھیک بات تک پہنچے ہیں۔ جو آپ

نے محسوس کیا، جو آپ سوچ رہے ہیں بالکل ایسا ہی ہے۔ ماموں ممانی جیسے لوگ اپنی زبان کی پاسداری کی خاطر اولاد کی خوشیوں کو داؤ پر لگانے کو عار نہیں سمجھتے، ظلم نہیں سمجھتے۔ بالفرض آپ کے ماں پاپا آ بھی جاتے تو اُن کو وہی جواب دیا جاتا جو آپ کو دیا کہ وہ بیٹی کی نسبت بچپن سے طے کر چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پہلے احسن کیساتھ ظلم ہوا، پھر نبیلہ باجی اور اب عنایہ۔'' رومیسہ کی بات نے ہاشم کے وہم کو یقین میں بدل گیا۔

پردے کے پیچھے کھڑی عنایہ صدمے سے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ اب تک ہاشم کے والد کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی، اُن کو اِلزام دے رہی تھی جو ذات برادری کے چکر میں بچوں کی خوشیوں کو قربان کرتے آئے۔ یہاں تو اُس کے والدین ویسے لوگوں کی قطار میں کھڑے تھے۔ فرق اِتنا تھا وہ ذات پات کے قیدی تھے اور یہ لوگ زبان کی پاسداری کے مجاور۔ اولاد کیا چاہتی ہے کسی کو غرض نہیں۔

''یا اللہ! میں کہاں جاؤں۔ عنایہ کو کھونے کا خیال جان لیوا لگتا ہے، روح تک کانپ جاتی ہے۔'' ہاشم روہانسا ہو گیا۔ ہر دَر بند تھا۔ سوائے صبر کے کوئی راستہ نہیں تھا اور صبر کا راستہ ہی سب سے کٹھن تھا۔ وہ اُسے کسی اور کا ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دَم گھٹتا محسوس ہوتا۔

''کتنا مجبور ہو گیا ہوں۔ بے بس، لاچار۔'' ایک مرد سسک رہا تھا۔ پردے کے پیچھے کھڑی عنایہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہچکیوں کی آواز دبا رہی تھی۔ وہاں سے اُٹھنے کا حوصلہ وہ کر ہی نہ پائی۔ وہ ہاشم کی آواز کو اپنی سماعت میں محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ اُسے سننا چاہتی تھی۔ پھر یہ آواز اُسے سنائی کہاں دینی تھی۔

''یہ محبت ہی تو ہے جو اِنسان کو مجبور کر دیتی ہے۔ اِس قدر کہ اِنسان چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ کر ہی نہیں پاتا۔ آپ دونوں کو وقت لگے گا۔ پھر آہستہ آہستہ سب نارمل ہو جائے گا کیونکہ اِنسان زیادہ دیر تک ماضی میں نہیں رہ سکتا۔ حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور حال حقیقت ہے ماضی سراب۔'' نبیلہ نے حوصلہ دیا۔ جانے وہ کب وہاں آن پہنچی۔

''ماضی کو بھلایا بھی نہیں جا سکتا۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

''اِنکار نہیں ہاشم بھائی! مگر حال کو خوشگوار اور مستقبل کو بہترین بنانے کے لیے ماضی کے سائے سے دُور ہونا پڑتا ہے۔ بعض اوقات بھاگنا پڑتا ہے تا کہ ماضی کی پرچھائیاں حال کو نگلنہ جائیں۔ جتنا آپ ماضی کے سائے میں رہیں گے اُتنا افسردہ، غمگین، پریشان اور بے چین رہیں گے۔ اِس لیے حال کے درخت تلے ستانا زیادہ اچھا ہے بہ نسبت ماضی کے سائے کے پیچھے بھاگنا۔'' نبیلہ نے رومیسہ کو دیکھا۔ معصوم وسیدھی سادھی ایف اے پاس رومیسہ اِس وقت نبیلہ کو کوئی معلم لگی۔

''آپ کو چلے جانا چاہیے۔ شبیر بھائی کے اُٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی وہ آپ کو دیکھیں اور پھر اُس دِن کی طرح کوئی گڑبڑ ہو۔'' نبیلہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ رومیسہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سمجھا سکتی تھی سو سمجھایا۔

''چلتا ہوں۔'' وہ چلا گیا۔ ہوا کے جھونکے کی طرح عنایہ کی زندگی میں آیا اور آندھی کی مانند نکل گیا۔ وہ راہداری تک اُس کو جاتا دیکھتی رہی۔ بھاگ کر کمرے میں گئی۔ کھڑکی کھول کر دیکھتی رہی جب تک اُس کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ اُسی طرح کھڑکی کے پٹ کھولے کھڑی رہی جیسے اُسے آواز دینا چاہتی ہو۔ یا پھر۔ منتظر ہو اُس کے لوٹ آنے کی۔

☆......☆......☆

رومیسہ ناشتے کی ٹرے لے کر کمرے میں آئی تو اُسے کھڑکی کیساتھ کھڑے دیکھا۔

''چلا گیا۔'' عنایہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ رومیسہ چونک گئی۔ یعنی وہ ہاشم کی آمد سے لاعلم نہ تھی۔

''ہاں۔ اُسے جانا ہی تھا۔'' چینی چائے میں مکس کرتے ہوئے بولی جیسے عام بات ہو۔ عنایہ خاموش رہی۔

''ناشتہ کر لو۔'' اُس کا رُخ عنایہ کی جانب تھا۔

''لے جائیں۔ بھوک نہیں۔'' وہ اُسی انداز میں کھڑی رہی۔ لہجے کی سختی و اُکتاہٹ اُس کے غصے کی غماز تھی۔

(جاری ہے)

افسانہ

فرحت انصاری

کہانی گھر گھر کی

گھروں میں فساد کی بڑی وجہ عدم برداشت ہے یہ بات اگر
سمجھ آجائے تو پھر ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہو......

"ثمرین اری او ثمرین......" سجیلہ بھابی کی کرخت آواز صور اسرافیل کی مانند سارے گھر میں گونجی تھی روبینہ کی ٹانگیں دباتی ثمرین گولی کی طرح کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"جی بھابی......" سجیلہ بھابی کا پارہ آسمان پر چڑھا تھا وہ کچن کے کیبنٹ میں نہ جانے کیا تلاش کررہی تھی۔ ان کا سارا غصہ کیبنٹ کے دروازوں پر اتر رہا تھا۔ ثمرین ان کے قریب جاکر قدرے سہمی ہوئی منمنائی تھی۔

"چائے کی پتی کہاں ہے؟" روبینہ بیگم کو رات سے بخار تھا ثمرین ان کو میڈیسن دے کر ٹانگیں دبا رہی تھی۔ سجیلہ کو اس کی غیر موجودگی میں چائے بنانا پڑ گئی تھی۔ آرام پرست سجیلہ سخت کوفت کا شکار تھی۔ جب سے ثمرین نے کچن سنبھالا تھا سجیلہ کی موجیں ہوگئی تھیں اُسے مفت کی ملازمہ ہاتھ لگ گئی تھی وہ برتن دھونا اور کچن کی صفائی ستھرائی سے لے کر رفتہ رفتہ کوکنگ تک اسے سونپ چکی تھی۔ اس نے قدرے خفگی سے ثمرین کو سرتاپا گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

"بھابی...... پتی رات کو ختم ہوگئی تھی۔"
کالج سے آکر گھر کے کام کاج سے فارغ ہو
رات دیر تک اسٹڈی کرتی تھی سو اسے ا
اوقات چائے کی طلب ہوتی تھی۔ اس نے را
چائے بنائی تھی۔

"تم بتا نہیں سکتی تھیں۔" سجیلہ کو چائے
طلب ہو رہی تھی وہ چڑ گئی۔ اگر ثمرین ا
بتا دیتی تو وہ ملازمہ سے منگوا لیتی اب اسے پتہ کو
لاکر دیتا۔ سجیلہ کے رعب میں ثمرین تو آجاتی
مگر زیاد نہیں۔ زیاد تو الٹا اسے دو چار سنا ڈالتا ت
فی الحال اس کا دیور سے منہ ماری کا کوئی پروگر
نہ تھا۔ اس لیے وہ سارا غصہ بے چاری ثمرین
نکال رہی تھی۔

"سوری بھابی......" معصوم ثمرین نے ف
اپنی نادانستہ غلطی کی معافی مانگ لی تھی۔ جوا
جگہ مجرم بنی کھڑی تھی۔

"اچھا جاؤ اب......" سجیلہ کو ثمرین کی

عادت پسند تھی۔ وہ قصور نہ ہوتے ہوئے بھی فوراً معافی مانگ لیتی تھی۔ جس سے اسے مزید حاکمیت اور رعب جتانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے قدرے نرمی سے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جان جلد چھوٹنے پر فوراً بھاگ گئی۔ سجیلہ نے کیبنٹ سے پتی کا خالی ڈبہ نکال کر تھوڑی بچی پتی دودھ میں ڈال کر برنر آن کر دیا تھا۔ اس کا ذہن یونہی تادیر سلگتا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا فرما رہی تھیں تمہاری بھابی جان......''

وہ باآسانی جان چھوٹنے پر شاداں و مسرور اندر داخل ہوئی تھی کہ زیاد کے تلخ لہجے نے اس کی خوشی کافور کر دی تھی۔

''اب تم نہ شروع ہو جانا۔'' سجیلہ نے کچھ عرصے سے الگ ہونے کی ضد پکڑ رکھی تھی۔ بیوی کی ہر بات پر لبیک کہنے والا زید اس کی یہ بات ماننے سے صاف انکاری تھا۔ نتیجتاً سجیلہ سارا غصہ ساس' نند اور دیور پر نکالتی تھی۔ سجاد صاحب اس کے عتاب سے محفوظ تھے۔ وہ سسر کا لحاظ رکھتی تھی۔ وہ بہو کی کسی بات پر اعتراض نہ کرتے تھے سو اُسے بے ضرر سے سجاد صاحب سے کوئی پُرخاش نہ تھی۔ سجیلہ ہر وقت موقع کی تاڑ میں رہتی تاکہ اسے لڑائی کا بہانہ مل سکے اور پھر وہ خود ہی بات کو بڑھا چڑھا کر زید کے گھر لوٹتے ہی بتا دیتی تاکہ روبینہ یا ثمرین کو بات کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ مظلوم بنی رہے۔ ثمرین نے بھائی کے کڑے تیور سے خائف ہو کر برا سا منہ بنایا۔

''تم بھابی کے سامنے گونگی کیوں بن جاتی ہو۔'' زیاد کو بہن پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ اسے بہن کی معصومیت بے حد کھل رہی تھی۔ سجیلہ بھابی نے اسے نوکرانی بنا رکھا تھا۔

''میں تمہاری طرح انڈیپینڈنٹ نہیں ہوں۔'' سجاد صاحب ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ ان کی پنشن سے گھر کے اخراجات پورے



ہونا ناممکن تھے۔ زیاد نے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر رکھی تھیں۔ اسے بھیا یا ابو سے پیسے کی ضرورت نہ تھی روبینہ بھی اس سے گھر کا خرچ نہ مانگتی تھیں کہ وہ اپنے تمام اخراجات بخوبی پورے کر رہا تھا۔

ثمرین کی پڑھائی اور دیگر اخراجات کے لیے زید بھیا ہر ماہ امی کے ہاتھ پر معقول رقم رکھتے تھے جس سے وہ بخوبی احسن گھریلو اخراجات پورے کر لیتی تھیں مگر سجیلہ کے کچھ عرصے سے بدلتے رنگ ڈھنگ انہیں خائف رکھتے تھے وہ خوشحال و مطمئن گھرانہ تھا۔ انہیں اپنی ساری زندگی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ اچھا کھا اور پہن رہے تھے ان کی خواہش تھی کہ ثمرین کا رشتہ کسی کھاتے پیتے گھر میں ہو اس کے لیے ان کے اپنے رہن سہن سے خوشحالی ٹپکنا بے حد ضروری تھا تا کہ وہ ہم پلہ لوگوں سے رشتہ جوڑ سکیں۔

وہ فی الحال سجیلہ و زید کا الگ ہونا افورڈ نہ کر سکتی تھیں سو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سجیلہ کی بدتمیزیاں برداشت کرنے پر مجبور تھیں اور وہ ماں کی مجبوریاں سمجھتی تھی سو وہ بھی بھابی کی زیادتیاں سہہ لیتی تھی کبھی اُف نہ کرتی کہ وہ روبینہ کو پریشان نہ کرنا چاہتی تھی کم گو سجاد نے کبھی گھریلو معاملات میں دخل نہ دیا تھا۔ نوجوان و جوشیلا زیاد ماں اور بہن کے لیے کڑھتا تھا۔ اس کی بھابی سے ایک آدھ جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ سجیلہ نے اس سے بات چیت چھوڑ دی تھی۔ ثمرین کی آنکھوں میں اُداسی پھیل گئی تھی۔ وہ چپ کا رہ گیا۔

''تم دونوں کیا باتیں لے بیٹھے ہو۔'' دونوں میں لاحاصل بحث چھڑی تھی۔ نہ تو سجیلہ سدھرنے والی تھی اور نہ ہی وہ اپنی مجبوریوں سے صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ روبینہ نے دونوں سے نظریں چراتے ہوئے گویا موضوع بدلنا چاہا تھا ثمرین نے مصلحتاً اسے پتی کا ذکر نہ کیا تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو جاتا۔ زیاد کے چہرے پر ملال بکھرا تھا۔ کمرے میں بے بسی و ملال بھری جان لیوا خاموشی پھیلی تھی۔

☆......☆......☆

''سجیلہ ایک کپ چائے تو بنا دو۔'' زید نے ڈنر کے بعد سونے سے قبل حسب عادت چائے مانگی تھی۔ ثمرین اکثر بھائی کا مذاق اڑاتی تھی کہ لوگوں کی چائے سے نیند اڑتی ہے اور آپ سونے کے لیے چائے پیتے ہیں۔ وہ ڈنر کے بعد بیڈ پر لیپ ٹاپ لے کر بزی ہو گیا۔ سجیلہ کچن میں تھی۔ بچے سو چکے تھے وہ فارغ ہو کر سونے کے لیے آئی تھی۔

''پتی ختم ہے۔'' وہ تو اپنا مطالبہ رد ہونے پر انگارے چبائے بیٹھی تھی۔ اسے ہر وقت غصہ چڑھا رہتا تھا اور دماغ الگ تپا رہتا۔ وہ تلخی سے جواب دے کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔

''کیا مطلب ابھی پچھلے ہفتے تو ایک کلو کا پیکٹ آیا تھا۔'' ان کے ہاں چائے کم پی جاتی تھی۔ ثمرین اور وہی زیادہ پیتے تھے۔ اسی لیے وہ بڑا پیکٹ لے آتا تھا جو باآسانی مہینہ بھر چل جاتا تھا۔ زید اتنی جلدی پتی ختم ہونے پر قدرے متعجب ہوا تھا۔

''مجھے کیا پتہ...... تم جا کر اپنی لاڈلی سے پوچھ لو۔ اسی نے رات کو ختم کی ہے۔'' سجیلہ کے سر پر لگی اور پیر پر بجھی۔ وہ بہن کے بجائے اس سے یوں باز پرس کر رہا تھا جیسے گھر کا کلی اختیار و کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہو۔

''تم کسی سے منگوا لیتی یار......'' زید کو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ اسے چائے پیے بنا

نیند نہ آنا تھی۔ وہ بھی بگڑا تھا۔
"ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ میں ہی غلط ہوں پتی تمہاری بہن ختم کرے اور بری میں بنوں۔" سجیلہ نے دانستہ کسی سے پتہ نہ منگوائی تھی تاکہ زید کے علم میں آسکے اور وہ اسے یہ باور کرا سکے کہ وہ جن اپنوں کی خاطر الگ ہونے سے انکاری ہے وہ اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے ہیں وہ اس پر بگڑا تو وہ بھڑک اٹھی۔ اسے برداشت کرنا تو آتا ہی نہ تھا اور آج کل تو وہ ویسے بھی خلافِ مزاج بات پر چیخنے لگتی خواہ وہ بات زید ہی کیوں نہ کرتا۔ سجیلہ نے اپنی ناعاقبت اندیشی میں انجانے میں شوہر سے ہی بیر باندھ لیا تھا۔
"فارگاڈ سیک سجیلہ...... تم آہستہ بولو۔" وہ معصوم ثمرین کو ہمہ وقت گھر کے کاموں میں جتا دیکھتا تھا۔ امی اس کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ وہ آفس سے لوٹتا تو سجیلہ ڈنر تیار کرتی اور کچن سمیٹتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سجیلہ محض اس کے گھر لوٹنے پر گھر کے کام کاج کو ہاتھ لگاتی ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ امی یا ثمرین کے کانوں تک اس کی آواز پہنچے وہ غصے سے بھینچے لہجے میں غرایا تھا۔
"آپ کو تو میں زہر لگتی ہوں۔" وہ شوہر کی ہمدردی نہ پاکر مظلومیت کا پرچار کرتی مگر مچھ کے آنسو بہانے لگی تھی۔
"پلیز سجیلہ میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے محبت سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی دلجوئی کی تھی۔ سجیلہ شوہر کی ہمدردی بالآخر بٹورنے میں کامیاب رہی تھی۔ وہ اس کی محبت بھری آغوش میں آنسو بہانے لگی تھی۔
"کم ان......" اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا تھا وہ دونوں چونک کر سیدھے ہوئے تھے۔
"بھیا چائے......" ثمرین اس کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔
"رکھ دو......" وہ نرمی سے اسے کہتا سجیلہ کو تکنے لگا تھا۔ جسے شوہر کی پسند و آرام سے زیادہ اپنی حاکمیت اور خواہشات عزیز تھیں۔ گھر میں پتی ختم تھی مگر اس نے بھائی کی خاطر منگوا کر چائے بنا کر دی تھی۔
کیا تھا اگر یہی کام سجیلہ کر دیتی یوں اس کا مان بڑھ جاتا وہ محض سوچ کر ٹھنڈی آہ بھرتا مڑا تھا ثمرین چائے رکھ کر جا چکی تھی۔ گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے اس کی توجہ مبذول کر چکی تھی۔
☆......☆......☆
"تمہیں کہا کس نے تھا کہ تم اتنا زیادہ سرف ڈالو۔" عائشہ بھابی کڑے تیوروں سے لحاظ و مروت بھلائے کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے گویا ہوئی تھی ان کی عصیلی نظریں عدلیہ پر جمی تھیں۔
"مجھے اپنے ہی گھر میں کوئی کام کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی قطعاً ضرورت نہیں ہے بھابی۔" مدمقابل بھی عدلیہ تھی جو اپنے نام کی ایک ہی تھی جو نہ کسی سے دبتی تھی اور نہ ہی اسے کسی کی پرواہ تھی۔ وہ خلافِ مزاج بات پر اکثر ماں سے بھی اُلجھ پڑتی تھی۔ راحت ماں تھیں وہ اس کی کڑوی کسیلی سن کر چپ رہ لیتی تھیں مگر عائشہ بیگانی تھی اسے نند سے کڑوی کسیلی سننے کا کوئی شوق نہ تھا سو اُن میں اکثر لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ شادی کے چار سال بعد بھی ان میں دوستی نہ ہو پائی تھی۔ اور وہ دونوں روایتی نند بھاوج کی عملی مثال تھیں۔ عدلیہ نے پورا مقابلہ کرتے ہوئے دوبدو زبان درازی کی تھی۔
"تمہیں نہ تو کوئی کام کرنے کا ڈھنگ ہے اور نہ ہی کسی سے بات کرنے کی تمیز۔" عائشہ نے

گھر بھر کے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی تھی۔ چھوٹی رامین سو کر اٹھی تو رونا شروع ہوگئی تھی۔ وہ بیٹی کو چپ کروانے گئی تو اسے دیر ہوگئی۔ عدیلہ کو ناچار ماں کی گھرکیوں سے عاجز مشین سنبھالنا پڑی تھی۔ اس نے سرف زیادہ ڈال دیا تھا اور عائشہ کو گھر گرہستی کے ضمن میں سخت ناگوار گزرا تھا۔

گھر میں چار بندے تھے اور ہر ایک کے خرچے اٹھانے کو کمانے والا ایک تھا۔ راحت بیگم سبھاؤ سے گھر کا خرچ چلا رہی تھیں۔ وہ ساس کی دانشمندانہ کفایت شعاری کی دل میں معترف تھی مگر عدیلہ......

عدیلہ نے کسی کے رعب میں رہنا سیکھا ہی نہ تھا۔ سو وہ من موجی اور لاابالی تھی۔ عائشہ کو اس کی لاپرواہی کھلتی تھی۔ عائشہ کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے وہ خفگی سے زیر لب بڑبڑائی تھی۔

''آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ میرے منہ لگا کریں۔'' عدیلہ بی اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ راحت کو دن رات اس کی شادی کی فکر کھائے جاتی تھی وہ حتی الوسیع بہو سے بنا کر رکھتی تھیں۔ آخر بیٹی کی شادی کے سارے اخراجات بہو اور بیٹے کو پورا کرنا تھے۔ پھر عدیلہ بیگم کے مزاج بھی شاہانہ تھے۔ وہ تو جیسے کسی شہزادے کے انتظار میں تھی جیسا وہ رشتہ چاہتی تھی ویسا رشتہ ان کے ہاں آنے کے لیے ان کا اعلیٰ حیثیت ہونا ضروری تھا۔ فخر کی بہترین جاب تھی اور وہ بخوبی گھر چلا رہا تھا۔ لیکن ان کے مالی حالات اتنے اچھے نہ تھے کہ کوئی لینڈ لارڈ یا امیر گھرانہ اِدھر کا رخ کرتا' عدیلہ کے کان بھابی کی سرگوشی بخوبی کیچ کر چکے تھے۔ سو اس نے فوراً اُدھار چکتا کیا تھا۔

''بی بی تم اپنی زبان قابو میں رکھو یہی حال رہا تو دو دن میں میکے آ بیٹھو گی۔'' عدیلہ کے سر پر لگی اور پاؤں پر بجھی۔ عائشہ نے اسے غصے سے لتاڑا تھا۔ اسے عدیلہ کی یہی عادت زہر لگتی تھی۔

''آپ چار سال میں نہیں گئیں۔ میں بھی چار سال گزار ہی لوں گی۔'' وہ جوابی وار کرتی یہ جا وہ جا۔

''ہائیں ہائیں......'' عائشہ بھابی جلتی رہ گئیں۔ وہ اس کے جانے کے بعد سارا غصہ کپڑوں پر نکالنے لگی تھی۔ اس کا سلگتا ذہن کسی طور قرار نہ پا رہا تھا۔ اب اسے قرار فخر سے عدیلہ کو ڈانٹ پڑوا کر ہی آنا تھا۔

☆......☆......☆

''عدیلہ تم کیوں بھابی سے بدتمیزی کرتی ہو؟'' ہمیشہ کی طرح دونوں کی منہ ماری سے راحت کی جان پر بن آئی تھی۔ عائشہ شوہر کو دو کی چار لگا کر سناتی اور وہ بیوی کا غلام ماں بہن کے سر پر چڑھ جاتا۔ عدیلہ کا موڈ آف تھا۔ اس کے کھانا پکانے کی باری تھی۔ گھر میں دونوں نے کام بانٹ رکھے تھے۔ عدیلہ انتقاماً لنچ گول کر کے منہ سر لپیٹے کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ اس رات کا بچا چکن اپنے اور امی کے لیے فریج سے نکال کر اپنے کمرے میں رکھ لیا تھا۔ اسے اب یہی سالن کھانا تھا۔

''عائشہ بھابی جائیں بھاڑ میں وہ اپنا بندوبست خود کریں۔'' وہ سلگتے ذہن سے سوچتی کڑھ رہی تھی کہ راحت بیگم بہو کی وکالت کو آ موجود ہوئیں۔

''امی پلیز...... آپ کو ان کی عادت کا علم ہے پھر بھی آپ نہ جانے کیوں ہمیشہ بھابی کی سائیڈ لیتی ہیں۔'' اس پر بھی ماں کے سمجھانے کا

اثر ہوا تھا جواب ہو جاتا۔ وہ الٹا ماں پر خفگی سے بگڑی تھی۔ اسے ماں کی آمد کا مقصد سمجھ آ گیا تھا جو کہ غلط بھی نہ تھا۔

''تمہارے ہی بھلے کو بیٹا اگر تم عائشہ سے بنائے رکھو گی تو تمہارا اچھی جگہ رشتہ ہونے کا چانس ہے۔ تمہیں زمانے کے بدلتے حالات کا علم ہی ہے۔ لوگ جہیز کے نام پر لاکھوں مانگتے ہیں۔'' راحت نے تفکر بھری رسانیت سے بیٹی کو سمجھانا چاہا تھا۔

''امی آپ بھابی کو بھی تو دیکھیں نا...... مجھے کہنے لگیں کہ تم دو دن میں واپس آ جاؤ گی۔'' عدیلہ کو سارا غصہ ہی اسی بات پر تھا۔ عائشہ بھابی کو اکلوتی بہو اور بھابی کا بھرپور پروٹوکول دیا گیا تھا۔ مگر وہ نہ جانے کیوں ساس اور نند سے بیزار ہی رہتی تھیں۔ سجیلہ آپی تو ہفتے میں ایک بار میکے کا چکر لگاتی تھیں ان کی بھابی سے خوب بنتی تھی۔ وہ بھابی کی کسی بات کا برا نہ مناتی تھی۔

سجیلہ سسرال میں بھلے لڑاکا سہی مگر میکے میں صلح جو تھی۔ اس کی یہی دوغلی پالیسی کامیاب تھی اور عائشہ بھابی کو کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہ ہوا تھا۔ عدیلہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بیٹا میں تو ہر پل یہی دعا کرتی ہوں کہ تم جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔'' وہ متاسف انداز میں آہ بھر کر رہ گئی تھیں۔

''امی آپ فکر نہ کریں...... دیکھ لیجیے گا آپ کی بیٹی کو شہزادہ بیاہنے آئے گا۔'' اس نے خوشی سے ماں کا تفکر کم کرنا چاہا تھا۔ بھلے وہ لاکھ بدتمیز و بدلحاظ سہی مگر وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ انہیں افسردہ نہ دیکھ سکتی تھی۔

''آمین......'' راحت نے صدقِ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اسے دعا دیتے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا۔

☆......☆......☆

''زید...... ثمرین کے دو ماہ بعد ایگزامز ہیں تم اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈو۔'' وہ آفس سے آ کر حسبِ معمول ماں اور بہن سے خوش گپیوں میں مشغول تھا اور سجیلہ حسبِ معمول اس کی غیر موجودگی میں انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اسے زید کا ماں بہن کے پاس روزانہ گھنٹوں بیٹھنا سخت ناگوار گزرتا تھا مگر زید نے کبھی بیوی کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی تھی وہ اپنی فیملی کو بھی بھرپور ٹائم دیتا تھا حالانکہ سجیلہ کا بس چلتا تو اسے آفس سے آتے ہی لے کر کمرے میں گھس جاتی۔

زید رشتوں میں توازن کا قائل تھا اور سجیلہ برتری کی خواہشمند تھی۔ روبینہ بیگم بہو کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھیں۔ سجیلہ کو سسرالیوں کی اپنے معاملات میں دخل اندازی پسند نہ تھی۔ وہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں پرائیویسی کی کمی محسوس کرتی تھی اسی لیے اس نے الگ گھر کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ روبینہ نے بیٹے کو مخاطب کیا تھا۔

''امی آپ فکر نہ کریں...... ثمرین کے ایگزامز ہو لینے دیں میری نظر میں دو تین رشتے ہیں۔'' زید کو اپنا کولیگ حارث بہت پسند تھا۔ وہ ثمرین کے بی اے کرنے کے انتظار میں تھا پھر وہ بہن کے لیے کچھ سوچتا۔ زید نے محبت سے ماں کو مطمئن کیا۔

''امی ابھی مجھے پڑھنا ہے۔'' ثمرین اپنی شادی کے ذکر پر جھینپ گئی تھی اسے ماسٹرز کا جنون تھا۔

''وہ بھی شادی کے بعد کر لینا۔'' زید بہن کی خواہش سے آگاہ تھا۔ اس نے محبت سے بہن کے سر پر چپت لگائی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرا دی

تھی۔

☆......☆......☆

''ماں بہن کے ہوگئے درشن۔'' سجیلہ کو غصہ اپنی بات نہ ماننے پر تھا۔ وہ زید سے بھی خفا تھی۔ نہ جانے اسے کیوں لگتا تھا کہ روبینہ زید کے اس کے خلاف کان بھرتی ہیں حالانکہ وہ بہو کی برائی نہ کرتی تھیں زید سونے کے لیے کمرے میں آیا تو سجیلہ سوتی بن گئی۔ زید نے محبت سے اس کے گال پر آئی لٹ پیچھے کی تو وہ سونے کا ناٹک بند کرتی اٹھ گئی تھی۔

''مائنڈ یور لینگویج پلیز۔'' اسے سجیلہ کا لب و لہجہ سخت ناگوار گزرا تھا۔ اس کا رومینٹک موڈ لمحہ بھر میں غارت ہوگیا وہ آنکھوں میں زمانے بھر کی روکھائی لیے گویا ہوا۔

''آپ ساری محبتیں تو ماں بہن پر لٹا دیتے ہیں۔ میرے لیے اور بچوں کے لیے تو آپ کے پاس صرف غصہ بچتا ہے۔'' سجیلہ کو اس کی رتی بھر پرواہ نہ تھی۔ وہ کٹھورپن کی انتہا پر تھی۔ اسے صرف اپنا آپ نظر آرہا تھا۔ شوہر کی محبت کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ رتی بھر مرعوب نہ ہوئی تھی۔ وہ دبے بغیر جواباً بھرپور ناگواری سے گویا ہوئی تھی۔

''صرف ماں بہن نہیں بھائی اور باپ بھی ہے۔'' وہ اسے مزید تپانے کو بولا تھا۔ سجیلہ کو اپنی خواہشات عزیز تھیں۔

''ہونہہ......'' وہ جلتی بھنتی خفگی سے ہنکارا بھرتی، سر تک چادر تان کر لیٹ گئی زید اسے متاسف نظروں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''فخر بیٹا گھر میں نیا پینٹ کروانا ہے۔'' عائشہ نے اسے عدیلہ کی ساری بدتمیزی من وعن سنائی تھی اور کانوں کے کچے فخر نے بیوی کا پڑھایا سارا سبق بخوبی پڑھا تھا اسے بھی بہن کی بیوی سے زبان درازی پر بہت غصہ تھا۔ جسے وہ مصلحتاً دبائے ہوئے تھا۔ راحت بیگم نے ٹی وی دیکھتے بیٹے کو مخاطب کیا۔

اس روز اس کا آف تھا۔ وہ ماں کے پاس آبیٹھا۔ وہ ہفتہ میں ایک آدھ بار ماں پر یہ احسان کردیا کرتا تھا۔

''امی دو سال پہلے تو پینٹ کروایا تھا۔'' دو سال پہلے گھر کی نئی تزئین و آرائش اور پینٹ کروایا گیا تھا۔ گھر بہترین حالت میں تھا اور اسے فی الفور کسی تزئین و آرائش یا پینٹ کی ضرورت نہ تھی۔ فخر معترض ہوا تھا۔ بظاہر رامین کو دودھ پلانے میں مگن عائشہ کے کان بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ ساس نے اس کے شوہر سے 'رقم اینٹھنے' کا منصوبہ بنالیا تھا اور اسے ان کا ہر حربہ ناکام بنانا تھا۔

''بیٹا میں عدیلہ کی جلد شادی کرنا چاہتی ہوں اگر گھر نیا اور اچھا لگے گا تو لوگوں پر اچھا تاثر پیدا ہوگا۔'' راحت نے بردباری سے بیٹے کو سمجھایا تھا۔

''امی اسے پہلے سلیقہ و تمیز سکھالیں۔ کسی چھوٹے بڑے سے بولنے کی تمیز تو اسے ہے نہیں۔'' فخر کے ماتھے پر ناگواری کی کئی سلوٹیں پڑگئی تھیں۔ گو وہ ماں یا بہن سے لڑا نہ تھا مگر وہ بیوی کا ہمنوا تھا۔ اس کو عائشہ کی انسلٹ بہت کھلتی تھی۔

''فخر......'' راحت بیگم کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ عائشہ اور عدیلہ کی زبان درازی اپنی جگہ مگر وہ تو عدیلہ کا ماں جایا تھا اور غیروں جیسا لہجہ اپنائے ہوئے تھا۔

''امی وہ جب دیکھو عائشہ سے بدتمیزی کرتی

رہتی ہے۔'' اسے ماں کی دگرگوں حالت نے قدرے نادم کیا تھا۔ وہ رکھائی و خفگی بھلائے آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ وہ ماں یا بہن سے لڑنے کی بجائے انہیں قصور وار گردانتے ہوئے باور کرار ہا تھا۔

''فخر مجھے عدیلہ کی فکر کھائے جاتی ہے۔'' عائشہ لاتعلق بنی بیٹی میں مگن تھی مگر راحت بیگم جانتی تھیں کہ اس کا سارا جسم کان بنا ہوا ہے۔ وہ بہو کے سامنے ہتک محسوس کرنے لگی تھیں۔

''امی عدیلہ اپنی زبان کنٹرول کرلے تو رشتہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔'' وہ مسلسل بہن ہی کو قصور وار گردان رہا تھا عائشہ بھی کم زبان دراز نہ تھی مگر اسے کبھی بیوی کی غلطی نظر ہی نہ آئی تھی۔ راحت چپکی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''امی فخر نے ایسا کہا ہے؟'' راحت بیگم بہت فکر مند رہنے لگی تھیں۔ بجیلہ کو بھی میکے کا چکر لگائے کئی دن گزر گئے تھے۔ راحت بیگم نے اسے خود فون کرلیا تھا۔ انہوں نے بیٹی کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔ وہ حیرت سے بھنوئیں اچکا کر رہ گئی۔ بجیلہ کو یقین ہی نہ آرہا تھا کہ فخر ایسا کہہ سکتا ہے وہ شادی سے پہلے عدیلہ اور بجیلہ پر جان چھڑکتا تھا۔

''ہاں بیٹا...... وہ کہتا ہے کہ اگر عدیلہ زبان درازی چھوڑ دے تو اس کا جلدی رشتہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔'' راحت نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ انہیں بھی بیٹے سے غیریت برتنے کی قطعاً امید نہ تھی۔

''امی مجھے یقین نہیں آرہا ہے وہ شادی کے بعد اتنا بدل گیا ہے۔'' ہمہ وقت عدیلہ کو گڑیا گڑیا کہنے والا فخر بیوی کی زبان بولنے لگا تھا اور اسے صرف بہن میں خامیاں نظر آئی تھیں۔ بجیلہ کو بھائی سے اتنی بے مروتی کی امید نہ تھی۔

''بجیلہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔'' راحت حقیقتاً متفکر تھیں ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں وہ دو روز سے رات کو سو نہ پائی تھیں۔

''امی آپ فکر نہ کریں میں فخر سے بات کرتی ہوں۔'' بجیلہ کو بھائی پر غصہ آرہا تھا۔ آخر عدیلہ کو اسی نے بیاہنا تھا اس کا رشتہ اچھی جگہ ہوا تھا اور عدیلہ کا بھی ہم پلہ رشتہ تلاش کرنا تھا۔ بجیلہ نے ماں کے تفکر کو کم کرنے کی سعی کی۔ حالانکہ وہ خود بھی متفکر ہو چکی تھی۔ وہ ماں کو تسلی دینے کے بعد اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی تھی جو کہ گھنٹہ بھر سے پہلے ختم نہ ہونا تھے۔

''کیسے ہو فخر......'' وہ راحت کی باتیں سن کر بہت متفکر تھی فخر کی دونوں بہنوں میں جان تھی۔ وہ دونوں بہنیں بیاہ کر خود شادی کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ گھر کا بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اپنی ذمہ داریاں بخوبی احسن نبھا سکے۔ ابو کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے کافی کٹھن ٹائم دیکھا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ اپنے یا پرائے کی پہچان مشکل وقت میں ہوتی ہے۔ فخر نے بڑا بھائی ہونے کا حق نبھایا تھا اسے امی اور بجیلہ نے بمشکل شادی کے لیے راضی کیا تھا۔

عدیلہ کافی چھوٹی تھی وہ بجیلہ کی اپنے ساتھ شادی پر مانا تھا۔ امی نے اس کی شرط بخوبی مان لی تھی۔ وہ گھر میں بہو لاکر بیٹی کی کمی پورا کرنا چاہتی تھیں۔ فخر چار سال میں ہی اتنا بدل گیا تھا کہ اسے آج اپنی بہن میں کیڑے نظر آنے لگے تھے۔

بجیلہ دل میں صبح سے کڑھ رہی تھی۔ اسے فون

کرنے کی فرصت شام میں ملی۔ وہ موبائل لیے چھت پر آ گئی۔ تاکہ گھر میں کوئی ان کی گفتگو نہ سن سکے۔

''الحمدللہ فائن...... تم سناؤ؟'' وہ بھی آفس سے آف کرنے کو تھا کہ سجیلہ کی کال آ گئی۔ اس نے فوراً کال او کے کر دی تھی۔

''تم فری ہو مجھے ضروری بات کرنی ہے تم سے؟'' سجیلہ نے متانت سے حال احوال کے بعد اس سے استفسار کیا۔ اسے بات کرنے کی جلدی تھی مبادا کوئی اوپر نہ آ جائے۔

''ہاں تم بولو میں سن رہا ہوں۔'' فخر نے لیپ ٹاپ بند کر کے بیگ میں ڈالا اور موبائل کان سے لگائے باہر آ گیا۔ اس کے کولیگز بھی گھروں کو جا رہے تھے۔

''بھیا...... آپ تو ہم بہنوں پر جان چھڑکتے تھے پھر اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ آپ کو بہنوں میں خامی نظر آنے لگی ہے۔'' سجیلہ نے محبت سے بھائی کو مخاطب کیا۔ جوان پر جان لٹانے کو تیار رہتا تھا۔

''میں سمجھا نہیں ہوں سجیلہ......'' وہ بہن کے گلے پر اُلجھ گیا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیگ رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی موبائل کان اور کندھے کے درمیان ٹکا تھا۔

''بھیا...... عدیلہ بچی ہے آپ کو اس کی عادت کا پتہ تو ہے اور پھر وہ آپ کی ہی زیادہ لاڈلی تھی۔ آپ کو یاد ہے امی آپ کو کتنا منع کرتی تھیں کہ عدیلہ کو دوبدو جواب دینے یا تو تو کر کے بات کرنے کی عادت نہ ڈالو اور آپ کو وہ اپنی بولتی بینا اور گھر کی رونق لگا کرتی تھی۔'' سجیلہ کا دل ماں کے تفکر و دکھ پر بے حد دکھا تھا۔ اس نے رنجیدگی سے مناسب الفاظ کا سہارا لے کر بھائی کو

قصوروار گردانے اور بھابی کی شکایت لگائے بغیر اس کے غلط و نامناسب رویے کا احساس دلانا چاہا تھا۔

اسے بھیا کو خفا نہ کرنا تھا اس پر بیوی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ بھی بھیا کے بدلے رویے کو محسوس کرتی تھی مگر اس نے کبھی بھائی سے گلہ یا شکایت نہ کی تھی۔

''ہوں......'' وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے حسین ماضی کی سنہری یادیں تنگ کرنے لگی تھیں۔ اسے سجیلہ کا ناز کرنا اور عدیلہ کا لاڈ اٹھوانا بخوبی یاد تھا۔ وہ قدرے ندامت سے ہنکارا بھر کر رہ گیا تھا۔ اسے نہ تو ماں کا بیاہی بہن سے شکایت کرنا برا لگا تھا اور نہ ہی اس کا سمجھانا۔

''ہیلو......'' دونوں طرف چند لمحے سکوت طاری رہا تو سجیلہ کی پُرتشویش آواز ابھری تھی۔

''میں سن رہا ہوں سجیلہ......'' وہ ندامت کے مارے کچھ بول نہ پا رہا تھا۔ وہ محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا مین روڈ پر گھر کی سمت رواں دواں تھا۔

''بھیا...... مرد کی زندگی میں بیوی کی اہمیت ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ماں اور بہن کو بھول جائے۔'' سجیلہ کو بھائی کی ندامت بھری خاموشی سے بات کرنے کا مزید حوصلہ ہوا تھا۔ وہ مبہم الفاظ سے دوٹوک گفتگو پر اتر آئی تھی۔ اب کی بار وہ ہنکارا بھی نہ بھر سکا تھا۔ وہ اپنے فرائض سے کیسے غافل ہو گیا تھا۔

''بھیا عدیلہ کو میں سمجھا دوں گی وہ بھابی سے معذرت کر لے گی مگر آپ بھی اسے کہیں کہ وہ چھوٹی بہن سمجھ کر درگزر کر دیا کرے۔'' سجیلہ اسے اپنا پیغام پہنچانے تک کامیاب رہی تھی۔ بھیا کی ندامت اس کی گواہ تھی کہ وہ سجیلہ کے فون کرنے کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ سجیلہ کو یقین تھا کہ محبت کرنے

والا فخر ذرا رستہ ضرور بھولا ہے مگر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے۔ اس نے سبھاؤ سے گفتگو سمیٹی تھی۔

''میں امی سے جا کر بات کرتا ہوں۔''

راحت عدیلہ کے رشتے کے لیے فکر مند تھیں اسی لیے وہ گھر میں آرائش نو کروانا چاہتی تھیں اور اس نے بیوی کی محبت و چاہت میں سارا قصور و ملبہ بہن پر گرا دیا تھا۔ گھر آنے والا تھا۔ اس نے الوداعی کلمات کے بعد بہن کو بھرپور تسلی دی تھی۔ سجیلہ مطمئن تھی۔ وہ فون بند کر کے اطمینان بھری سانس خارج کرتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔

☆......☆......☆

''تمہیں کیا ہوا ہے۔'' وہ کافی دنوں بعد فراغت سے ماں اور بہن کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ آفس سے آ کر ڈنر کرتا اور پھر کمرے کا رخ کرتا تو صبح ہی کمرے سے آفس کے لیے تیار ناشتے کے بعد برآمد ہوتا۔ اس نے مدت بعد بہن سے شوخی بھری شرارتیں بھی کی تھیں اور ماں سے خوب لاڈ بھی اٹھوائے تھے۔ وہ اپنے رویے پر نادم تھا۔ راحت نے بیٹے کو رتی بھر ندامت محسوس نہ ہونے دی تھی۔ اور عدیلہ نے بھی بھائی کو نہ کوئی طعنہ دیا تھا اور نہ ہی کوئی گلہ کیا تھا۔ مرد کی کامیاب زندگی کا راز خود سے وابستہ رشتوں میں توازن قائم رکھنے میں ہے۔

جونہی مرد کا پلڑا کسی ایک طرف زیادہ جھکنے لگے زندگی میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس نے کچھ عرصے سے توازن کھو رکھا تھا اور اسے احساس تک نہ ہوا تھا اور شاید کبھی ہوتا بھی نہ اگر آج سجیلہ کی کال نہ آتی۔ سو وہ فراغت سے ماں بہن سے لاڈ و ناز اٹھوانے میں مگن تھا اور وہ بھی فراخدلی سے اس پر محبت نچھاور کر رہی تھیں جبکہ عائشہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس نے اللہ اللہ کر کے فخر کا ماں بہن کو ٹائم دینا چھڑوایا تھا۔

نجانے اسے آج کیسے یاد آ گیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ راحت اس کی شکایتیں لگا کر بیٹے کے کان بھر رہی ہوں گی۔ حالانکہ انہوں نے بہو کی تعریف کی تھی ان کے لیے بیٹے کا اپنے بھولے فرائض کو یاد کر لینا ہی کافی تھا۔ وہ دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو فخر نے بھی کمرے کا رخ کیا۔ وہ اندر آیا تو عائشہ کا چہرہ پھولا ہوا تھا۔ فخر پوچھے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''آپ کو میری پرواہ ہی کب ہے؟'' وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اس نے شوہر کی توجہ پا کر ٹسوے بہانا شروع کر دیے تھے۔

''ہائیں......'' فخر کا مارے حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ مسلسل رو رہی تھی۔ فخر کو بہت یاد کرنے پر بھی اپنا قصور یاد نہ آیا تو وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''آپ جائیں جا کر اپنی امی اور بہن کے پاس بیٹھیں۔'' وہ انگارے چبائے بیٹھی تھی۔ اسے فخر مٹھی سے نکلتا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ شادی سے پہلے میکے میں راج کرتی آئی تھی اس کے میکے میں اس کی ماں کا سکہ چلتا تھا انہوں نے بہوؤں کا جینا حرام کر کے بیٹیوں کو عیش کروائے تھے۔ وہ اس پرتعیش و آرام پرست زندگی کی عادی تھی۔ اور سسرال میں بھی حکمرانی چاہتی تھی۔ مگر عدیلہ اور راحت کی موجودگی میں ایسا ممکن نہ تھا اسی لیے وہ فخر کو مٹھی میں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی کہ آج فخر نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔

وہ اسے پہلی بار ہی اپنی اہمیت دوبارہ اور

کرانا چاہتی تھی تاکہ وہ دوبارہ ماں بہن کے پہلو میں نہ جائے۔ وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے عائشہ۔'' فخر خفگی سے بگڑا تھا اسے بیوی کی بدتمیزی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

''ہاں...... ہوں میں پاگل میں...... عقلمندوں سے بات کریں جاکر......'' عائشہ نے مرعوب ہونا یا دبنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ شوہر کا احترام و عزت تک بھلا بیٹھی تھی۔

''آئی تھنک عدیلہ نہیں تم غلط ہو وہ بچی اور ناسمجھ ہے تم تو بڑی اور سمجھدار ہو اس نے ٹھیک کہا تھا کہ تم سسرال میں چار سال گزار سکتی ہو تو وہ بھی گزارا کرلے گی۔'' عائشہ کو نند کا یہی طعنہ دل میں تیر کی طرح کھبا تھا اس نے شوہر کی ہمدردی بٹورتے ہوئے اس کے خوب کان بھرے تھے۔ فخر نے اسے شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے لفظ لفظ چباتے ہوئے بھرپور طنز کیا تھا۔

''کیا میں غلط ہوں۔'' وہ شعلہ جوالا بنی شیرنی کی طرح گرجتی لال بھبھوکا چہرہ لیے اس کے سر پر سوار ہوگئی تھی۔ فخر اسے نظر انداز کیے خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ عائشہ شوہر کی جانبدارانہ بے نیازی پر سرتاپا سلگ اٹھی تھی۔ اسے اب رات بھر کڑھنا تھا اسے نیند کہاں آنا تھی۔

☆......☆......☆

''سجیلہ تم باہر نکل کر گھر بھی دیکھ لیا کرو۔'' زید ہنوز اسے نظر انداز کیے اپنی دنیا میں مگن جی رہا تھا۔ سجیلہ کے لیے شوہر کی بے توجہی سے زیادہ اپنی بات رد کیا جانا اذیت ناک تھا۔ نتیجتاً وہ گھر میں الگ تھلگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے تھی۔ ثمرین کے ایگزامز اسٹارٹ تھے۔ زید آفس اور زیاد یونیورسٹی چلا جاتا تو وہ بھی کمرے میں گھس جاتی صفائی ستھرائی ملازمہ کرجاتی تھی۔ کھانا پکانا اور دیگر کام روبینہ کو تنہا سنبھالنا پڑتے تھے۔ اسے کسی کام کاج سے کوئی سروکار نہ تھا اس روز روبینہ کی برداشت ختم ہوگئی۔ ان کی طبیعت صبح سے ناساز تھی۔ لنچ کا ٹائم ہونے والا تھا۔ زیاد کی واپسی ہونے والی تھی۔ سجیلہ کو لنچ کی کوئی فکر نہ تھی۔ روبینہ ناچار بہو کے کمرے میں چلی آئیں۔

''آنٹی میں گھر کے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کروں گی۔'' سجیلہ نے بدلحاظی سے کورا جواب دیا تھا۔

''کیا مطلب...... گھر کے معاملات میں دخل اندازی...... یہ دخل اندازی نہیں' ذمہ داری ہے تمہاری بیٹا۔'' روبینہ کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ حتی الوسع لہجہ دھیما رکھے متانت سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''کیسی ذمہ داری آنٹی...... آپ نے مجھے گھر کا فرد سمجھا ہی کب ہے۔'' وہ دیدہ دلیری سے زبان چلاتے ہوئے سارا الزام انہی پر تھوپنے لگی تھی۔ آخر زید ہر وقت ماں کے گن گاتا تھا۔ ان کا یہ قصور کم تو نہ تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے سجیلہ......'' روبینہ کے وجود میں ناگواری کی شدید لہر اٹھی تھی۔ ان کے ماتھے پر بل پڑگئے تھے۔

''اچھا تو پھر زید کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہیں آپ سب......'' سجیلہ نے اپنی ناعاقبت اندیشی میں ضد منوانے کے لیے گھر بھر سے بیر باندھ لیا تھا۔

''سجیلہ بیٹا ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔'' روبینہ نے تیکھے چتونوں سے بہو کو گھورا تھا جو کم

عقلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر سے ہی مقابلہ بازی پر اتر آئی تھی۔

''آپ ہمدرد بھی نہیں ہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

''بیٹا میری طبیعت خراب ہے زیاد آنے والا ہے تم لنچ تیار کرلو۔'' مجبوری میں گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے وہ بہو کی بدتمیزی نظر انداز کیے مجبوراً اسے حکم دے رہی تھیں۔ ورنہ وہ خود تیار کرلیتیں۔

''مجھے نہیں پتہ ہے آپ بازار سے منگوالیں۔'' وہ رتی بھر پرواہ کیے بغیر صاف انکار کرگئی۔ روبینہ دکھ و تاسف سے ٹھنڈی آہ بھرتی اٹھ گئیں۔ وہ ان ماؤں میں سے نہ تھیں جو بیٹوں کا گھر برباد کر کے دوسری بہولے آتی ہیں۔ وہ بیٹے کا گھر جوڑے رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا رخ کچن کی طرف تھا۔ وہ جلد از جلد تیار ہونے والی ڈش کا سوچتی کچن میں داخل ہوئیں۔ چند لمحوں میں وہ آلو کی بھجیا بنانے کے لیے آلو چھیل رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر تفکر واداسی پھیلی تھی۔

☆......☆......☆

''بھابی...... میں آپ کا ہاتھ بٹادیتی ہوں۔'' کچن سے کافی دیر سے کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ عائشہ کا موڈ رات سے آف تھا۔ صبح فخر اسے منائے بنا آفس چلا گیا تھا۔ یہ چار سال میں پہلا موقع تھا کہ اس نے بیوی کی خفگی کی پرواہ نہ کی تھی۔ عائشہ سارا غصہ برتنوں پر نکال رہی تھی۔ عدیلہ چائے بنانے کچن میں آئی تو محبت سے بھابی کو مخاطب کیا تھا۔

''چپ...... تم چپ...... جاؤ یہاں سے۔'' وہ غصے واشتعال کی شدید لہر بمشکل دباتی بھینچے لہجے میں شہادت کی انگلی اٹھا کر بولی تھی۔ وہی تو تھی سارے فساد کی جڑ...... اسی کی وجہ سے فخر نے اسے غلط کہا تھا گویا اس نے بیوی پر بہن کو فوقیت دی تھی۔ وہ سب کچھ سہہ سکتی تھی مگر شوہر پر حکمرانی کا ادھورا خواب یا بٹوارہ نہیں۔ عدیلہ حیرت سے ششدر رہ گئی تھی۔

''بھابی آپ......'' وہ اُلجھ کر نرمی سے اس کا کندھا سہلانے لگی۔

''ڈونٹ ٹچ می...... دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' وہ حلق کے بل غرائی تھی۔ مدمقابل عدیلہ تھی۔ وہ سیر تھی تو عدیلہ سوا سیر...... وہ بھی غلط بات چپ چاپ نہ سہتی تھی اور نہ ہی بدتمیزی پر خاموش رہتی تھی۔ وہ مصلحتاً خاموشی سے پلٹ گئی تھی راحت بہو کے چیخنے و چلانے پر ہراساں صورت لیے باہر لپکی تھیں۔

''کیا ہوا بیٹا......'' انہوں نے تشویش سے عدیلہ سے استفسار کیا تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے کچن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کی بہو پاگل ہوگئی ہے۔'' وہ آہستگی سے بڑبڑاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ راحت تھکے قدموں سے پلٹ گئیں۔

☆......☆......☆

''زبردست رزلٹ ہے ثمرین سجاد آپ کا۔'' سجیلہ بھابی کے رنگ ڈھنگ بدلتے جارہے تھے۔ بھیا نے ان کے ضد نہ مانی تھی اور وہ انتقامی حربوں پر اتر آئی تھیں۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے بھیا سے شاپنگ اور جیب خرچ کے لیے ہزاروں اینٹھنے لگیں۔ ناچار بھیا کا ہاتھ تنگ رہنے لگا تھا وہ گھر کم خرچ دینے لگے۔ زیاد نے دو جگہ اور ٹیوشنز ڈھونڈ لی تھی۔ وہ صبح کا گیا رات گئے گھر لوٹتا تھا۔ وہ امی کو باقاعدگی سے خرچ دیتا تھا جس سے گھریلو اخراجات میں آسانی رہتی تھی۔

ثمرین ناسمجھ نہ تھی۔ اسے حالات نے وقت

سے پہلے کافی سمجھدار بنا دیا تھا۔ وہ مزید تعلیم کا شوق ترک کر کے جاب ڈھونڈنے لگی۔ دونوں بھائیوں نے اس کے فیصلے کی شدید مخالفت کی مگر وہ بھابی کے تیوروں سے خائف مجبور تھی۔ اسے پرائیویٹ اسکول میں جاب مل گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ اس کی سی وی سے خاصی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

''میم میں نے انٹر میں بھی اچھے نمبر لیے تھے۔'' وہ ہر صورت جاب کی متمنی تھی۔ اسکول گھر سے قریب تھا وہ باآسانی پیدل آ جا سکتی تھی۔ یوں سیلری کی کافی بچت ہو جاتی۔

''ثمرین ہم آپ کو اسٹارٹ میں دس ہزار دیں گے۔'' پرنسپل نے اس کی سی وی سے متاثر ہو کر اسے جاب آفر کر دی تھی۔

''تھینک یو میم...... میں آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گی۔'' وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اس نے بھائیوں کو بھی ناراض کیا تھا گھر میں کوئی بھی اس کی جاب کا حامی نہ تھا۔ سجاد صاحب نے اسے اجازت دے دی تو زید اور زیاد زیادہ دیر احتجاج نہ کر پائے تھے۔

''آپ نیکسٹ ویک آ جائیں...... ہمارے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے ڈیمو دیں میں آپ کی فیور کروں گی۔'' پرنسپل نے اسے محبت سے مکمل یقین دہانی کرائی تھی۔

''تھینک یو سو مچ میم۔'' وہ ممنونیت سے چور لہجے میں مسکراتی اٹھ گئی تھی۔ مسز شمیم کی پُرسوچ ستائشی نگاہیں اُسی پر جمی تھیں۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' وہ دو روز سے خفا تھی۔ فخر نے پرواہ نہ کی تو اس نے اگلے روز میکے جانے کے لیے سامان باندھ لیا۔ بچے اسی کے ہمراہ تھے۔ فخر کی بچوں میں جان تھی۔ اس نے پریشانی سے عائشہ کے ہاتھ سے سامان چھین لیا تھا۔

''میں امی کے ہاں جا رہی ہوں جب میرا دماغ صحیح ہوگا تو آنے کا سوچ لوں گی۔'' فخر آفس سے تھکا ہارا لوٹا تھا۔ ان دونوں میں کبھی کبھار نوک جھونک ہو جاتی تھی اور دونوں میں چند روز بعد صلح بھی ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی میکے نہ گئی تھی۔

اسے فخر نے کبھی اتنا روٹھنے ہی نہ دیا تھا۔ وہ تنفر و غصے سے کہتی بچوں کو بھی تیار کرنے لگی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''فار گاڈ سیک عائشہ......'' وہ ملتجی ہو گیا تھا۔ اسے بیوی کی قدر ہونے لگی تھی۔ عائشہ کی اہمیت زیادہ تھی وہ احساس برتری سے سرشار تھی مگر جلد ناراضگی ختم کر کے اپنی اہمیت کم نہ کرنا چاہتی تھی سو وہ ہنوز سنجیدگی سے بچوں کو تیار کرتی رہی تھی۔

''عائشہ تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔'' وہ اسے منانے کے لیے اس کا بیگ اٹھا کر اسٹور میں رکھ آیا۔

''فخر پلیز...... میں غلط ہوں نا۔'' وہ شوہر کا طعنہ بھول ہی نہ پا رہی تھی جو اس نے بہن کی محبت میں دیا تھا۔ وہ عدیلہ سے سخت خار کھائے ہوئے تھی۔ اس نے رعب جمانے کو مصنوعی اکڑ دکھائی تھی۔

''عائشہ تم بڑی ہو تمہیں سمجھداری سے کام لینا چاہیے نا۔'' وہ اسے رسانیت سے سمجھاتے ہوئے منانے لگا۔

'' عدیلہ کو تو جیسے زبان درازی کرنی چاہیے۔'' وہ چھوٹی نند سے اپنا موازنہ کر رہی تھی۔ جو اس سے عمر اور تجربے میں کم تھی۔

''عائشہ مجھے بڑا بیٹا اور گھر کا اکلوتا مرد ہونے

کے ناتے اپنی ذمہ داریاں بھی نبھانا ہیں۔تم اپنا دل بڑا کرلو۔تم میرا ساتھ نہیں دوگی تو کون دے گا؟'' چار سال میں فخر نے اسے بے لوث و بے ریا چاہت دی تھی۔اس نے اسی کی محبت میں ماں بہن کو فراموش کر ڈالا تھا اسے بھی بیوی ہونے کا کچھ تو بھرم رکھنا تھا۔ اس کے میکے میں بڑی دونوں میرڈ بہنیں اپنے گھروں میں خوش تھیں اور بھابیاں بھی عیش کررہی تھی۔وہ جب بھی میکے جاتی تو امی اپنی تینوں بیٹیوں کی طرف سے مطمئن اور دونوں بہوؤں کی بدسلوکی کا رونا روتی رہتی تھیں۔ وہ روٹھ کر میکے جاتی تو بھابیوں کا اس سے بھی برا سلوک ہوتا۔

وہ تینوں بہنوں میں نسبتاً خوشحال گھر میں تھی۔ دونوں بھابیاں اس کی ہر بار خوب آؤ بھگت کرتی تھیں اسے میکے میں اپنا وقار نہ گنوانا تھا اور شوہر کی نظروں میں اچھا رہنے کے لیے ضروری تھا کہ دل پر بھاری سل رکھ لی جائے۔اس نے فخر پر احسان کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''تھینک یو سو مچ عائشہ۔'' وہ ممنونیت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا گویا ہوا تھا۔

''آپ عدیلہ کو بھی سمجھا دیجیے گا۔ وہ بات کرتے ہوئے چھوٹے بڑے کا لحاظ کرلیا کرے۔ اسے اتنا سر نہ چڑھائیں کل کو اگلے گھر بھی جانا ہے۔'' وہ بچوں کی تیاری ادھوری چھوڑ کر انہیں گود میں لے کر بیٹھ گئی۔فخر نے عباد اور رامین سے کھیلتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کے لیے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

''بہن جی...... میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو بہو پسند کرنے کے لیے گھر گھر چکر لگا کر اور خاطر تواضع کرنے کے بعد انکار کردیتی ہاں۔'' مسز شمیم کو ثمرین اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بے حد بھائی تھی۔اس میں آج کل کی لڑکیوں کی طرح زیادہ تیزی وطراری نہیں تھی وہ بامروت اور لحاظ رکھنے والی لڑکی تھی۔

انہوں نے ثمرین کو خوب جانچ کر بیٹے کی رضامندی کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔انہیں اپنے گھر کو سنبھالنے والی بہو چاہیے تھی۔وہ اسکول پرنسپل تھیں اور ان کا بیٹا ماربل کا بزنس کرتا تھا۔حیدر صاحب ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی وہ ثمرین کی غیر موجودگی میں تنہا آئی تھیں۔

روبینہ کو نفیس اور بااخلاق مسز شمیم بے حد بھائی تھیں۔کچن میں ان کی تواضع کرتی بجیلہ تک ان کی آوازیں بخوبی پہنچ رہی تھیں۔اس کے سینے پر مارے حسد کے سانپ لوٹ رہے تھے۔ثمرین نے ابھی بیچلر کیا ہی تھا کہ اس کے لیے شاندار رشتہ بغیر کسی تگ و دو کے خود چل کر آیا تھا جبکہ عدیلہ ڈیڑھ سال سے گھر کسی اچھے رشتے کی تلاش میں بیٹھی تھی وہ نند پر حسد و رشک کر رہی تھی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے میں گھر کے مردوں سے مشورے کے بعد آپ کو جواب دوں گی۔'' روبینہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے اپنی سمت منتظر نظروں سے دیکھتی مسز شمیم کو جواب دیا تھا۔

''السلام علیکم......!'' مسز شمیم اسکول آورز میں مختصر وقت کے لیے آئی تھیں۔ وہ ثمرین کی موجودگی میں آکر کوئی غلط تاثر نہ دینا چاہتی تھیں۔ثمرین بے چاری کے تو فرشتے بھی ان کی اپنے گھر موجودگی سے لاعلم تھے۔وہ جانے کو پر تول رہی تھیں کہ بجیلہ چائے بسکٹ اور نمکو لیے چلی آئی تھی۔

''وعلیکم السلام......!'' انہوں نے مشفقانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔
''یہ میری بہو ہے سجیلہ......'' روبینہ بیگم نے تعارف کروایا تھا۔
''ماشاء اللہ...... بہت خوبصورت ہے یہ۔'' مسز شمیم کی نظروں میں والہانہ پسندیدگی تھی جو لہجے میں بھی چھلک آئی تھی۔
''اس کی چھوٹی بہن بھی بہت خوبصورت ہے۔'' روبینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ان کی تائید کی تھی۔ ہائے میرے ربا کسی بیٹی کی ماں اتنی سادہ لوح بھی نہ ہو کہ اپنی بیٹی کے لیے گھر آئے رشتے کے سامنے دوسروں کی بیٹیوں کی خوبصورتی کے چرچے کرتی پھرے۔ سجیلہ کے دل میں کسی خوش گمانی نے پھول کھلا دیے تھے۔ وہ ان کے قریب تک گئی۔
''میں اب چلتی ہوں۔'' مسز شمیم بعجلت چائے ختم کر کے اٹھ گئیں۔
''آپ گھر میں جلد صلاح ومشورہ کرلیں مجھے معاذ کی بیوی لانے کی بہت جلدی ہے۔'' سجیلہ اور روبینہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ مسز شمیم وقتِ رخصت روبینہ کو تاکید کرتی گیٹ پار کر گئیں۔ سجیلہ کی ساری خوش گمانیاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ وہ بجھے دل سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''آنٹی آپ اسے آئس کریم دلا دیتیں، پچاس روپے سے کیا ہو جانا تھا۔'' عباد بدلتے موسم کی زد پر آیا نزلہ زکام اور کھانسی کا شکار تھا۔ وہ دادی کے ساتھ قریبی مارکیٹ سبزی لینے گیا تو واپسی پر اس نے آئس کریم کھانے کی ضد باندھ لی تھی۔ راحت نے اس کی صحت کی وجہ سے نہ لے کر دی۔ اس کی ضد گھر آ کر ماں کے سامنے مزید بڑھ گئی تھی۔ عائشہ اسے سنبھالنے میں ناکام ساس پر خفگی سے بگڑنے لگی تھی۔
''بات پیسوں کی نہیں ہے عائشہ تم بچے کی صحت بھی تو دیکھو۔'' راحت نے بردباری سے خود میں مجرم بنتے اسے سمجھانا چاہا تھا۔
''اب وہ خاموش نہیں ہو رہا ہے تو اسے رونے بھی تو نہیں دیا جا سکتا ہے نا۔'' وہ کافی دیر سے روئے جا رہا تھا جس سے اس کا نزلہ اور کھانسی بڑھ گئی تھی۔ اس نے بیٹے کی ناک پونچھتے ہوئے برا سا منہ بنایا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا کہ انہیں بچوں کی خوشیاں اور خواہشات بھی عزیز نہیں ہیں۔
''بھابی لائیں مجھے دیں۔'' عدیلہ نے آگے بڑھ کر عباد کو گود میں اٹھالیا تھا تو عائشہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔
''عباد بہت کیوٹ بچہ ہے...... اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے پھوپو اپنے شہزادے کو خوب ساری آئس کریم اور چاکلیٹس لاکر دیں گی۔'' وہ محبت سے اسے پچکارتی گود میں اٹھائے ٹہلتے ہوئے اس کی کمر سہلانے لگی تھی۔ عباد کے رونے میں کمی آ گئی۔
''گڈ بوائے آپ خاموش ہو جاؤ۔'' عدیلہ نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے عباد خاموش ہو گیا۔
''آپ پرامس کریں پھوپو۔'' ننھا عباد یقین دہانی مانگ رہا تھا۔
''پرامس پھوپو کی جان......'' عدیلہ نے اس کا ننھا ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی ڈھیروں بلائیں لے ڈالیں۔
''بھابی بچوں کو بہلانے کا بھی طریقہ ہوتا ہے

آپ خواہ خواہ امی پر بگڑ رہی تھیں وہ غلط تو نہ کہہ رہی تھیں۔'' عدیلہ کو ان کا امی سے بدتمیزی کرنا کھلا تھا اسی لیے وہ ماں کی مدد کو بڑھی تھی۔ اسے ماں کے چہرے پر پھیلی ہلکی ندامت بھری سرخی نے رنجیدہ کیا تھا۔

''گھر میں آنٹی اور تم ہی تو صحیح ہو میں تو ہر بات میں غلط ہوں۔'' وہ اسے کڑے تیوروں سے گھورتی عباد کو اس کی گود سے اتار کر کمرے میں دھپ دھپ کرتی چلی گئی تھی۔ راحت بیگم کا اس کی بدتمیزی پر منہ کھل گیا تھا۔

''چھوڑیں امی...... ان کا کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔'' عدیلہ کو بھی عائشہ کی بدتمیزی بری لگی تھی۔ اس نے ماں کی ٹینشن کم کرنے کے لیے انہیں تسلی دیتے ہوئے کندھوں سے تھام کر سر جھٹکتی اندر لے جانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''مسز شمیم کیسی خاتون ہیں ثمرین۔'' روبینہ نے گھر کے مردوں سے بات کرنے سے پہلے بیٹی کی پسند جاننا مناسب سمجھا تھا۔ وہ ٹیوشن پڑھا کر اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تھی۔ روبینہ بھی وہیں آ گئیں۔ زید نے سجیلہ کا مطالبہ یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس کی پچھلے مہینے پروموشن ہوئی تھی۔ اس نے سجیلہ کے علم میں لائے بنا گھر کا خرچ بڑھا دیا تھا۔ سجیلہ کے وہی رنگ ڈھنگ تھے۔ روبینہ کو بیٹی کی زیادہ فکر تھی وہ اس کی جلد دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں معاذ کا رشتہ مناسب لگ رہا تھا۔ وہ بظاہر کیبنٹ کھنگالتی سنجیدگی سے استفسار کر رہی تھیں۔

''امی میم بہت اچھی ہیں وہ تمام ٹیچرز سے بہت محبت کرتی ہیں۔'' ثمرین سادگی سے انہیں بتانے لگی تھی۔

''وہ آج ہمارے گھر آئی تھیں تمہارا راشتہ مانگنے۔'' سادگی سے مسز شمیم کے مشفقانہ رویے کے قصے سناتی ثمرین کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ دودھ میں پتی ڈالنا بھول کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''اچھا...... کب......'' وہ حیرت کی زیادتی سے گم صم رہ گئی تھی۔

''دوپہر کو......'' انہوں نے اسے بتاتے ہوئے چائے میں اپنے لیے بھی دودھ ڈال لیا تھا۔

''کیا تم کبھی معاذ سے ملی ہو۔'' روبینہ نے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں امی...... وہ کبھی اسکول نہیں آئے ہیں۔ وہ شاید اپنا کوئی بزنس کرتے ہیں۔'' ثمرین نے پرنسپل کے متعلق کولیگز سے سنی سنائی معلومات ماں تک پہنچائی تھیں۔

''ثمرین کیا تمہیں کوئی پسند ہے۔'' روبینہ حتمی فیصلہ کر چکی تھیں۔ وہ بیٹی کی پسند جاننا چاہتی تھیں۔

''نہیں...... امی آپ میرے لیے جو فیصلہ بھی کریں گی مجھے قبول ہے۔'' چائے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے کپ میں ڈالتے ہوئے اپنی زندگی کے اہم فیصلے کا سارا اختیار انہیں سونپ دیا تھا۔

''سدا خوش وخرم رہو بیٹا۔'' روبینہ اس کا ماتھا چومتی چائے کا کپ لیے باہر نکل گئیں۔ ثمرین خوش کن خیالات میں کھوئی غیر مرئی نکتہ تکنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''عدیلہ کیا بات ہے بیٹا تم جب سے رمیضہ کے گھر سے لوٹی ہو پریشان لگ رہی ہو۔'' وہ اپنی سہیلی سے کئی دنوں بعد ملی تھی۔ رمیضہ کی مدر کی ڈیتھ کے دو ماہ بعد ہی اس کے بڑے بھائی

اپنی فیملی میں اُلجھ کر چھوٹے بہن بھائیوں سے نظریں پھیر لی تھیں۔ امی کی زندگی میں بھائی سبھی چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں بخوبی نبھا رہے تھے۔

مگر ماں کی وفات نے حالات بدل دیے تھے۔ چھوٹی بہن اور بھائی کو تعلیم جاری رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ کہیں جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ عدیلہ بوجھل دل لیے گھر لوٹی تھی اس کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

''امی رمیضہ بہت دکھی ہے۔'' رمیضہ ماں کو یاد کر کے بہت رو رہی تھی۔ عدیلہ نے راحت کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا مائیں دنیا کی انمول نعمت ہیں۔ یہ اولاد کا ہر دکھ اور پریشانی خود سہہ کر اسے آرام وسکون پہنچاتی ہیں۔'' راحت کو بھی رمیضہ کے حالات سن کر دکھ ہوا تھا۔ وہ بھی افسردہ ہوگئیں تھیں۔

''امی حسن بھائی تو اپنی امی کی ڈیتھ کے بعد بدلے ہیں جبکہ میرا بھائی تو آپ کی زندگی میں بدل گیا تھا۔ وہ تو انہیں بجیلہ آپی کے سمجھانے سے عقل آئی تھی۔'' یہی بات پھانس بن کر عدیلہ کے دل میں گڑی تھی۔ اسے رہ رہ کر بھیا کے بدلتے رویے کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

اگر بھیا آپی کے سمجھانے پر بھی اپنی ذمہ داریاں محسوس نہ کرتے تو اس کا کیا بنتا' کیا وہ بھی رمیضہ کی طرح روتی رہ جاتی۔ عدیلہ کا رواں رواں رب کا شکر گزار تھا۔ بھیا نے رشتوں میں اعتدال سیکھ لیا تھا۔ عدیلہ افسردگی سے ماں کے سینے سے لگ گئی۔ ماں کتنی بڑی نعمت ہے اسے ان کے سینے سے لگ کر پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنا دل بناء کسی خوف وخطر کے ان کے سامنے کھول کر رکھ سکتی تھی۔ ان سے اپنا دکھ درد بانٹ سکتی تھی۔

''اللہ کا کروڑ شکر ہے اللہ عائشہ کو بھی عقل دے۔'' راحت نے بیٹی کا دکھ دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ غلط نہ سوچ رہی تھی۔ فخر جیسا فرمانبردار بیٹا اور بہنوں پر جان نچھاور کرنے والا بھائی شادی کے بعد بدل گیا تھا۔ اس نے ماں یا بہن کی پرواہ کرنا چھوڑ رکھا تھا اور عدیلہ اور عائشہ کی لڑائی میں ہمیشہ بیوی کی سائیڈ لے کر بہن ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا۔

''امی آپ بجیلہ آپی کو بھی سمجھائیں وہ اپنا بسا بسایا گھر خراب نہ کریں۔'' عدیلہ نے زندگی کا بڑا سبق سیکھا تھا جس کا گہرا اثر ہوا تھا۔ آپی جب بھی میکے آتیں ہمیشہ سسرالیوں کے دکھڑے روتی تھیں انہیں اپنی غلطی کبھی نظر ہی نہ آتی تھی اور نہ ہی دل میں کبھی رشتوں کی چاہت جاگی تھی اور راحت نے بھی ہمیشہ بیٹی کی عدم برداشت کی عادت سے صرفِ نظر کیا تھا۔

گو انہوں نے کبھی بیٹی کو شہ نہ دی تھی مگر انہوں نے بیٹی کی ڈانٹ ڈپٹ اور باز پرس بھی نہ کی تھی۔ عدیلہ نے ماں کے سینے سے سر اٹھا کر ان کی پُرسوچ نگاہوں میں جھانکا تھا۔ جہاں ملال کا ہلکا عکس ہلکورے لے رہا تھا راحت نے نظریں چار ہونے پر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ عدیلہ اتنی سمجھدار ہوگی وہ ناواقف تھیں۔ وہ تو اسے زبان دراز اور لڑاکا سمجھتی تھیں۔ اکثر وہ عائشہ سے لڑائی میں اسے ہی چپ رہنے کا مشورہ دیتی تھیں انہوں نے محبت سے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

☆......☆......☆

گھر میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔ زید کی پروموشن کے بعد ثمرین کا رشتہ طے پا گیا تھا۔ مسز شمیم نے سرسوں ہتھیلی پر جمالی تھی۔ سجاد' زید اور زیاد معاذ اور اس کے والد سے مل چکے تھے

انہیں بھی لوگ مہذب اور سلجھے ہوئے لگے تھے۔
مسز شمیم منگنی کے جھنجٹ میں پڑے بغیر جلد شادی کی خواہاں تھیں۔ ثمرین نے جاب چھوڑ دی تھی اور وہ شادی کی تیاریوں میں لگ گئی تھی۔

دوسری بڑی خوشخبری زیاد کی جاب تھی۔ اسے یونیورسٹی میں اعزازی لیکچرار شپ کی آفر ہوئی تھی ڈیپارٹمنٹ میں میم سارہ رضوی ہائر اسٹڈی کے لیے آسٹریلیا جارہی تھیں ان کی سیٹ پُر کرنے کے لیے زیاد کو اس کی ذہانت و قابلیت کی بنا پر جاب آفر کی گئی تھی۔ جسے اس نے فوراً منظور کرلیا تھا۔

روبینہ اور سجاد کے چہرے اطمینان و خوشی سے دمک رہے تھے۔ زندگی مکمل اور پُرسکون محسوس ہورہی تھی۔ ہر فرد چہک رہا تھا۔ خوشی سے سبھی کے چہرے کھلے تھے سجیلہ سب گھر والوں کے درمیان موجود تھی۔ اس نے بنا کسی کے کہے خوشی کے موقع پر بریانی، چکن کڑاہی اور شیر خورمہ بنایا تھا۔ گھر میں اس کے ہاتھ سے بنی ڈشز زیاد اور ثمرین کو پسند تھیں۔

اس نے مینیو دونوں کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر ترتیب دیا تھا۔ روبینہ اس کے بدلاؤ اور دوستانہ موڈ پر خوش تھیں۔ ڈنر کے بعد اس نے سب کے لیے چائے بھی بنائی تھی اور ثمرین کے ساتھ مل کر کچن بھی سمیٹا تھا۔

''زید بیٹا تم کسی اچھی سی ہاؤسنگ سوسائٹی میں اقساط پر پلاٹ لے لو۔'' روبینہ نے بیٹے اور بہو کے جھگڑے میں دانستہ دخل نہ دیا تھا۔ وہ بیٹی کی محبت میں خودغرض بن گئی تھیں۔ وہ ثمرین کا بہتر جگہ رشتہ کرنا چاہتی تھیں جو کہ طے ہوگیا تھا گو ابھی شادی کے تمام تر اخراجات باقی تھے مگر انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہو کو الگ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہوں نے بیٹے کے بالوں میں چاؤ سے انگلیاں پھیریں۔

''امی......'' وہ خفگی سے پرے ہٹا تھا۔

''بیٹا میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ تم اپنی بیوی اور بچوں کی خاطر بہتر مستقبل کے لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔'' انہوں نے بیٹے کی خفگی یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

''بھیا آپ ہماری فکر نہ کریں میری سیونگز ابو کی پنشن اور امی کی کفایت شعاری سے شادی دھوم دھام سے ہوگی۔'' زیاد نے بھائی کی پریشانی بھانپتے ہوئے خوشدلی سے اسے تسلی دی تھی۔

''میں بہن کی شادی کے بعد سوچوں گا۔'' وہ انکاری تھا انداز سراسر ٹالنے والا تھا۔ زیاد کی سیونگز و تنخواہ ابو کی پنشن اور امی کی کفایت شعاری کے علاوہ اس کا کچھ فرض بنتا تھا جس سے وہ غافل نہ تھا۔ اپنے ذکر پر باہر گزرتی سجیلہ تجسس سے اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

''زید بیٹا ضد نہ کرو...... سجیلہ ہماری بہو نہیں بیٹی ہے۔'' یہ سجاد صاحب تھے جن کے متعلق سجیلہ نے کبھی اچھی رائے نہ رکھی تھی۔ بقول اس کے سجاد صاحب مٹی کے مادھو اور کم عقل تھے جنہیں اپنے گھریلو معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سجیلہ کا دل بوجھل ہونے لگا۔ روح پر بھاری بوجھ آن گرا تھا۔

اس سے زیادہ سننے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ یہ اس کے اپنے تھے جس سے اس نے بیر باندھے رکھا تھا۔ وہ مضمحل قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ زندگی میں کامیابی اور سکون کے لیے باہمی رشتوں کی مضبوطی اور تعاون بے حد اہم ہوتا ہے۔ اس نے ایک قدم بڑھایا تھا۔ سب نے

کھلے دل سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کی چال میں ہلکی لڑکھڑاہٹ ندامت کی غماز تھی۔

☆......☆......☆

''ثمرین کی بارات اگلے ہفتے ہے۔'' روبینہ اور سجاد نے شمیم اور حیدر سے دو چار ماہ کی مہلت مانگی تھی شادی کی تیاری کے لیے مگر انہوں نے خالی ہاتھ بہو لانے کی شرط دے کر انہیں جلد شادی پر آمادہ کرلیا تھا۔ یوں انہیں محض ڈیڑھ ماہ ملا تھا۔ انہیں یہ بھی غنیمت لگ رہا تھا۔ سجیلہ نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ ان کی فرمائش پر اکثر بازار چلی جاتی تھی۔ شادی کے کارڈ چھپ کر آئے تو وہ سب سے پہلا بلاوا سجیلہ کے میکے دینے چلی آئی تھیں۔ روبینہ کے چہرے پر مسرت پھیلی تھی۔

''کیا لڑکا غیروں میں سے ہے۔'' اچانک شادی کا بلاوا راحت کے لیے تعجب کا باعث تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کارڈ تھام کر استفسار کیا تھا۔

''جی ...... جی ماربل کا بزنس ہے...... اس نے بی اے کر رکھا ہے۔'' وہ چاؤ سے داماد کا ذکر کرنے لگی تھیں۔ اسی دوران عدیلہ ان کی آؤ بھگت کے لیے چائے لے آئی تھی۔

''آنٹی ثمرین کو میری طرف سے مبارکباد دیجیے گا۔'' اس نے محبت سے انہیں چائے کا کپ تھماتے ہوئے لگاوٹ کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔

''ضرور بیٹا...... تم بھی شادی پر آنا...... اور عائشہ کو بھی لانا۔'' روبینہ نے مسکراتے ہوئے عائشہ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اسے کہا تھا۔

''جی ضرور...... ہم سب آئیں گے۔'' عدیلہ نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

وہ بیٹے کے سسرال کم آتی تھیں۔ عدیلہ سے ان کا سامنا تو ہوتا تھا مگر وہ کبھی اتنی چاہت سے ان کے پاس نہ بیٹھی تھی۔ روبینہ نے اس کا شفاف چہرہ بے ساختگی سے تکا تھا۔

''عائشہ کہاں ہے؟'' انہیں آئے کافی دیر ہوچکی تھی مگر عائشہ نے آکر جھانکا تک نہ تھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی تھیں۔

''ہماری بہو کو گھر میں دلچسپی ہو تو نا......'' راحت بیٹی کی ساس کے سامنے پھیکی پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے قدرے غصے سے کڑھتے جلن نکالی تھی۔

''امی......'' عدیلہ کو ماں کی بے محل بات سخت بری لگی تھی وہ برتن اٹھانے کے بہانے ماں کو بلاتی وہاں سے چلی گئی تھی۔

''امی کیا ہوگیا ہے آپ کو...... بھابی ہمارے گھر کی عزت ہیں وہ آپ کی دونوں بیٹیوں کا میکہ ہیں اور آپ بڑی بیٹی کے سسرال میں اس کے میکے کی انسلٹ کر رہی ہیں۔'' راحت بیٹی کے بلانے پر سمدھن سے معذرت کرتی اس کے پیچھے لپکیں عدیلہ سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھیں روبینہ بیگم سے اس نے غصے و خفگی سے ماں کو سمجھایا تھا۔

''نہ میں نے کوئی غلط بات کی ہے یا عائشہ کو کچھ کہا ہے؟'' راحت بیٹی کے سمجھانے پر الٹا خفا ہو کر بگڑ یں تھیں۔ عائشہ نے روبینہ بیگم کو سلام تک کرنا گوارا نہ کیا تھا اور کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ انہیں بھی بہو کی غیر ذمہ دارانہ فعل پر غصہ تھا۔ رہی سہی کسر روبینہ کے استفسار پر پوری ہوگئی تھی۔ اور اب عدیلہ بھی اسی کی ہمنوا بنی انہیں ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔

''امی میں مانتی ہوں کہ آپ نے عائشہ بھابی کو کچھ نہیں کیا ہے مگر یوں آنٹی سے ذکر کرنا بھی نامناسب ہے۔'' عدیلہ نے رسانیت سے

مسکراتے ہوئے ماں کو قائل کرنا چاہا تھا مبادا وہ اندر جاکر دوبارہ عائشہ بھابی کے خلاف زہر افشانی کرتیں۔

''اچھا اچھا بس...... تم جا کر برتن دھو۔'' وہ بہو کی بدمزاجی سے تنگ تھیں جس نے مہمانوں کی عزت کرنا بھی چھوڑ دی تھی اور بیٹی بھی انہیں ہی سمجھا رہی تھی۔ وہ غصے سے بگڑتی پلٹ گئیں۔ عدیلہ انہیں تاسف سے دیکھتی آگے بڑھ گئی۔ ان کی ساری گفتگو سنتی روبینہ کے چہرے پر سوچ کا گہرا عکس نمایاں تھا۔ راحت دوبارہ ان سے محوِ گفتگو ہوگئی تھیں۔

☆......☆......☆

''کیا...... امی کیا کہا آپ نے؟'' سجیلہ بھابی کی بدمزاجی نے گھر بھر کو عاجز کر رکھا تھا۔ ایسے میں انہی کی بہن کو بہو بنانے کا خیال چہ معنی دارد...... زیاد اگلے روز کے لیکچر کی تیاری کر رہا تھا۔ ثمرین اسے اپنی شاپنگ دکھا رہی تھی کہ روبینہ نے بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کے لیے عدیلہ کو پسند کرنے کا عندیہ دیا۔ مانو زیاد کو کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اسپرنگ کی طرح اچھلا تھا۔ ثمرین بھی متعجب تھی۔

''کیا برائی ہے عدیلہ میں؟'' روبینہ نے بیٹے اور بیٹی کے متعجب ہونے پر منہ پھلا لیا تھا۔

''امی سجیلہ بھابی تنہا کافی ہیں۔'' زید نے اقساط پر پلاٹ خرید لیا تھا۔ اسکیم کے تحت اقساط ساڑھے تین سال چلنا تھیں۔ چونکہ اس کی انکم شاندار تھی۔ سو اس نے سال بھر کی اقساط بنوالی تھیں۔ اسکیم ڈائریکٹر نے اسے چھ ماہ بعد پلاٹ پر کنسٹرکشن کی اجازت بھی دے دی تھی۔ سجیلہ بھابی کا بگڑا موڈ رفتہ رفتہ نارمل ہو رہا تھا۔ شاید اس کی سادہ لوح اور نرم مزاج ماں بہو کی تبدیلی سے

خواب نگر کے راہی سُن

خواب نگر میں آنے والے
خواب نگر کے راہی سُن
میرے پیار کی میٹھی دُھن
میری کلائی کی چوڑیاں
میرے ہاتھوں کی یہ مہندی
میرے پاؤں میں پائل کی
چھن چھن
خواب نگر کے راہی سُن
میرے خوابوں میں
خواب بُن
میرے دل کی دھڑکن
کہتی ہے میرے پیار کی دُھن
تیرے نام یہ سب ہار سنگھار
نام تیرے یہ میرے خواب
تیرے نام بس تیرے نام
خواب نگر میں آنے والے
خواب نگر کے راہی سُن
میرے پیار کی میٹھی دُھن
خواب نگر کے راہی سُن

تمثیلہ لطیف

متاثر ہوئی تھیں۔ اسی لیے وہ دوسری بہن کو بھی بہو بنانے کے خواب دیکھنے لگی تھیں۔ زیاد نے صاف انکار کیا۔

''تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟'' روبینہ بیگم مشکوک ہوئی تھیں۔

''توبہ کریں امی...... میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔'' زیاد سخت برا مان گیا تھا۔ وہ نیک صفت یا سادہ لوح نہ تھا۔ وہ بھی ہر نوجوان کی طرح زندگی کے متعلق پلاننگ رکھتا تھا اور فی الحال اس کی ساری توجہ اپنے فیوچر پر تھی۔ اس کی جاب کے مستقل ہونے کے کافی چانسز تھے سو وہ انتھک محنت کر رہا تھا۔

''عدیلہ اچھی لڑکی ہے۔'' وہ اسی کے حمایت میں بولی تھیں۔

''پھر وہ کل کو آپ کو یا ثمرین کو گھر سے نکال دے گی تو مجھے نہ کچھ کہیے گا۔'' زیاد بھابی کی بدسلوکی سے سہا ہوا تھا دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ اس نے ماں کو ڈراوے دے کر ان کے فیصلے سے باز رکنا چاہا تھا۔

''میں تمہارے ابو سے شام کو بات کروں گی۔ ہم عدیلہ کا رشتے مانگنے جا رہے ہیں۔'' وہ رتی بھر ڈرے بغیر مسکرا کر بیٹے کے سر پر چپت رسید کرتی گویا ہوئی تھیں وہ اس کے دل کا بھید پا گئیں۔

''امی......'' زیاد مزید احتجاج نہ کر پایا تھا۔ اسے کوئی لڑکی پسند نہ تھی۔ اس کے لیے امی کی پسند اہم تھی۔

''امی ہم زیاد بھائی کی شادی بھی ساتھ ہی کر دیتے ہیں۔'' ثمرین دبے دبے جوش سے کھلکھلائی تھی۔

''بیٹا شادی تو ذرا مشکل ہے مگر منگنی کی جاسکتی ہے۔'' روبینہ نے فوراً تائید کی تھی زیاد جھینپا سا مسکرا دیا۔ وہ بھی مان گیا تھا۔ ثمرین ماں سے بھائی کی منگنی ڈسکس کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''سجیلہ تم اپنے گھر زیاد اور عدیلہ کے رشتے کی بات چھیڑو۔'' روبینہ نے شوہر کی رائے جان کر جانے سے پہلے سجیلہ سے بھی بات کرنا مناسب سمجھا تھا۔ ثمرین کے جہیز کے سوٹس کی پیکنگ میں مصروف سجیلہ اپنی جگہ بے یقینی سے سن رہ گئی تھی۔ زیاد جیسا شاندار اور برائٹ فیوچر والا بندہ ہی عدیلہ کا خواب تھا۔ اُدھر سے انکار کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ وہ مارے خوشی کے رو پڑی تھی۔

''سجیلہ بیٹا...... ہماری زندگیوں میں بے سکونی اور انتشار کی بڑی وجہ عدم برداشت اور خود پسندی ہے ہر شخص اپنی مرضی اور رنگ ڈھنگ سے غلط صحیح کا فیصلہ کیے بنا جینا چاہتا ہے اس پر طرہ یہ کہ وہ کسی کی اپنے معاملات میں مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔'' سجیلہ نے بھی یہی کیا تھا۔

فخر نے بڑے بھائی کا مان اور امی نے لاڈ دیا تھا۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار رہی تھی بلکہ اسی کی پسند کو فوقیت دی تھی۔ وہ بیاہ کر آئی تو اسے ہر معاملے میں شامل نہ کیا جاتا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ لڑکی بیاہ کر جائے تو وہ وہاں کے طور طریقے اپنا کر خود کو بدلتی ہے نہ کہ بیاہ کر آنے والی لڑکی کے لیے پورا گھرانہ خود کو بدلتا ہے۔

اس نے اپنی ذات میں تبدیلی لانے کی بجائے سسرال کے طور طریقے اپنائے بغیر اپنے ڈھب سے زندگی گزارنا شروع کیا تو اس کی کسی سے نہ بن پائی تھی اور حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے

کبھی گھر والوں سے گھلنے ملنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔

نجانے روبینہ بیگم کی کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے کبھی اس پر زیادہ روک ٹوک نہ کی مگر گھر والوں کی چاہت میں ڈوبا زید ہمیشہ اس پر اپنے گھر والوں کو فوقیت دیتا تھا حالانکہ یہ اس کی خام خیالی تھی۔ وہ غیر جانبداری سے دونوں فریقین میں اعتدال رکھے ہوئے تھا۔ زیاد اس کی غلطی پر بھڑک اٹھتا تھا مگر اس نے بھی کبھی ناجائز بدتمیزی نہ کی تھی۔ اک وہی تھی جو سب سے بیر باندھے ہوئے تھی۔ وہ ساس کی بے لوث محبت پر ندامت سے رونے لگی تھی۔ روبینہ بیگم سے اس کے آنسو نہ دیکھے گئے تھے انہوں نے محبت سے اسے گلے لگالیا تھا۔

''امی مجھے معاف کردیں۔'' دل و دماغ سے بغض کی گرد ہٹی تو رشتوں سے جھلکتا خلوص اور محبت نظر آنے لگا تھا۔ وہ ندامت سے شرمسار تھی۔

''تم میری ثمرین جیسی ہو بیٹا۔'' روبینہ نے بہو کی ندامت پر نہال اسے گلے سے لگالیا تھا۔

''امی زیاد مان جائے گا۔'' عدیلہ نے بھابی سے زبان درازی ترک کردی تھی۔ وہ معصوم دل لڑکی رشتوں کی اہمیت سمجھ چکی تھی۔ عائشہ بھی اس سے نہ لڑتی تھی۔ دونوں میں کافی بے تکلفی اور دوستی ہونے لگی تھی۔ امی دونوں سے کافی خوش تھیں۔ سجیلہ کے دل میں خیال آیا تو وہ تشویش سے پوچھنے لگیں۔

''جی بھابی...... آپ اپنی بہن سے پوچھ لیجیے۔'' زیاد بھابی کی بہت عزت کرتا تھا۔ لڑائی میں پہل ہمیشہ سجیلہ کرتی تھی۔ رشتوں پر پڑی خود غرضی و ضد کی گرد ہٹ چکی تھی۔ وہ مسکراتا بھابی کے سا۔ رکا تھا۔

''میرا دیور راضی ہے تو وہ بھی مان ہی جائے گی۔'' سجیلہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا۔

''سوری بھابی میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔'' زیاد محظوظ ہوتا سنجیدگی سے معذرت کرنے لگا تھا۔ روبینہ کو بے ساختہ اپنی کی تربیت پر ناز ہوا تھا۔

''مجھے شرمندہ نہ کرو، معذرت تو مجھے کرنی چاہیے تم سے۔'' سجیلہ نادم تھی۔ اس کی کوتاہیوں سے گھر میں بے سکونی پھیلی رہی تھی۔

اسے ہی گھر میں سکون اور خوشیوں کے لیے اپنا حصہ ڈالنا تھا ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ اپنی غلطی مان کر ظرف بڑا کرتے ہوئے معذرت کرلی تھی نہ کہ اکڑ بازی سے معاملہ بگاڑا جائے اور زیاد تو گھر کی خوشیوں کے لیے اس سے اُلجھتا تھا۔

''مٹھائی......'' ہر سو خوشی و سکون پھیلا تھا۔ ثمرین بھاگ کر مٹھائی لے آئی۔ وہ سجاد اور زید کو بھی بلا لائی تھی۔ زید نے مسکراتے ہوئے محبت سے اُسے دیکھا۔ وہ اسے دل سے قریب محسوس ہوئی تھی۔

''ہوں......ہوں......'' زید کی پُرشوق نظریں سجیلہ پر ٹکی تھیں۔ زیاد نے شوخی سے خوش گپیوں میں مشغول سجاد اور روبینہ سے نظر بچا کر ہنکارا بھرا تھا۔ زید جھل سا مسکرا دیا تھا۔ سجیلہ شوہر کی شوخ نظروں اور دیور کی شریر مسکراتی نظروں پر اتھل پتھل ہوتا دل لیے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ ان دونوں کا بے ساختہ فلک شگاف قہقہہ خوشیوں میں اضافہ کر گیا تھا۔

(خاصے کی چیز)

افسانہ

مسرت لغاری

ریڈ لائٹ ایریا

میرا مضبوط کردار ڈھے گیا۔ شدید طور پر مغرور، خوددار اور پتہ نہیں کیا کیا احساسات رکھنے والی ایک ضدی سی لڑکی اپنے ہاتھوں تباہ ہو بیٹھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تم نے یہ فتح کیسے حاصل کر لی؟ جس لڑکی نے اپنی عمر کے ڈھیر سارے برسوں میں کسی کو اس جذبے کے قابل ہی نہ سمجھا تھا تم نے اس میں کس طرح......

''تو گویا آپ Atheist ہیں؟''

''جی نہیں میں نے کہا تھا۔

''بات یہ ہے کہ ڈاکٹر خرم کہ مجھے میرا مذہب بے حد عزیز ہے لیکن وہ مذہب جو میرے اندر نے میری ذات کے لیے بنایا ہے وہ نہیں جو لوگوں نے بنا کر مجھ پر مسلط کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میرے خیال میں ایک دوسرے کو زبردستی اپنی بات سمجھانے منوانے والے لوگ بے وقوف ہوتے ہیں۔ اصل میں تو سبھی نے اپنی اپنی سوچ سمجھ کے مطابق الگ الگ عقائد بنا رکھے ہیں اور وہی عقائد سچے اور خالص ہیں۔ نصیحتیں وصیتیں چل سکتیں تو دنیا سے غلطیوں کا خاتمہ نہ ہو جاتا۔''

''تو آپ کا ذاتی مذہب آپ سے کیا کہتا ہے؟'' تم نے پوچھا تھا۔

''یہی کہ ہر انسان اپنے ذاتی حالات و واقعات کے حوالے سے خدا کو مانتا ہے۔ میری طرح میرے اکثر بھائی بند جب روحانی اور منطقی پیچیدگیوں میں گھر جاتے ہیں تو کبھی کبھار مارے بے بسی کے مکمل ور پر اپنے خلق کی جانب جھک جاتے ہیں اور کبھی اندر ہی اندر شدید کفر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ان دونوں کیفیات کا زبانی اظہار نہیں کر پاتے کہ بزدل ہیں اور میں یہ دونوں باتم کھلم کھلا کہتی ہوں۔''

''لیکن ہمیں ایک بڑی طاقت کے سامنے جھکنا ہی ہوگا۔'' تم اُلجھے ہوئے غصے میں بولے۔

''تمہاری مرضی۔'' میں نے بحث کو سمیٹتے وئے کہا تھا۔

''وہ کیا شعر ہے؟''

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

اور میرے پاس تو فالتو وقت بھی نہیں ہے زندگی پہلے ہی کیا کم......''

''زندگی بڑی خوبصورت چیز ہے نشاط......'' تم نے میری بات کاٹتے ہوئے اچانک کہا تھا۔

''اطلاع کے لیے شکریہ۔'' مجھے ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''یعنی مرنے کی خاطر زندہ رہنا...... کتنی بڑی بے بسی ہے۔''

''My Goodness......'' تم نے جھنجھلا کر سر ہاتھوں میں تھام لیا اور میں چپکے سے تمہارے پاس سے اٹھ آئی تھی۔

لیکن ڈاکٹر خرم یہ تو تیسری ملاقات تھی جس کے بعد درجنوں ملاقاتیں ہوئیں اور دراصل میں بات تو پہلی ملاقات ہی سے شروع کرنا چاہتی ہوں جس کے بعد تمہارے درجنوں روپ میرے سامنے آئے اور آج جبکہ میں تمہارے یہ تمام روپ سامنے رکھے پریشان بیٹھی ہوں تو تمہیں وہ سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں جو آج تک تمہارے اور میرے درمیان معمہ رہا۔ پر ایک وعدہ کرو خرم میری تمام باتیں غور سے سنو گے اور مجھے محض بچی نہ سمجھو گے۔ یوں بھی میں بچی کہاں ہوں۔'' میں تو اتنی بڑی ہوں کہ اپنے وطن کی عمر سے ایک سال چھوٹی ہوں۔ پھر میری باتیں بھی تو بالواسطہ طور پر تمہاری ہی باتیں ہیں تم انہیں کیسے نظر انداز کر سکو گے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے تم میرے کسی انٹرویو بورڈ کے چیئرمین تھے میں تمہیں اس سلسلے میں ملی تھی۔ بات صرف دو منٹ کی تھی۔ اور آج تمہاری اور میری دوستی ایک سال کے طویل عرصے پر چھا چکی ہے۔ تم نے بڑے روکھے انداز سے معذرت کی تھی اور اس طرح تمہارا پہلا روپ میرے سامنے انتہائی غیر مہذب اور غیر ہمدرد شخص کی حیثیت سے ابھرا' البتہ تمہارے چہرے کی وہ اذیت اب بھی مجھے یاد ہے جو میرے لباس میری گفتگو اور میری ریکویسٹ کے حیران کن تضاد نے پیدا کی۔

دوسری ملاقات تک کا درمیانی فاصلہ میں نے اپنے تلخ ترین حالات سے سمجھوتہ کرنے میں گزارا...... میرے اچانک حالات...... جو مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹے اور میری شخصیت کا سارا ٹھہراؤ اور تناؤ بکھیر گئے...... گھر والوں کے حکم اور پرانے



خاندانی وعدوں کے مطابق مجھے دولت کے انباروں میں گھرے ہوئے ایک ایسے شیطان کا گھر بسانا تھا جس کی آج تک میں نے شکل نہ دیکھی تھی جو کسی اونچے شہر سے بہت اونچا پڑھ کر آ رہا تھا لیکن انتہائی تنگ ذہنیت اور مختصر ظرف کا شخص جس کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ تب میری نظروں تلے زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ میں بغاوت پر تل گئی تھی۔ اور پھر ایک دن میں اپنی ذات کی تمامتر سنجیدگی اور خیالات کی تمامتر گہرائی کو اپنے ہی پاؤں تلے روندتی تمہارے پاس چلی گئی تھی۔ کسی ہاسپٹل میں سروس دلا کر تم میرا مستقبل بچا سکتے تھے۔ میرے پاس ایم بی بی ایس کی ڈگری تھی۔

تم نے میری بات بڑے غور تہذیب اور ہمدردی سے سنی اور اٹھ کر میرے قریب صوفے پر آ بیٹھے، میں نے دیکھا تھا تم میری پریشانی پر پریشان کم اور حیران زیادہ تھے۔..... تم صحیح سوچ رہے تھے خرم میں مالی اعتبار سے واقعی بے سکون نہ تھی اور نہ ہی میری خاندانی وجاہت کا یہ تقاضا تھا جو میں کرنے جا رہی تھی لیکن تمہیں اپنی ذاتی اُلجھن بتا دینا بھی تو کس قدر دشوار تھا۔ میں ایک غیر شخص کو ایک دم کیسے بتا دیتی کہ دراصل میں چند روز کے اندر تباہ کر دی جاؤں گی..... کل آسمان کو زمین پر گرا لیا جائے گا..... میری حساسیت کی موت واقع ہو جائے گی اور میرے اونچے خیالات کا قتل عام ہو جائے گا میں مارے غصے کے حواس سے بیگانہ گم صم بیٹھی تھی اور تم شاید ہمدردی کرتے کرتے میرے بہت قریب اٹھ آئے تھے۔ تب اچانک اپنے ہاتھ پر تمہارے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری آواز تیز ہو گئی تھی۔

''کیا کام کروانے کی خاطر یہ سب کچھ ضروری ہوتا ہے ڈاکٹر خرم؟''

''نہیں نہیں...... بالکل نہیں.....'' تم بھی مارے گھبراہٹ کے میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''دیکھیے آپ گھبرائیے نہیں...... میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔'' تم نے جیسے مجھ پر احسان کیا۔ جواب میں میں غصے سے کانپتی رہی۔

''معاف کیجیے آپ کو میرا قریب آنا برا لگا...... بخدا آپ مجھے تمام مردوں سے الگ پائیں گی...... مجھے اپنا دوست سمجھیے۔'' میں نے غصے اور غیر یقینی انداز سے تمہاری طرف دیکھا اور واپسی کے لیے مڑی۔

''خدا کے لیے مس نشاط شام کو میں گاڑی بھجواؤں گا آپ میرے پاس آئیے......آپ سے لمبی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے......آپ تو......'' تقریباً بھاگ کر تم میرے قریب آ کھڑے ہوئے اور التجا سی کرنے لگے۔

''نہیں.....'' میری زبان اور آنکھوں سے شعلے گر رہے تھے۔

''آپ بے حد ذہین ہیں......آپ سے مل کر بخدا مجھے خوشی ہوئی ہے...... بے حد...... بے حساب!''

اور میں لفظ 'ذہین' پر باوجود شدید غصے کے مسکرا پڑی۔ یہ وہ پرانا زنگ آلود حربہ تھا جو مرد عورتوں کے لیے ہمیشہ سے استعمال کرتے آئے ہیں اور مجھے پتہ نہیں تعریف کرنے والے پر کیوں ہمیشہ ترس اور ہنسی آ جاتی ہے۔ خیر کچھ بھی تھا تم نے میری مسکراہٹ سے حوصلہ پکڑ کر مجھ سے مثبت جواب لے لیا۔

اور میں نے...... جو زندگی اور انسانی نفسیات پر اپنے تئیں بڑی گہری نظر رکھتی تھی اچانک ہی...... ایک لمحے میں خود کو ایک نئے تجربے کے حوالے

کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
اور تیسری ملاقات وہ تھی جب تم نے مذہب کے بارے میں باتیں کی تھیں...... تمہاری بکھری ہوئی شخصیت کی وہ تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو تم صوفے پر ٹانگیں پھیلائے شدید جذباتی افراتفری سے دوچار جیسے نیم بے ہوشی سے بیٹھے تھے۔ آنکھیں بند کیے تم اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔ تمہارے پاؤں کے قریب ہیٹر کے سرخ تار چمک رہے تھے۔ ریسیور بے ترتیبی سے کریڈل سے قالین پر اترا پڑا تھا اور تمہارے نتھنوں سے گرم گرم جذبات کے بخارات نکل رہے تھے...... تب میرا دل دھم دھم بجا تھا...... میری چھٹی حس چیخنے لگی تھی۔
''نہیں نہیں خرم تم آج مجھے عام مردوں سے ہٹ کر نہیں مل سکے گا...... اگر دوست کی حیثیت سے بھی ملے گا تو میرا نقصان ہی کرے گا...... مارے خوف اور گھبراہٹ کے میں جلدی جلدی تمہارے کمرے کا جائزہ لینے لگی جو آج خاص طور پر مجھے پُراسرار سا لگ رہا تھا ایک جی چاہا واپس بھاگ جاؤں پچھتاوے کی اذیت میری ٹانگوں کو بے جان کرتی چلی جارہی تھی اور پھر میں تقریباً گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔
تم لپک کر اٹھے اور میرے بہت قریب آ کر بیٹھ گئے۔
''میری جان......'' تم شروع ہوئے اور میں ایسے تمام واقعات کا مقابلہ کرنے کے لیے اندر سے تننے لگی۔
''آپ اتنا پیچھے کیوں ہٹ رہی ہیں؟ گھبرا کیوں رہی ہیں؟''
''جی......'' میں نے جھنجھلا کر تمہاری طرف غور سے دیکھا اور پھر تمہاری بے بسی پر مسکرا پڑی۔
تم میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔
''ہمیں تو سینکڑوں لڑکیاں اپنا آپ آفر کرتی ہیں نشاط...... اور ہم...... ہم تو......''
''کیوں......؟'' حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔
''محض اپنی تسکین کے لیے......'' تمہاری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔
''اور آپ اُن تمام کو خوش کر دیتے ہیں...... خدا خوفی سے؟''
''نیور...... نیور......'' تم چیخ سے پڑے مگر پھر ایک دم مجھے قائل کرنے لگے۔
''لیکن مغرب میں تو یہ سب کچھ چلتا ہے۔''
''لیکن آپ اس وقت کہاں ہیں؟''
''اپنی نشاط کے پاس......'' تمہاری آنکھوں کا نشہ تمہاری آواز میں اتر آیا تھا۔
''جی نہیں...... ایک خالص مشرقی ملک میں۔'' میں نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔
''See......'' تم ذرا سا ہٹ کر بیٹھ گئے...... اداس سے...... سنجیدہ سے...... تھکے ہارے سے...... اور شاید یہی وہ ایک لمحہ تھا جب تم مجھے ذرا سے اچھے لگے...... زبردستی تم یقیناً نہ کر سکتے تھے لیکن تم نے زبردستی کی بھی تو نہیں تھی...... تمہاری سادگی اور شرافت کی دھوم پر مجھے تھوڑی دیر کے لیے اعتبار سا آ گیا...... تمہاری ان تمام حرکات کو آزمائش کے کھاتے میں ڈال کر میں نے تمہارے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھی اور...... لیکن اگلے ہی لمحے پھر تمہاری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔
''نشاط...... میرے قریب بیٹھ کر آپ کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا؟ کوئی گرمی...... کوئی ہیجان...... کوئی......؟''

''جی نہیں......'' میں نے اپنا لہجہ سپاٹ رکھا۔
میرا یہ جواب سن کر تمہیں شدید جذباتی دھچکا لگا اور تم سنبھل سے گئے بلکہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب میں نے اچانک تم سے سوال کیا۔
''اپنی ازدواجی زندگی سے تو آپ مطمئن ہیں نا؟''
''یقیناً یقیناً...... مکمل طور پر......'' تم نے دونوں بازو پھیلا کر بڑی خوش دلی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔
''تو پھر میرے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔'' میری آواز ڈوب رہی تھی۔
''نہیں نشاط...... ہرگز نہیں...... میں ایسا کبھی نہیں تھا۔'' تم پھر بلبلا اٹھے۔
''تو پھر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا کہ اچانک تم غور سے میری جانب دیکھنے لگے۔ پھر اپنی پیشانی پر انگلی رکھ کر بڑی سچائی اور خلوص سے میری ذہانت سے متاثر ہونے کا نعرہ لگایا۔
''بلکہ دیکھیے مس نشاط......'' تم بالکل میرے قریب آ کھڑے ہوئے۔
''واقعی آپ کی سوچ درست ہے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے یوں بھی آپ کا کام کرنے سے پہلے میرا ایسا کرنا اصولاً غلط ہے...... میرے ضمیر کا بوجھ بڑھ جائے گا۔''
اور کام ہو جانے کے بعد میرا ایسا کرنا میری موت ہوگا۔ میرا ضمیر مجھے پتھر مارے گا ڈاکٹر خرم کہ میں نے اپنے مقصد کی خاطر اپنی سوچ بیچ ڈالی تھی۔ تمہیں پرکھے بغیر ضرورتاً اچھا کہہ دیا تھا اور تم پر اعتماد کیا تھا اور سوچ کا گناہ تو سب سے بڑا ہوتا ہے...... سارے گناہوں کا راستہ کھول دیتا ہے۔
''وعدہ کریں آپ میری دوست رہیں گی......'' تم ابھی تک آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

''سوچوں گی۔''
''نہیں نشاط نہیں...... خدا کے لیے مجھے جاتے ہی فون کریں۔ ابھی...... اسی وقت جا کر...... ورنہ ...... ورنہ......'' تمہاری آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔
''سوچوں گی......'' میں نے دوبارہ اپنے الفاظ اور اپنی سوچ کو دہرایا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔
اور پھر......
واپس آئی تو میں موت اور زندگی کی کشمکش میں گھر گئی۔ مختلف سوچوں نے مجھے پاگل کر دیا۔ گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر میں آنکھیں بند کیے اس سارے حادثے کی یلغار کے بارے میں سوچتی رہی۔
ایک سوچ کہتی تھی' دراصل اس کے چہرے کی معصومیت اور طبیعت کی سادگی نے اس کی شرافت کی شہرت کو Support کر رکھا ہے ورنہ لڑکیوں کی Offer اسے یاد ہے تو وہ اس راہ پر آگے بھی بڑھا ہوگا۔ اسے ان کی اتنی بڑی مجبوری کیسے پتہ چلی ہوگی۔
دوسری سوچ کہتی۔ نہیں نہیں وہ اتنا عام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ عام ہوتا تو میں اس سے اتنی زیادہ متاثر کبھی بھی نہ ہوتی...... اس میں یقیناً کوئی روشنی ہے جس نے میرے اندر کی تمام روشنیاں ڈھانپ لی ہیں۔ آخر اس کے بارے میں' میں اتنی دیوانگی اور تسلسل سے کیوں سوچے جا رہی ہوں...... وہ یقیناً غیر معمولی ہوگا...... اس میں اس کی ذات کا ایک خاص وقار موجود ہے...... اس میں......
اور پھر بیک وقت بہت سی سوچوں نے میرے دل و دماغ میں ادھم مچا دیا۔
وہ شادی شدہ ہے...... چار بچوں کا باپ

ہے.....اس کے دل میں عشق یا دوستی کا جذبہ باقی نہ بچا ہوگا..... اس نے پندرہ سال کی ازدواجی زندگی.....اس نے.....

وہ عام سا مرد ہے میری مجبوری کو کمزوری بنا کر کھیلنا چاہتا ہوگا۔ اور بخدا مجھے کدھ تو اسی بات کا تھا خرم کہ ایسا کرنا بہت پرانا ڈرامہ تھا۔ اے کاش تم دھوکے کا کوئی نیا اور خوبصورت انداز اپناتے..... میرا ذہن جو اتنا جدید تھا تم سے کسی جدت کی توقع کر رہا تھا۔

وہ جذباتی اعتبار سے ہرگز مطمئن نہیں.....خود کو پُرسکون ظاہر کر کے اس نے اپنا ذہنی انتشار چھپایا تھا..... دوستی کی التجا ہی تو اس کا ذہنی انتشار تھا۔ وہ زندگی سے سمجھوتہ کیے ہوئے ہے.....وہ زندگی سے خوش نہیں ہے۔ غیر دلچسپ زندگی چہرے پر سے ذہانت کی روشنی چاٹ لیتی ہے اور کسی کسی لمحے واقعی مجھے تمہارا چہرہ بے رونق بھی لگا تھا۔

اور آخری سوچ وہ تھی خرم جس نے مجھے اپنی نظروں سے گرا دیا۔ بھلا مجھے کسی کے بارے میں یہ سب کچھ سوچنے کا کیا حق تھا.....تم جو کچھ بھی تھے میرے تو کچھ بھی نہیں تھے۔ لیکن یہ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ دراصل انسان انسان کے بارے میں کتنا غلط بھی سوچ سکتا ہے بلکہ جو جی چاہے سوچ سکتا ہے۔ تم نے بھی تو میرے بارے میں اپنی مرضی سے سوچا جو آگے چل کر میں تمہیں بتانے والی ہوں۔

خیر تمہاری تیسری ملاقات اور اس دن کی جذباتی بے بسی کا منظر مجھے مکمل طور پر تو اپنی گرفت میں نہ لے سکا خرم تاہم مجھے تمہارے بارے میں سوچتے رہنے کی بیماری ضرور لگ گئی جس پر بڑی سوچ بچار کے بعد یہ سوچ کر میں نے قابو پا لیا کہ تمہارے ساتھ دوستی نہیں رکھوں گی اور ہمیشہ کی طرح اپنے آپ میں رہوں گی..... ہاں میں..... جو تمہاری نسبت زیادہ خوبصورت ہوں..... گہری ہوں.....غیر شادی شدہ ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکیزہ ہوں۔

میری عزت نفس اور میرے غرور نے آج تک کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا اور بخدا ڈاکٹر خرم یقین رکھو اگر تمہارے ساتھ ملاقات سے پہلے میرا ذہن کسی بھی دوسری جانب مصروف ہوتا تو میں تمہیں پوری خود اعتمادی سے رد کرتی کہ مجھ میں خود اعتمادی' جرأت اور بے باکی کی کبھی بھی کمی نہیں رہی.....لیکن سنو ڈاکٹر خرم میرے ساتھ یہی تو سب سے بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے کہ میں ایسا نہ کر سکی اور میری 'میں' ٹوٹ گئی۔

میرا مضبوط کردار ڈھے گیا۔ شدید طور پر مغرور' خوددار اور پتہ نہیں کیا کیا احساسات رکھنے والی ایک ضدی سی لڑکی اپنے ہاتھوں تباہ ہو بیٹھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تم نے یہ فتح کیسے حاصل کر لی؟ جس لڑکی نے اپنی عمر کے ڈھیر سارے برسوں میں کسی کو اس جذبے کے قابل ہی نہ سمجھا تھا تم نے اس میں کس طرح یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اور پھر آناً فاناً پوری قوت سے اس کے حواس پر چھا گئے۔

سوچتی ہوں کیا آج تک میرا شعور اپنی تمامتر پاکیزگی' سچائی اور گہرائی کے ساتھ تمہارے ہی انتظار میں رہا.....تم..... جو سائنس کے طالب علم ہو..... اتنے خوبصورت بھی نہیں ہو..... اتنے گہرے بھی نہیں ہو.....خاص بھی نہیں ہو.....خاص اس لیے نہیں ہو کہ تم نے بھی تو عام اور چھوٹے آدمیوں کی طرح میری مجبوری کو کئی کئی مہینوں تک کھینچے رکھا تھا اور مجھے یاد ہے میرا کام تم نے اس دن کیا تھا جب ایک شام یونہی تمہیں ملنے کو جی چاہا تھا۔ تمہیں سمجھنے کی خاطر تمہاری دوسری کا اقرار کرنے

گئی تھی پھر وہ بھی اس لیے کہ مستقل طور پر تمہارا شہر چھوڑ رہی تھی۔ تب تم بڑے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے تھے جیسے اب تک تم میرے اسی فیصلے کے انتظار میں تھے...... صبح تم نے میرا کام کر دیا تھا۔

لیکن میں مطمئن تھی...... میرا کردار بے داغ تھا...... میں نے اپنی مجبوری کے دوران اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کیا تھا...... تمہاری دوستی قبول نہیں کی تھی یہاں تک کہ تمہارے ساتھ کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی۔

تم اچھی طرح جانتے ہو خرم میرا مقصد نکل جانے کے بعد تم مجھے دوستی پر ہرگز ہرگز مجبور نہ کر سکتے تھے۔ میں تمہیں پوری طرح اگنور کر سکتی تھی اس لیے کہ اب تاش کے سارے پتے میرے ہاتھ میں تھے لیکن اب میرے سامنے میرے اپنے الفاظ کا پاس لحاظ تھا۔ تب میں نے ایک خوبصورت ذہنی دوستی نبھانے کی قسم کھالی...... اور یہ قسم کیوں کھالی...... آؤ خرم آج تمہیں یہ بھی بتا دوں...... دراصل اس دوران تم مجھے اچھے لگنے لگ گئے تھے بے حد اچھے...... بخدا اتنے اچھے کہ بعض اوقات باقاعدہ تم پر غصہ آجاتا تھا کہ آخر کس کو اتنا اچھا لگنے کی بھی کیا ضرورت ہے...... ایک دفعہ تو جی چاہا کہ جا کر تمہارا کالر پکڑ لوں اور کہوں دیکھو خرم میاں برائے مہربانی مجھے اتنی گرم گرم سوچیں نہ بھیجا کرو پگھل جاؤں۔ سوچوں کی اتنی آگ بھیج دیتے ہو کہ بخار کی آگ میں جلتی رہتی ہوں...... بند کرو سوچوں کا یہ کاروبار...... ورنہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے بھی گریز نہیں کروں گی، لیکن کیسی عدالت...... اور پھر مجھے یقین ہے تم کہتے نشاط جی ایسی کوئی بات نہیں ہے میں اتنا مصروف انسان ہوں کہ بھلا میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں کہ......

اور میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں سمجھاتی۔

''دیکھو خرم تم میری ایک بات سنو تم دنیا کے ہر جذبے کو میرے سامنے جھٹلا سکتے ہو...... ہر بات کو ہر احساس کو غلط ثابت کر سکتے ہو لیکن روح کی صرف اس ایک سچائی سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہماری روح کا دوسری روح سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ اتنا سچا اتنا گہرا اور اتنا مضبوط کہ بخدا بعض اوقات معجزوں کی سی حیرانی ہونے لگتی ہے۔ صرف یہی تو واحد جذبہ ہے جس میں کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوتی۔ انسان کی Telepathy کبھی جھوٹ نہیں بولتی خرم...... بول سکتی ہی نہیں اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم ایک روز گھبرا کر یہ کیسے کہہ دیتے کہ نشاط میری جان زیادہ ڈسٹرب ہوا کرو تو میری یاد کو سینے سے لگا کر سو جایا کرو۔

سائنس کا ایک طالب علم یہ بات کیسے کر سکتا تھا؟ تم یقیناً اس تجربے سے گزرے تھے اور برا نہ مان جاؤ تو آؤ خرم تمہیں یہ بھی صاف صاف بتا دوں کہ تم اپنے جذبات کو مجھ سے ہرگز ہرگز نہیں چھپا سکتے۔ مجھے قسم ہے تمہارے اس پیار کی جس کو مجھ ہی سے مختلف پردوں میں چھپاتے اور لپیٹتے پھرتے ہو تم ہر رات میرے لیے جاگے ہو...... تم نے کروٹ پر کروٹیں بدلی ہیں...... رونے کی حد تک بے قرار ہوئے ہو اور ہر روز ہر لڑکی میں میرا ہی عکس دیکھ کر بے چین ہوئے ہو...... میرے اندر تمام کے تمام جذبات تمہارے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں پھر تم ان تمام احساسات کے خالق ہونے سے کیسے منکر ہو سکتے ہو؟ آخر تمہیں یہ کس نے مشورہ دیا تھا ڈاکٹر خرم کہ ہر ملاقات پر میرے سامنے اتنی بے قراری کا اظہار کرو کہ جھنجلا جاؤ...... گھنٹوں میری جانب دیکھو...... لمحے بھر میں لاتعداد سانسیں لے ڈالو اور کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جایا کرو...... تم نے

سینکڑوں مرتبہ مجھے اس آگ میں جھونکا اور پھر اپنی خود اہمیتی کے لیے اپنے دوست کو خدا جانے کیا کیا قصے سنائے...... میرے مر مٹنے کی داستانیں...... دوستی قبول کر لینے کو میری شکست بنا کر پیش کیا اور اسے یہ کبھی نہ بتایا ہوگا کہ تم کس کس طرح منتیں کر کے مجھے اپنے گھر بلواتے تھے...... بیوی کو میکے پہنچا کر گاڑی میری طرف بھجواتے تھے۔

ایک رات برستی بارش اولوں اور آندھی کی یلغار میں رات کو مجھ سے ملنے آئے......تم نے اسے یہ بھی نہ بتایا ہوگا کہ تم ہر روز مجھے فون کرنے کو کہتے تھے اور کسی دن اگر میں فون نہ کر سکتی تھی تو تم مارے غصے اور مایوسی کے دس دن میرا کام آگے کر دیتے تھے......اور بھلا تم اسے یہ کیسے بتاتے کہ میں نے جب کبھی بھی تمہیں فون کیا تم نے بے تاب ہو کر فوراً کہا۔

”آجاؤ میری جان...... اسی وقت...... اسی لمحے......اور اس مقام کو اگر تم یہ کہو کہ میں بھی تو تمہاری حوصلہ افزائی کرتی رہی تو سنو، یہ انکشاف بھی سن لو کہ میں اپنے کردار کی تمامتر مضبوطی کے باوجود گوشت پوست کی انسان ہوں۔ بخدا مجھ جیسی خود دار لڑکی کبھی نہ ٹوٹ سکتی تھی اگر تمہاری جانب سے غیر معمولی پیار کا اظہار نہ ہوتا...... میں اپنے مقصد کی خاطر تمہاری طرف نہ جھکی تو کام نکل جانے کے بعد کیسے جھک سکتی تھی۔ اور دراصل یہی تو میری شکست ہے کہ تمہاری بے چینیوں سے شدید طور پر متاثر ہوتی چلی گئی اور یہ عام عورتوں کی عام نفسیات والی بات بھی نہیں ہے بلکہ قسمیہ کہتی ہوں یہ سب کچھ تمہاری جانب سے ہوا ورنہ بھلا میں...... ہاں میں آنکھیں بند کیے ایک ایسے شخص کی جانب کیسے بڑھ سکتی تھی جو اکیلی ذات نہ تھا...... جس کا پیار تقسیم ہو چکا تھا اور اس جس کے جذبات باسی ہو چکے تھے...... جو چار وجودوں کو انگلی سے لگائے لگائے میری زندگی میں داخل ہوا...... کیا مجھے داد بھی نہ دو گے خرم کہ تم جیسے شخص سے دوستی کرنا کتنا مشکل کام تھا...... کس لڑکی نے اتنی ہمت کی ہوگی...... المیہ تو یہی ہے کہ جب میں یہ سارے زخم کھا چکی......ان تمام تلخ حقائق کے باوجود تمہارے ساتھ ایک سچی اور خاص دوستی پال بیٹھی تو تم نے مجھے غلط سمجھنا شروع کر دیا...... کیا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں کہ تم نے بیوی بچے اور گھر بار رکھنے کے باوجود میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا...... اگر میرا ضمیر مجرم ہے تو سب سے بڑا جرم تو تمہارے اپنے ضمیر کا ہے...... یا پھر تم میری دوستی سے اپنی زندگی کو محض رنگین بنانا چاہتے تھے۔

اور مجھ پگلی کو دیکھو یہ سارے حالات جانتے ہوئے بھی تمہیں اپنا پیار کا جذبہ دے بیٹھی...... دنیا کا قیمتی ترین جذبہ جس پر پوری کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے...... جس کے سہارے زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے اور جس کی چاشنی زندگی میں نہ ہو تو خودکشی کرنے کو جی چاہے...... کیا میرا یہی احسان کم ہے خرم کہ میں نے تمہیں عمر بھر کے اس حصے میں رنگین خیالات کی خوبصورتیاں دی ہیں جب تم انتہائی غیر دلچسپ وقت گزار رہے تھے...... اپنے پیشے سے تھکے ہوئے تھے۔ ملازمت کی مصروفیات میں اُلجھے ہوئے اور گھریلو زندگی کی یکسانیت سے تنگ آئے ہوئے...... میں نے تمہیں دلچسپ ترین احساسات و خیالات دیتے ہیں...... تمہاری راتیں میرے تصورات سے گل رنگ ہو گئیں۔ اس سے بڑھ کر میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ جس طرح ایک عمارت کو گرا کر اس بنیاد پر دوسری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اس طرح تمہارے پیار کی بنیاد بھی میری شخصیت

کے ملبے پر کھڑی کی گئی ہے۔ میں جو اندر سے پوری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں تم سے توقع کر رہی ہوں کہ کبھی تو میرے پاس ہمدردی کرنے آ بیٹھو...... کیا ایک دوست کی حیثیت سے تم میرے ساتھ میری ذات کے ماتم میں شریک بھی نہ ہو گے؟ یہ ساری کہانی جو میری 'میں' کے ٹوٹنے کا ماتم ہے...... میرے کردار کی شکست کا نوحہ ہے...... کیا اس کو سن کر تم رو بھی نہ دو گے...... سچ کہتی ہوں خرم کبھی میرے پاس آ بیٹھو تو تمہیں اپنی انا کے ٹوٹنے کی داستان سناؤں گی...... نہایت دلچسپ اور بڑے حوصلے کے ساتھ سنا ہے اس دنیا میں خوبصورت ترین منظر انسان کی انا یا خودداری کے ٹوٹنے کا ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات کی اہم ترین خوراک...... دراصل کائنات کا سارا جھگڑا ہی تو یہی ہے خرم...... آج کل میں بھی اپنی ذات کے انہی جھگڑوں میں گھر گئی ہوں کبھی کبھی سوچتی ہوں میری شکست کی باتیں سننے تم کبھی نہیں آؤ گے یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہی تو ہے اور پھر فاتح لوگ کسی کی شکست کا احساس کرنے لگیں تو یلغاریں ہی کیوں کریں؟ ہاں تم بتاؤ خرم کبھی تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ تم نے مجھے بلاوجہ اپنے اتنے قریب کر کے اچھا نہیں کیا...... یوں بھی اکثر تم چہرے سے مجھے پُرسکون ہی نظر آتے ہو...... احساسات سے عاری...... دنیا کی سطحی باتوں میں پھنسے ہوئے جیسے دولت کمانے کی فکر میں ہانپ گئے ہو...... خدا کے لیے خرم کبھی تو گہری باتیں بھی سوچا کرو...... میرے فلسفے کے مطابق تو سکون انسان کو اندر باہر سے شل کر دیتا ہے اور خدا نہ کرے کہ تم کبھی شل ہو کر جیو...... میں تمہیں دکھی بھی نہیں دیکھنا چاہتی لیکن دکھوں کے بغیر نازک احساسات بھی تو مر جاتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے خرم...... دکھ ہماری اصلیت شخصیت اور روحانی چمک کی بنیاد ہیں۔ ا
کے بغیر مجھے زندگی جانوروں کی سی لگتی ہے۔ ا
مجھے دیکھو مجھے اگر کوئی اور دکھ نہ بھی ہو تو یہی دکھ
میرے لیے بہت بڑا بن جاتا ہے کہ دنیا میں ا
دکھ کیوں ہیں؟ بخدا میں تو ایک ایک انسان
ایک ایک دکھ کے لیے ساری ساری رات تڑ
ہوں۔ زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے گہ
عبادتیں کی ہیں۔ تمام مذاہب کو کھنگال ڈالا
سکون پھر بھی نہیں آتا۔ یہ کیسی بے قراری ہے
مجھے اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے۔ یقین کرو بعض
اوقات تو اپنی رضائی کی کٹیا بنائے پوری پوری را
جاگتی رہتی ہوں چپ چاپ اندھیرے میں اٹھ
بیٹھ جاتی ہوں اور کائنات اور زندگی کے بارے
اتنا سوچتی ہوں کہ دماغ گھومنے لگتا ہے۔ شاید
انوکھا سا کام کر جانا چاہتی ہوں...... لوگوں کے
زندگی کو آسان بنا دینا چاہتی ہوں...... لیکن یہ س
کچھ کیسے ہو گا؟ یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے
لوگوں کے چہرے پڑھنا اور دلوں تک اتر نا
مشکل کام ہے خرم' اور سچ جانو کبھی کبھی تو انس
نفسیات سمجھتے سمجھتے اور کسی نتیجے تک پہنچتے پہنچتے تھ
جاتی ہوں۔

تم باؤ خرم کبھی تم نے بھی زندگی کے بارے
سوچا ہے؟ تمہیں یہ زندگی کیسی لگتی ہے؟ بخدا بعض
اوقات تو اپنی سوچوں سے ڈر بیٹھتی ہوں۔ ایک سو
آتی ہے تم جیسے لوگ شاید زندگی کو بہتر طور پر
ہوئے ہیں جو زندگی کو بہت ہلکا سمجھتے ہیں۔
سوچتے ہیں اور رات کو پورے آرام سے سو جا
ہیں۔ یا شاید میں یہ بھی غلط ہی سوچ رہی ہوں
معلوم تم اندر سے کتنے گہرے ہو؟ کیا کچھ سو
رہتے ہو؟ تم نے بھی تو کبھی کھل کر میرے سا
باتیں نہیں کیں اور ایک میں ہوں کہ آج ڈھیر

ڈھیر باتیں کیے جا رہی ہوں کچھ بھی ہو خرم تم نے مجھے اتنا زیادہ قریب کر کے اچھا نہیں کیا...... میں ایک طوفان میں گھر گئی ہوں اپنی تمام تر سنجیدگیوں اور گہرائیوں سمیت...... تم اس طوفان کو جذبات کا طوفان بھی نہیں کہہ سکتے کہ میں نے کبھی اتنی ہلکی باتیں نہیں سوچیں۔ نہ ہی کبھی میں نے کبھی تمہیں جسمانی قربت کی اجازت دی' تاہم کچھ تو ہے کہ میں تمہیں بھلا نہیں سکی...... بھلا نہیں سکتی...... یقین کرو خرم اگر احساسات پر پابندی لگ سکتی تو شاید میں اپنی ذات کے لیے ظالم ترین ثابت ہوتی۔

خاص طور پر تمہاری آخری ملاقات تو میرے لیے اور بھی قیامت بن گئی ہے۔

تم نے مجھے فون کیا تھا کہ عنقریب تمہارا ایک دوست کراچی سے ارہا ہے جو ہماری طویل ملاقات کا انتظام کرے گا۔

اور چند روز بعد تمہاری آواز ٹیلی فون پر کانپ رہی تھی۔

''سنو نشاط جی آج عظیم بارہ بجے پہنچ رہا ہے۔''

''پستی کے کام کرنے......؟'' میں نے پوچھا اور تم ہنس پڑے۔

''گھبراؤ نہیں جان وہ میرا بہت گہرا دوست ہے کل وہ تمہیں میرے پاس گھر میں لے آئے گا۔''

''لیکن میں اس کے ساتھ نہیں آؤں گی۔'' مارے غصے کے میری آواز لرز رہی تھی۔

''کیوں......'' تم چیخے۔

''وہ تمہارا دوست ہے میرا نہیں...... مجھ سے کسی Large Scale پر شکریہ ادا کروانے کا ارادہ تو نہیں؟''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... چلیے صرف ڈرائیور ہی نکل جائیں گے۔'' تم نے ہنس کر کہا اور فون رکھ دیا۔

اور سنو خرم یہ وہ دن تھا جب میں اپنی ذات کے اندر مر گئی تھی۔ اس دن میں وقت کے ہر لمحے میں مرتی رہی اور زندہ تو اب میں شاید کبھی نہ ہو سکوں۔ اس سے زیادہ بھاری وقت مجھ پر پہلے نہیں پڑا تھا خرم...... پورا دن میں صبح سے شام تک تنہائیوں میں چھپ چھپ کر روتی پھری...... پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک دھڑکتی رہی میرے کمرے کا کوئی کونہ ایسا نہ تھا جہاں میرے آنسو نہ گرے ہوں...... ایک عجیب سی اذیت ناک کیفیت دل کو مسلتی تھی...... تمہارا چہرہ لمحہ بھر کو آنکھوں کے سامنے آتا تو اندر ہی اندر خوف کے میری چیخیں نکلنے لگتی تھیں...... دل دھڑک دھڑک کر جیسے ٹھہر گیا تھا...... اور کبھی کبھی تو لگتا تھا واقعی میں مر رہی ہوں...... میرا سانس رک رہا ہے۔ پسینے میں نہائے جا رہی ہوں اور پھر شل ہو کر گر گئی ہوں۔

شام چھ بجے مجھے اطلاع ملی عظیم آیا ہے۔

اور میں جو لاش بنی بیٹھی تھی اور ابھی تک بال سنوار رہی تھی کنگھی ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر اس کا ایک نظر جائزہ لینے باہر نکلی۔ وہ سینے پر بازوں کا کراس جمائے کھڑا تھا۔

''عظیم صاحب......'' میں نے اس کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

''جی...... میں دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے بازوؤں کا کراس کھولے بغیر کہا۔

''بدتمیز......'' ایک لمحے کے لیے میں سخت جھنجلا گئی پھر اُس سے پانچ منٹ کی مہلت لے کر اندر آ گئی اور کمرے تک آتے آتے ایک مرتبہ پھر میں دھڑک دھڑک کر نیم جاں ہو گئی' آنسوؤں کے سیلاب نے مجھے پاگل کر دیا...... یہ مجھے کیا ہو گیا تھا

میں کیا کررہی تھی۔ کہاں جارہی تھی کیوں جارہی تھی؟ کس کے ساتھ جارہی تھی؟ کس کے پاس جارہی تھی؟ میں سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ میرے اندر چیخوں کا طوفان ابل پڑا تب میں نے پتہ نہیں کیا فیصلہ کیا کہ آپا کو بلا کر کہا۔

''جاؤ آپا ماں باہر والے صاحب سے کہو میں ان کے ساتھ نہیں جاسکوں گی...... میری طبیعت خراب ہوگئی ہے...... جاؤ اسے کہو کہ پھر کبھی بھی...... جاؤ جلدی سے ماں...... اور......''

اور پھر مارے دکھ کے میں اور بھی زمین میں گڑ گئی...... آپا نے ایک قدم بھی دروازے کی طرف نہیں اٹھایا تھا بس گم صم سی کھڑی رہی۔ میری طرف ایک ٹک دیکھے گئی جیسے میری آنکھوں کی سرخی اور چہرے کی زردی سے کوئی کہانی ترتیب دے رہی ہو اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش لگ گئی۔

''کیا بات ہے نشہ جی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

اور میں کیا جواب دیتی اسے......

سنو خرم میں اسے کچھ بھی نہ بتا سکی کچھ بھی نہ کہہ سکی بس پھٹ پڑی۔ اس کے کندھے پر سر رکھے میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں کی آگ نے مجھے بھون کر رکھ دیا...... وہ بڑے دکھ سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور میں کٹ کٹ کر قبر میں اتر رہی تھی...... اسے میں یہ کیسے بتاتی کہ نازک احساسات کی یہ لڑکی مٹی کے تودے کی طرح کیوں گھل رہی ہے۔ وہ کس کے پاس جارہی ہے تب میری بوڑھی آپا مجھے بستر پر لٹا کر چپ چاپ باہر نکل گئی۔

وقت بہت کم تھا اور فیصلہ مجھے بہت بڑا کرنا تھا...... ایک طرف زمانے کی کمینگی تھی جس میں میری تمہاری اور سب کی کمینگی کا حصہ ہے دوسری جانب ایک عورت تھی جسے بار بار تم یاد آرہے تھے اتنی شدت سے کہ اس کا دل و دماغ چکرا رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا میں نے محسوس کیا کہ میں اچانک اپنے عورت پن کا شکار ہوگئی ہوں پتہ نہیں اپنے اندر کے ساتھ کیسا جھگڑا کیا کہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اگلے ہی لمحے میں آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہورہی تھی...... ہاں خرم میں...... جو آپا ماں کے بغیر دروازے کی دراڑ سے باہر نہ جھانک سکتی تھی...... جس نے اپنی ذات کے لیے منفرد اصول بنا رکھے تھے...... جو عشق و محبت کی باتوں کو اپنی غیرت سے بہت نیچے تصور کرتی تھی...... ایک دم بغیر سوچے سمجھے تجربات کے میدان میں پوری قوت سے کود گئی۔

عظیم اسٹیئرنگ پر بیٹھا تھا بڑی ہمت کا مظاہرہ کر کے میں اُس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کہاں چلیے گا؟'' اس نے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''خرم کہاں ہیں؟'' میں نے اس کا سوال نظر انداز کیا...... مجھے محسوس ہورہا تھا میں بازار میں پہنچ گئی۔

''گھر پر...... لیکن اس وقت وہ ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں کوئی پون گھنٹے بعد فارغ ہوں گے اس دوران ہم ڈرائیو لیتے ہیں۔''

''جی نہیں...... گاڑی روکیے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''کیوں...... خرم آپ کا دوست نہیں؟''

''یقیناً ہے بس میں اس وقت اس سے ملنا نہیں چاہتی۔''

''یہ دیکھیے اس کا خط...... آپ اطمینان رکھیے۔'' میں نے کاغذ تہ کر کے مٹھی میں رکھ لیا۔

تب وہ چھوٹی حیثیت، شخصیت کا شخص مارے خوف کے تھرتھر کانپنے لگا۔

''نہیں نہیں مس نشاط یہ نہیں ہوگا...... یہ خط مجھے واپس کر دیجیے...... دیکھیے پلیز...... خدا کے لیے...... یہ تو...... وہ تو......''

''بہت قیمتی ہے کیا؟'' میں نے اس کی بے چینی سے لطف لیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

جواب میں اس کے چہرے پر دنیا جہاں کی بے بسی اکٹھی ہوگئی۔ تب میں نے نہایت آسانی سے وہ کاغذ اُسے واپس کر دیا۔ وہ خوش ہوکر مجھے بہلانے لگا۔

''خرم ہر روز صبح صبح مجھے فون کرتا ہے...... بڑی بے قراری سے آپ کا ذکر کرتا ہے...... تنگ کرتا ہے دن میں دس دفعہ کہ......'' میں اسے نظر انداز کر کے خاموش رہی۔

''کہیں ٹھنڈا چل کر نہ پیا جائے؟'' میں خاموش رہی۔

''کون سا پرفیوم استعمال کرتی ہیں آپ؟'' وہ اپنی سطح پر اتر رہا تھا میں اُس کی بے بسی پر مسکرا دی۔ وہ لفٹ پکڑ گیا اور یہی میں چاہتی تھی کہ اس کا اندر باہر آ جائے...... اس کا سوال نظر انداز کر کے ایک مرتبہ پھر میں نے فخر محسوس کیا۔

''Emily Bronte کو پڑھا ہے آپ نے؟''

''Withering Heghts۔'' میں نے مختصراً کہا۔ وہ اچھل پڑا۔

''خدا کی قسم بہترین ادب ہے میں نے تو وہ سارے مقامات خود جا کر دیکھے ہیں جس کے پس منظر میں یہ ناول تیار ہوا۔'' میں داد دینے کے انداز میں بھنویں اٹھا کر ہنسی۔ وہ خوش ہوگیا۔ جیسے میں نے اس کی بات پر اعتبار کر لیا ہو۔ اچانک وہ اندھیرے میں گاڑی روک کر گانے لگا۔

''She Fell In Love When She Was Sixteen۔''

''خرم خود مجھے لینے کیوں نہیں آیا......'' میں نے اسے چونکا کر اس کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کی۔

جواب میں وہ چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دو ہاتھ دو پاؤں رکھنے والے ہر جاندار کی طرح اس کے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے۔ مجھے اس پر رحم سا آ گیا...... بے چارہ مرد اپنی اس جذباتی بے بسی کا انتقام تمام زندگی عورت سے لیتا رہتا ہے۔ دس سالہ بچی سے لے کر بڑھاپے تک عورت کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ بظاہر اسے ٹھکراتا بھی ہے اسی الجھن میں ہانپ ہانپ کر مر جاتا ہے...... اس وقت مجھے وہ اپنی پرانی بیوی کی لمبی غیر دلچسپ رفاقت سے گھبرایا ہوا Frustrated لگا جو اپنی ویران زندگی کا کوئی انتہائی خطرناک موڑ کاٹ رہا تھا...... میں نے دیکھا اس کی اندرونی جذباتی افراتفری تیزی سے اس کے چہرے کے نقوش بگاڑ رہی تھی۔

پھر پتہ نہیں میرے ذہن کی کونسی سوچ اس کے ذہن سے لڑ گئی کہ وہ اچانک بولا۔

''آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا ہے خصوصاً Bachelor کے لیے تو ایسی باتیں اور بھی مشکل ہو جاتی ہیں۔''

''اچھا تو گویا آپ Bachelor ہیں؟'' میں نے حیرت کا اظہار کر کے اس کی خوشی بڑھائی۔

''آپ کو شک ہے کیا؟'' اس نے پورے کنوار پن اور سنجیدگی سے کہا۔

''خرم کہاں ہوگا اس وقت؟'' میں نے جان بوجھ کر ایک مرتبہ پھر اس کا سوال نظر انداز کیا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا تم دونوں میں سے

لیکن شادی شدہ اور دوسرا غیر شادی شدہ بن کر مجھ سے کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''ابھی دس منٹ باقی ہیں شاید آپ گھبرا رہی ہیں..... چاند کی فتح کے دور میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں مس نشاط اور اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو بہتر ہوتا آپ برقعے میں میرے آگے آگے چل رہی ہوتیں' اور میں آپ کے پیچھے پیچھے سیٹی بجاتا ہوا چلتا۔''

''مختلف تو اب بھی آپ نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کا خیال ہے میرے ساتھ آپ کا رویہ مہذب ہے؟''

وہ قدرے شرمندگی سے ہنسا اور پھر بار بار تمہارے ساتھ اپنی اس دوستی کا حوالہ دینے لگا جس کی عمر میری عمر سے بھی بڑی تھی..... بہر حال وہ باتیں کرتا رہا اور میں اُس کی حرکات وسکنات اور خیالات سے تمہارے کردار کی تصویر بنانے لگی کہ سنا تھا دوست ایک دوسرے کے کردار اور Company کی تصویر ہوتے ہیں لیکن کوئی واضح تصویر اس لیے نہ بنا سکی کہ تم دونوں بہت کم وقت کے لیے میرے قریب آئے تھے اور میں بڑی دیر اور بڑی تسلی کے بعد کہ میں کوئی جاسوسی کردار نہیں ہوں اور نہ ہی تمہاری نام نہاد اونچی حیثیت پر اثر انداز ہوسکتی ہوں وہ مجھے تمہارے گھر لے گیا..... تم بھاگ کر باہر آئے۔ میں پچھلی سیٹ پر آ گئی اور تم نے میرے قریب بیٹھتے ہی مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کر ڈالا ایسا پیار جس میں میرے لیے پیار کی سچائی کم اور بہلانے کی کیفیت زیادہ نمایاں تھی۔

''کہاں چلیں جان؟'' تم نے پوچھا تھا۔

''تھانے.....'' میں نے کہا۔

''جی.....'' تمہارا چہرہ تمہاری اورنج رنگ کی بو شرٹ کے ہمرنگ ہوگیا جو تم اکثر اپنی عمر کو کم ظاہر کرنے اور چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے پہنا کرتے تھے۔

اور میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی ہاں ذرا تم دونوں کے نام پتے درج کروا آؤں کہ مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟ یا پھر پہلے ہی سے درج ہیں..... نمبر؟'' تم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''جی ہاں سرکار کے گھر میں تو درج ہیں۔''

''لیکن تھانے اور سرکار میں تو بڑا فرق ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ تم بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور پھر سڑک کے دو چار چکر لگانے کے بعد ہم تمہارے گھر آ گئے۔ عظیم باہر گیلری میں رہ گیا اور تم میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔

تمہارا کمرہ جہاں پہنچ کر میرے دل ودماغ میں چھپے ہوئے خوف خطرات کے سارے گولے بارود ایک ساتھ پورے دھماکے سے پھٹ پڑے..... میں جو پہلے ہی سے نیم جان ہو رہی تھی اور بڑی مشکل سے پچھلے دو گھنٹوں سے خود کو سنبھالے بیٹھی تھی کمرے میں آ کر اندر ہی اندر بلبلانے لگی مجھے تمہارا کمرہ مذبح لگا۔ اچانک تم ایک تجربہ کار فریب کار کی طرح آگے بڑھے اور مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا..... مارے حیرت کے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

یہ تم تھے خرم جس نے اپنی شرافت کی قسمیں کھائی تھیں خاص ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور مجھ سے محض ذہنی دوستی کا وعدہ کیا تھا۔ تمہارے چہرے سے لگ رہا تھا آج تم نے ایک ایک لمحے کو Avail کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس میں میری رضا بھی شامل ہوگی یا نہیں..... بظاہر تم مجھ پر پیاروں کی بارش کر رہے تھے لیکن وہ پیار جس

میں پیار، احترام دوستی کا جذبہ یا جذبات کی شدت سے مرعوب ہو جانے والی قطعاً کوئی کیفیت نہیں تھی بس تم جلد سے جلد Satisfied ہو جانا چاہتے تھے...... تب میں نے ایک لمحے کے لیے تمہارے حملہ آوروں کے سے پیار کے بارے میں سوچا اور اپنے جذبات کی ساری آنچ کو بخ کر کے تمہیں موت کی اذیت سے گزار لیا۔

تمہیں یاد تو ہوگا میں نے تمہیں وہ خوبصورت طویل ترین تنہائی Enjoy نہیں کرنے دی تھی...... تم جوں جوں ہوش کھو رہے تھے میں توں توں ہوش میں آ رہی تھی۔

تم مجھ پر کوئی دلچسپ کیفیت طاری کرنا چاہتے تھے اور میرا ہر بن مُو میری حفاظت کے لیے تن رہا تھا...... کھلی آنکھوں سے میں بار بار تمہارے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی جس پر میرے پیار کا کوئی رنگ نہ تھا۔ غصے کی اس شدید حالت میں بھی مجھے اچھی طرح یاد رہا کہ واقعی تم میرے ساتھ کھیلنے آئے تھے...... میرے ساتھ تمہارا کوئی ذہنی یا روحانی تعلق نہ تھا...... تم میرے دوست نہ تھے...... محبوب نہ تھے یہاں تک کہ تمہیں مجھ سے چھوٹا موٹا پیار بھی نہ تھا۔ ایک عام راہ گیر کی طرح تم میرے ساتھ مسلسل بدسلوکی کیے جا رہے تھے...... یہ اور بات ہے کہ تمہارا یہ سلوک میرے حق میں اچھا ثابت ہوا اور نہ تم جانتے ہو عورت ہمیشہ پیار کی خاطر اور پیار کی آڑ میں تباہ ہو جاتی ہے۔ تم مجھے پیار کی سچائی سے مرعوب نہ کر سکے اور میں تیزی سے سنبھل رہی تھی۔

ہاں میں اس دوران صرف چند لمحوں کے لیے مجھے تم پر بے حد پیار آیا بلکہ ترس آیا جب تم مارے غصے اور تھکن کے پلنگ پر لیٹ گئے...... بے بس بے بس سے...... تب میں نے تمہارا سر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا تھا اور دیر تک تمہیں ساتھ لگائے بیٹھی رہی تھی...... تمہیں یاد تو ہوگا اس وقت بھی آہستہ آہستہ میں یہی بات دہرا رہی تھی کہ خرم تم نے تو کہا تھا آج ہم پرسکون ماحول میں بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کریں گے......

خوبصورت اور روشنیوں والی باتیں...... پھر تم بولتے کیوں نہیں میرے ساتھ؟ آؤ باتیں کریں...... اور تم نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ چپ چاپ غصے سے ہونٹ بھینچے روٹھے سے پڑے رہے...... ہاں میں نے اتنا ضرور محسوس کیا تھا کہ آج جبکہ پھر تم زبردستی کر سکتے تھے تو تم نے خود پر قابو بحال رکھا اور بخدا محض اسی وجہ سے میرا جی چاہا تمہیں بہت سا پیار کر ڈالوں...... کتنے بھولے تھے تم؟ لیکن بھولے بھی کہاں تھے...... آج تو تم مجھے بیک وقت سادہ، ہوشیار، ذہین اور پتہ نہیں کیا کیا لگے تھے؟

اس دوران عظیم ایک دفعہ کمرے میں آیا جنسی بھوک مٹانے کی خاطر اس نے الماری سے پیسٹری نکالی۔ منہ بھر بھر کے کھائی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا تم بھی جھنجلا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں تمہارے کمرے کا جائزہ لینے لگی...... سستے ذوق کی سجاوٹ سے سجا ہوا یہ کمرہ مجھے ننھا منا دیہات لگا۔ بس گھر کا مجموعی تاثر اچھا تھا۔ قیمتی نقشے کو بدذوقی نے ختم کر رکھا تھا اور مجھے عین اسی لمحے اپنا گھر یاد آ گیا جس سے اب میں کوسوں دور تھی اور جس میں تمہیں لے جانے کو میرا جی چاہ گیا۔ اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا وہ پیچیدہ ہداریوں والا میرا پُراسرار سا خوبصورت گھر تم دیکھ لیتے تو بخدا ٹھوکریں کھا کر گر پڑتے۔

ابھی میں پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہی تھی کہ تم نے مجھے چونکا دیا اور مجھے باہر گاڑی تک لے آئے اور پھر یہاں گاڑی ہی میں تمہارے کردار کا وہ حصہ

شروع ہوتا ہے خرم جس نے اب تک میر حواس کو ختم کر رکھا ہے...... مجھے بیدم کر دیا ہے...... تم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی عظیم کے ساتھ میر یارے میں عجیب وغریب باتیں کرنا شروع کر دیں۔ شاید مجھ سے اپنی اس جذباتی شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ جس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں دوچار کیا تھا س۔ یا پھر...... خیر کچھ بھی تھا خرم میں تم سے اس حواس بحال رکھنے کی توقع کر رہی تھی۔ میں خوفزدہ اور پریشان ضرور بیٹھی تھی لیکن تم دونوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک لفظ کی نگرانی کر رہی تھی۔

اچانک تم کہنے لگے۔

''نشاط یوں کرو کل تم عظیم کے ساتھ بھی ڈرائیو پر چلی جانا بلکہ میں تو کہتا ہوں عظیم تم اسے کابل لے جاؤ شاپنگ کرالاؤ...... بخدا نشاط میرا دوست Jem ہے Jem۔'' اور میرا ہاتھ جو پوری قوت سے تمہاری گردن پر پڑنے لگا تھا اور پڑا بھی تھا' یہ سوچ کر ڈھیلا پڑ گیا کہ جذباتی شکست' کا دھکا کھانے کے بعد تمہاری زبان لڑکھڑا رہی ہوگی......

ادھورے پیار کی آگ میں جل جل کر تم میری EGO کو ٹھوکریں لگا رہے ہوگے ورنہ ایک جی تو چاہا تم سے پوچھوں۔ یہ تم میرے باپ کب سے بن گئے ہو کہ اپنی بیٹی کی طرح مجھ پر حکم لگا رہے ہو؟ میں اتنی تابعدار بیٹی بھی نہیں ہوں کہ تمہاری خاطر اپنی غیرت کو مار ڈالوں لیکن خاموش اس لیے ہوگئی کہ تم سے یہ پوچھنا تم کو اہمیت دینے کے مترادف تھا اور اس وقت میں تمہیں اہمیت تو خیر کیا دینا چاہتی تھی تمہیں کوئی شدید ترین ذہنی صدمہ پہنچانا چاہتی تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اچانک تم نے پلٹ کر پوچھا۔

''اب کہاں چلنا ہے؟'' اور میرے ذہن کی رگیں جو تڑ تڑ بج رہی تھیں پٹاخ سے بولیں۔

''تمہارے سسرال...... تاکہ تمہاری مسز کو تمہارے پروگرام سے آگاہ کر سکوں۔'' اور تم نے کہا تھا۔

''بخدا چلو وہ تو تمہیں دعائیں دیں گی۔'' اور میں نے پوچھا تھا۔

''کیا وہ بھی تمہاری طرح کھلے دل کی خاتون ہیں کہ آپ دونوں میں سے جو بھی کسی دوسرے سے دوستی لگا لے تو خوش ہو کر ایک دوسرے کو دعائیں دیتے ہیں...... تنگ پڑے ہوئے لگتے ہو ایک دوسرے سے......'' تم خاموش ہوگئے خدا جانے تم نے بات سمجھی تھی یا نہیں۔

اور میں سوچ رہی تھی خرم یہ تم مرد لوگ بھی عجیب ہوتے ہو اپنی اصل کبھی نہیں بدل سکتے...... تمہاری شخصیت کا تو کوئی پیندا ہی نہیں ہوتا...... ہواؤں پر پاؤں رکھ کر چلتے ہو اور جذبات کی آگ بجھانے کو زبانیں لٹکائے پھرتے ہو...... اور پھر دعوے کیا کیا کرتے ہو...... تم لوگوں سے دوستی کی جائے تو ہم Corrupt کہلائیں، تمہیں ریجیکٹ کریں تب بھی یہی کہو...... اور پھر نا قابل برداشت تو تم اس وقت ہوئے جب میرے اترتے وقت گاڑی سے نہ اتر کر تم نے مزید چھوٹے پن کا مظاہرہ کیا یہ ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں بات بات پر مغرب سے گھوم آنے کا فخر جتا رہے تھے حالانکہ تم دونوں کے پاس تو ٹوٹی پھوٹی پاکستانی تہذیب بھی نہیں تھی جس کے مطابق جاہل مرد بھی خواتین کے اٹھتے بیٹھتے وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں...... میں جل بھن کر گھر اتر گئی جاتے وقت میں نے صرف اتنا کہا تھا۔

خرم وہ اخبارات کل بھجوا دینا...... پر کیسے بھجواؤ گے؟'' اور تم نے کہا تھا۔

''فکر نہ کرو کوئی فرشتہ دے جائے گا۔'' اور یہ

اس سے اگلے روز صبح کا واقعہ ہے فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا۔

''جی میں عظیم بول رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' میرا کل شام والا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

''جی وہ اخبار پہنچانے ہیں جی۔''

''مجھے ضرورت نہیں۔''

''جی وہ خرم نے دیے ہیں کہ ضرور......'' وہ میری کمزوری سے کھیلا۔

''آج دو بجے گیٹ پر ملازم کو پکڑا جائیے۔'' میں انکار نہ کرسکی۔

اور وہ دو بجے دوپہر بار بار مجھے باہر بلوانے کے لیے چٹ اندر بھجوا رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اخبارات مانگے۔ وہ بے تکلفی کی کوشش کرتے کرتے بھر پڑا۔

''یعنی حد ہوگئی ہے اس گرمی میں کھڑا سڑ رہا ہوں نہ کوک نہ Cone بس اپنے مقصد سے کام......''

'' جی ہاں میں گیٹ پر اتنی لمبی چوڑی کارروائیاں نہیں کرسکتی' دو کاغذ پکڑنے ہیں کوئی جلسہ جلوس......''

''تو پھر میرے ساتھ باہر چلیے۔''

'' شٹ اپ......'' میرا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''چھوڑ دیجیے میرا گیٹ......'' وہ ایک دم گاڑی سے اتر کر میرے قریب آ کھڑا ہوا اور ہنس کر کہنے لگا۔

''کیا میں کوئی نوعمر لڑکا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سلوک؟''

''لڑکا......'' اچانک میرا قہقہہ نکل گیا۔

''تو اور کیا نوجوان......''

''جی نہیں...... دونوں نہیں...... بلکہ چھیالیس برس کا ایک پکا مرد جس کی قلموں کے کنارے بھورے ہورہے ہیں...... جس کی پہلی بیوی مرچکی ہے یا جو بے چارہ کسی ایسی ہی دوسری ٹریجڈی کا شکار رہے۔'' اسے آگ لگ گئی۔

'' اور بڑھاپئے میری عمر...... اور بڑھاپئے...... جتنی جی چاہے۔'' اس نے جل کر اپنا چشمہ اور گھڑی اتار کر سیٹ پر دے پھینکے...... میں ہنس کر اس کی اُلجھی ہوئی نفسیات سے محظوظ ہونے لگی۔

''آپ Frustrated ہیں مس نشاط۔'' وہ چیخا۔

''شکریہ......'' میں نے کہا۔

''تمہارے ساتھ ڈرائیور' ڈرنکس' ڈانس اور ڈنر کے لیے جاؤں تمہارے ساتھ لچکتی مہکتی پھروں تو مجھ جیسا نارمل اور ڈیسینٹ کوئی نہیں تمہیں لفٹ نہ کرواؤں تمہاری باتوں کو تمہارے منہ پر دے ماروں تو Frustrated۔''

وہ جواب میں کچھ بولتا رہا۔ لفظ Frustration کا بار بار استعمال کرکے اپنی بھرپور Frustration کا اظہار کرتا رہا اور میں سوچتی رہی کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ اس عمر تک کنوارہ ہی ہے تو آخر؟ اچانک اس نے پینترا بدلا اور بازی کے جیسے سارے پتے پھینک دیے۔

''خدا کے لیے نشاط مجھ پر رحم کرو...... یہ دیکھو میں نے سگریٹ پینا شروع کردی ہے...... کل کو میں وہ بھی پینا شروع کردوں گا...... اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم اس کی ذمہ دار......'' اس نے ریڈ اینڈ وائٹ کا جھنڈا میرے سامنے لہرایا۔

اور اس اچانک کے عشق پر میرا پیٹ مارے

ہنسی کے اندر ہی اندر ابلنے لگا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

’’مگر کیوں...... آپ یہ دونوں حماقتیں کیوں شروع کریں گے؟‘‘ وہ خوش ہوگیا شاید مجھے اس سے ہمدردی ہونا شروع ہوگئی ہے اور بس اگلا قدم عشق......

’’آہ نشاط تم نہیں سمجھتیں تم کیا چیز ہو تم نے مجھے کیا سے کیا کردیا ہے...... Swear اس نے ہوا میں ہاتھ ترچھا کرکے کوئی قسم اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

’’آخر آپ چاہتے کیا ہیں عظیم صاحب؟‘‘ اور وہ جیسے پھٹ پڑا۔

’’صرف تمہیں نشاط صاحبہ...... صرف تمہیں...... تم کیا جانو میں نے کل رات تمہاری رہائش گاہ کے کتنے چکر لگائے...... تین ہزار چکر جب تم گہری نیند میں پڑی سوئی تھیں تم میری بے قراری کا اندازہ نہیں کرسکتیں میں تو خدا کی قسم تمہارے گھر کے سامنے اپنی قبر بنا دینا چاہتا ہوں...... میں تو......‘‘ اس کی آواز میں عورتوں کے بین کرنے کی سی کیفیت نمایاں تھی۔

’’آپ کچھ بھی نہ کریں عظیم صاحب...... میں آپ کو سمجھ گئی ہوں...... آپ کے احساسات مجھ تک پہنچ گئے ہیں کہیے تو رسید لکھ دوں؟ تکلف اور تکلیف دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ وہ چشمہ اتار کر ذرا سا مسکرایا اور آنکھوں کو گہرا کرنے لگا۔

’’آں ہاں......‘‘ میں نے کہا۔

’’یہ تکلیف بھی رہنے دیجیے چشمہ لگا لیجیے مجھ پر ایسی باتیں اثر نہیں کرتیں میں ان باتوں سے بہت آگے نکل چکی ہوں...... زندگی میری آنکھوں کے سامنے بہت صاف ہے عظیم صاحب......‘‘ اس نے چشمہ لگا لیا...... میں نہیں جانتی اس نے میرا حکم مانا تھا یا اپنے آنسو چھپائے تھے...... پھر اگلے لمحے مجھے اس کی بے بسی پر بے حد ترس آگیا وہ پسینے سے بھیگ رہا تھا...... اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ تیز تیز باتیں کررہا تھا جیسے اپنا دل نکال کر مجھے دکھا دینا چاہتا ہو۔

تب میں نے نرمی سے کہا۔

’’اخبارات نہ دیجیے گا۔‘‘

’’خدا کے لیے نشاط میری بات تو سنو...... سنو تو......‘‘ وہ پھر رومانٹک ہوگیا۔

’’مجھے تمام رات نیند نہیں آئی ...... میں فلور ڈانس دیکھ دیکھ کر تنگ پڑ گیا ہوں...... میں......‘‘

’’اچھا اچھا......‘‘ میں ہنسی۔

’’یہ تو اور بھی اچھی بات ہے لگتا ہے آپ دونوں کو میرے ساتھ کل کے سلوک کا کچھ احساس ہوگیا ہے۔ میں کہتی ہوں ایسے ہی اشرافوں کی نیند اڑ جایا کرتی ہیں۔‘‘

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس گم صم میرے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بڑی نرمی سے سمجھایا۔

’’دیکھو عظیم میاں دراصل میں وہ وہ کچھ نہیں ہوں جو تم دونوں سمجھ رہے ہو۔‘‘ اتفاق سے تھوڑی بہت نفسیات میں بھی جانتی ہوں...... میں جانتی ہوں تم میرے ساتھ آناً فاناً عشق شروع کرنے کی کوشش کررہے ہو جو غلط اور بے کار فائدہ کوشش ہے۔‘‘

وہ اسٹیئرنگ پر سر ڈال کر بیٹھ گیا۔

’’اس اسکیٹنگ کی بھی ضرورت نہیں۔‘‘

’’جی......‘‘ غصے سے اس کے نتھنے پھول گئے۔

’’جی ہاں قطعاً نہیں...... اور اب پلیز چلے جایئے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت اچھی

طرح کہہ سن لیا ہے۔''

آپ کو کوئی تلخ تجربہ ہوا لگتا ہے۔'' وہ تلخ ہو گیا۔

'' یہی سمجھ لیجیے۔'' میں نے بات ختم کرنا چاہی۔ وہ پھر بولا۔

'' لیکن لگتا ہے آپ کا وہ تجربہ ابھی ادھورا ہے کچھ باتیں میرے ساتھ بھی کر لیجیے تا کہ تجربہ مکمل ہو جائے۔''

'' شکریہ۔'' میں نے کہا۔

'' اگر میں پچھلے دو گھنٹوں کی باتوں سے آپ کو نہیں سمجھ سکی تو میرا خیال ہے آنے والے مزید دو گھنٹوں بلکہ دو برسوں میں بھی نہیں سمجھ سکوں گی۔''

'' لیکن..... نشاط.....'' وہ پھر بہکنے لگا۔

'' میں تمہارے ساتھ سیریس ہوں آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ...... مجھے قسم ہے تمہاری شرافت کی میں.....''

'' آپ اور میرے ساتھ سیریس ہیں۔'' میری حیات کی انتہا نہ رہی اور سیریس تو آپ اپنے ساتھ بھی نہیں ہیں عظیم صاحب۔'' میں نے کہا۔

'' مصنوعی سیاروں کی AGE میں کیسی بہکاوے کی باتیں کر رہے ہیں..... جو شخص مجھے دوست کے ساتھ دو گھنٹے تنہا ایک کمرے میں رکھ کر پہرہ دے سکتا ہے میرے باہر نکلتے ہی اسے اچانک کیسے میرے ساتھ پیار ہو سکتا ہے اور اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو میں آپ کی اس غیر معمولی اور ماورائی محبت کے سامنے سر جھکاتی ہوں اسے قبول نہیں کر سکتی۔ ایسی محبت پر لعنت ہے جس میں حسد اور غیرت کا جذبہ شامل نہ ہو۔''

غیرت کے لفظ پر وہ اچھل پڑا اور غیرت میں آنے کی کوشش بھی کی۔ تب میں نے کہا۔

'' اداکاری نہ کرو عظیم.....''

'' تم کیا جانو.....'' وہ جھگڑنے لگا.....

'' میری ایک سو ایک گرل فرینڈز ہیں..... میں اتنی مدت مغرب میں گھوما ہوں۔ سینکڑوں لڑکیوں کو چکھا ہے..... درجنوں کو.....''

'' تو اب بھی انہی کے پاس جایئے ناجن خیر خواہوں نے آپ کو اس عمر تک کنوارہ چھوڑ رکھا ہے۔'' وہ لپک کر میرے قریب آ کھڑا ہوا۔

'' دست درازی کی حرکتیں نہ کرو عظیم.....'' میں نے اسے پھر سمجھایا۔

'' بلکہ خدا کے لیے چلے جاؤ..... چھوڑ دو میرا گیٹ۔'' اور یہ میری آخری بات تھی میں تیز تیز قدموں سے اندر بھاگ آئی اور کمرے میں گھنٹوں روئی..... میں سوچ بھی نہ سکتی تھی خرم تم مجھے اتنا چیپ بھی سمجھ سکتے ہو کہ گاہک بھیجنا شروع کر دو گے۔ اس دن عظیم ہر دوسرے گھنٹے بعد میرے دروازے پر آتا رہا تمہاری گاڑی میں غنڈے بھر کر اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہا فون کیے اور خطوط بھجواتا رہا۔

اور میں سارا دن تمہارے بارے میں سوچتی رہی..... کڑھتی رہی اور روتی رہی..... تب میں نے شام کو تمہارے نام چند سطور لکھیں۔

'' Check Azim From You Have Encouraged Him For And If There Is Azim, Why Not Hundreds Of Men Daily ?''

لیکن پتہ نہیں میں کیا سوچ کر رہ گئی کہ تمہیں خط نہ بھیجا..... یوں بھی مجھے یقین تھا کہ خط کے بعد مجھے فون پر کہتے۔

'' جان..... یہ کون سی بڑی بات ہے..... عظیم میرا بے تکلف دوست ہے شریف ہے ذہین ہے اگر اس نے دو چار باتیں کر بھی لی ہیں تو خدا کے

لیے محسوس نہ کیا کرو۔'' اور میں اب بھی بیٹھی سوچ رہی ہوں یہ مردوں کی نفسیات بھی کتنی پیچیدہ ہوتی ہے خرم...... میں نے محض شکریہ ادا کرنے کے لیے تمہیں اپنی رہائش گاہ پر چائے کی بار بار دعوت دی تو تم نے اسے خاص طور پر اپنی کسی مردانہ حس کی حوصلہ افزائی سمجھا...... تمہیں تمہارے کہنے پر فون کرتی رہی تو اسے عشق کا اشارہ سمجھا...... احترام سے پیش آتی رہی تو اسے میری محبت کی ابتدا بلکہ انتہا سمجھا...... جو جو تمہاری مرضی، ہاں ایسا سوچا سوچتے رہے اور اگر میں تمہاری بے قراریوں، حوصلہ افزائیوں اور پیار کی بوچھاڑوں سے کوئی داستان بنانے لگوں تو تم اسے بھی تسلیم نہ کرو گے، مجھے افسوس ہے خرم تم نے میری دوستی کا کچھ اور مطلب لینا چاہا۔

میرا خیال تو یہ تھا کہ جب تم دوست بن ہی گئے ہو تو تمہیں ہر روز اپنی رہائش گاہ پر بلوایا کروں گی، اپنے ذاتی کمرے میں بٹھا کر تم سے دیر تک باتیں کیا کروں گی...... مغربی اور مشرقی موسیقی کا جو خوبصورت انتخاب میں نے ٹیپ پر جمع کر رکھا ہے تمہیں سنوایا کروں گی...... نازک اور خوبصورت پیالوں میں گاڑھی اور خوشبودار کافی چلے گی اور اس طرح ہم ایک دوسرے کو دلچسپ ترین اور خوبصورت ترین ذہنی دوستی دے سکیں گے...... زندگی کے فلسفے پر بحث ہوگی...... اور گہری اور اچھی اچھی باتیں ہوں گے...... اور جب تھک جایا کرو گی تو گھنٹوں تمہیں دیکھا کروں گی...... تم اچھے جو لگتے ہو مجھے...... میری کمزوری جو ہو۔

لیکن یہ کیا ہوا خرم عظیم اچانک کیسے تصویر میں کود آیا اور پھر سب سے بڑی حیرت تو یہ ہے کہ تم اس کا رنگ میری زندگی میں شوخ ترین کر دینا چاہتے ہو......''

بہر حال اس شام عظیم دوبارہ آیا۔ میں نے عدم موجودگی کا کہلوا بھیجا، وہ میرے نام خط اور فون نمبر چھوڑ گیا...... صبح ٹیلیفون کیا میں نے ریسیو نہ کیا...... دوبارہ فون کیا میں نے کہا ملاقات ناممکن ہے۔ دو بجے وہ پھر میرے گیٹ پر تھا میں نے شہر میں نہ ہونے کا بہانہ بنا بھیجا رات کو وہ پھر آیا...... میں نہ ملی اگلی صبح میں نے تمہیں فون کر کے پوچھا کہ وہ فرشتہ کراچی اڑ گیا ہے یا نہیں، تم ہنس پڑے اور میں نے غصے سے کہا تھا۔

''یہ کیا شیطان میرے پیچھے لگا دیا ہے؟ اس کے فون اور خطوں نے میرا دم پخت کر رکھا ہے۔''

شام کو وہ پھر آیا میں باہر نہ نکلی۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ اتفاق سے میں گیٹ پر کسی کے ساتھ بات کر رہی تھی وہ میرے سامنے آ گیا...... نسبتاً کچھ نارمل سا میں نے Courtesy نبھائی۔

''کیسے آنا ہوا عظیم صاحب......''

''یونہی جی چاہ گیا تھا......''

''شکریہ۔'' میں نے کہا اور واپس جانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے میں نے رک کر کہا۔

''خرم کو میرا ایک پیغام پہنچا دیجیے گا۔''

''یقیناً یقیناً......'' وہ میرے ٹھہر جانے پر مارے خوشی کے دہرا ہو گیا۔

''اس سے کہیے میں آج بلکہ ابھی اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اور یہ سچ تھا تم مجھے شدت سے یاد آ رہے تھے۔

''کیوں......'' وہ جل گیا۔

''بس جی چاہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔

''گولی مارو خرم کو...... تم میری بات سنو نشاط......''

''آپ کو کیوں نہ گولی ماردوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''آخراس شخص میں ہے کیا...... شادی شدہ ہے' چار بچوں کا باپ ہے' بیوی سے عشق کرتا ہے' ایک اور ناکام عشق بھی کیا ہے جو میرے شہر میں ہوا اور جس کی ذمہ داری اب تک میرے سر ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''ان تمام حقائق کے باوجود وہ مجھے اچھا لگتا ہے اور اچھا لگنے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''مجھ پر تو پابندی ہے کہ کسی کو پسند نہ کروں۔''

''تم پر تو ہونی بھی چاہیے۔'' میں نے کہا اور وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ سیٹی بجانا شروع کردی اور نیم دائرے میں چکر کھانے لگا۔

''دیکھیے پلیز میرے سامنے ڈرامہ نہیں چلے گا' ہوش میں رہیے' آپ ایک خاتون سے مخاطب ہیں۔''

''لیجیے میں احترام میں جھک جاتا ہوں۔'' وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''یوں بھی نہیں......'' میں نے تلخی سے کہا۔ غصے اور بے بسی سے اس کی ناک کانپنے لگی۔

''بات کیا ہے عظیم آخر تم بار بار کیوں آتے ہو......تم عورت کا پہیلی پن ہرگز نہ بوجھ سکو گے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''دیکھو نشاط...... خدا کے لیے مجھے سنو...... میں نے اپنے ذہن میں ایک Couch بنا رکھا ہے اس پر تمہیں بٹھانا چاہتا ہوں اور یہ بات میں اس وقت سے چاہتا ہوں جب بھی تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''اتنی تکلیف اور محنت مزدوری کے لیے شکریہ ویسے مجھے معلوم ہے عظیم صاحب اس تخت مبارک پر اب تک کتنی خواتین کی اٹھک بیٹھک ہو چکی ہے۔''

وہ ذرا سا مسکرایا اور جیب سے Perfume کی بوتل نکال کر کھیلنے لگا۔

Cheap میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ سستی ذہنیت کا سستا انسان...... اس بوتل کا سہارا دے کر مجھے اس تخت پر چڑھا دینا چاہتا ہے جس پر......''

پھر خدا جانے کیا بات ہوئی کہ مجھے اس پر ترس آ گیا وہ اُلجھ کر کہنے لگا۔

''دراصل میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں نشاط جب تم پہلی بار خرم کو ملی تھیں اور تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے۔''

My Goodness...... میرا دماغ پگھلنے لگا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی خرم تم اس بات کا اخبار میں اشتہار بھی دے سکتے ہو میری آنکھیں اس دن یقیناً خشک نہیں تھیں' لیکن اس انکشاف سے تمہاری بڑائی کا کیا پہلو نکلتا تھا...... میں نے تو تمہارے مہذب پن سے بڑی بڑی توقعات لگا رکھی تھیں۔

عظیم میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا' میں نے بڑے سنبھلے ہوئے انداز سے کہا۔

''یہ بات صحیح ہے عظیم لیکن یہ نہ تو میرا جرم ہے نہ کمزوری کہ جس سے تم کھیلنا چاہو۔''

پتہ نہیں جواب میں وہ کیا کیا بولتا رہا۔ میں اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی جس پر مجھے تنگ کرنے کے بعد فخر کے آثار تھے اور جگہ جگہ شیونگ سوپ کے دھبے بھی تھے مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔

بے چارہ شاید آنے کی خوشی میں جلدی جلدی میں کریم بھی نہ لگا سکا تھا' کاش دو قطرے موبل

آئل ہی کے لگا لیتا جس کے اشتہار والے پیڈ پر ابھی کل اس نے مجھے فون نمبر لکھ کر بھیجا تھا...... پھر دوسری بڑی بات یہ کہ ہمیشہ اس کی پتلون ٹخنوں کے اوپر تک ہوتی تھی اور میں نے ہمیشہ اسے دیکھ کر یہ سوچا کہ جہاں سوٹ کے لیے دو گز کپڑا لیتا ہے وہاں چار گرہ زیادہ کیوں نہ لیتا۔

میں ہنس رہی تھی اور وہ چڑ گیا۔

''خدا کے لیے میرا مذاق نہ اڑاؤ نشاط...... میں تمہاری Respect کرتا ہوں۔''

''Respect کتنی Respect کرتے ہو میری؟'' اچانک مجھے اس پر بے حد غصہ آ گیا اور میں تن کر کھڑی ہو گئی۔

''اتنا احترام کہ اس دن گاڑی کا دروازہ کھولنے بھی نہ اٹھے...... دن میں بارہ چکر میرے گھر کے لگا جاتے ہو...... مجھے ہوٹلوں میں لے جانے کو کہتے ہو...... سیٹیاں بجا رہے ہو...... گیس لگان یکو کہتے ہو...... ٹوئسٹ کر رہے ہو...... سیاہ گاڑی کا جھنڈا میرے پیچھے پیچھے اٹھائے پھرتے ہو...... اور...... اور......''

وہ معافی کے لیے آگے بڑھا اور میں نے کہا۔

''چلے جاؤ عظیم ...... اسی وقت...... اسی لمحے...... میں تمہاری اور خرم دونوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔'' وہ دوبارہ بھاگ کر میرے قریب آ کھڑا ہوا...... میں نے جیسے تھک کر بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جایئے عظیم صاحب چلے جایئے...... مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں اور خرم سے بھی نہیں...... تم دونوں اپنی فطرت سے مجبور ہو...... دراصل تم مرد لوگ کبھی بھی اس قابل نہیں ہوتے ہو کہ تمہارے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔ تم اپنی مرضی کے مطلب نکال کر خود کو تسلیاں دیتے رہتے ہو...... ازل سے Frustrated جو ہوتے ہو۔''

اور ہاں خرم کو بھی کوئی پیغام نہ دینا...... وہ دیر تک گم صم کھڑا میری باتیں سنتا رہا...... انتہائی سنجیدگی سے...... پھر ایک دوسرے کو رسمی Respect دینے کے بعد ہم الگ ہو گئے۔

شام تک مجھے ہوش نہ آیا۔ پچھلے کئی روز کے واقعات نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ آٹھ گھنٹے شدید بخار میں تڑپتی رہی بڑی مشکل سے رات کو اٹھ کر میں نے پھر تمہارے نام ایک غصے بھرا خط لکھا اور چاہتی تھی کہ تمہیں بھیج کر ہر قسم کا تعلق تم سے ختم کر دوں۔ نہ جانے پھر کیوں رک گئی تھی۔ شاید تمہارے لیے دل میں شدید نفرت محسوس کر رہی تھی۔ خط میں تمہیں مخاطب تک نہ کرنا چاہتی تھی۔

اگلے روز پھر عظیم کا خط ملا کراچی سے...... میں بچتی رہی اور پھر ہر روز اس کا فون آتا رہا...... تیسرے دن مجھے اس کا ایک طول طویل خط بھی ملا جس میں اس نے میری خودداری، تلخی، تندی اور میرے کردار کی مضبوطی کی سلیوٹ کر بھیجا تھا...... میری تعریفوں کے پل باندھے تھے...... انتہائی دلچسپ اور خوشبوؤں، مہکاروں میں لپٹا بسا خط میں جل ضرور گئی لیکن ایک بات ضرور تھی خرم اس کے خط کے ہر ہر لفظ سے ذہانت ٹپک رہی تھی وہ خط میں ایک ماہر نفسیات کی طرح میرے جذبات و احساسات سے کھیلتا لگتا تھا۔ تمام واقعات کو اس نے بڑی اچھی طرح سمجھ رکھا تھا...... تب وہ جو تمہارے تعارف کے مطابق بیرسٹر تھا اور مجھے پہلی ملاقات میں نفسیاتی کیس لگا تھا۔ اپنے خط میں انتہائی نارمل اور مہذب نظر آیا...... یہ خط ایک کیس کی فائل برابر لمبا چوڑا تھا جس کا میں نے جواب نہیں دیا اس کے بعد اس کا دوسرا خط اسی طرح تیسرا اور چوتھا پھر خطوط کا تانتا بندھ گیا البتہ آخری خط

میں وہ خود اہمیتی کے احساس کی وجہ سے بھٹکتا نظر آیا تمہارے بارے میں بھی بڑی خوش فہمی کا شکار دکھائی دیا تب میں نے اسے لکھ بھیجا۔

"Oh ! Have Sent You Both In The Sky But We Are Three How Is Fool Please Reply"

جواب میں اس نے بڑا دلچسپ خط لکھا جس کا میں نے جواب نہ دیا ٹیلیفون کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور پھر ایک دن وہ میری خاموشی سے تنگ آ کر پھٹ پڑا۔

اپنی عدالت میں مجھے مقدمہ صاف کیوں نہیں دیتیں نشاط...... میں ان تمام رازوں سے پردہ اٹھا دینا چاہتا ہوں جنہوں نے ہم تینوں کو پاگل کر رکھا ہے...... خدا کے لیے...... آپ کو خرم کا واسطہ......"

اور میں بے بس ہوگئی...... یہ ہماری آخری ملاقات تھی وہ آیا اور بڑی تہذیب سے میری عدالت میں مقدمہ لگا دیا۔ اس کے بیانات کا خلاصہ تمہیں بتانے کے بعد میں بھی اپنی بات مختصر کر رہی ہوں خرم فیصلہ تم کرنا کہ......

اس نے مجھے بتایا کہ تم نے کبھی بھی میری ذات میں ذاتی طور پر دلچسپی نہیں لی بلکہ یہ سب کچھ تم عظیم کی خاطر کرتے رہے ہو...... تمہاری ساری قربانیاں عظیم کے لیے تھیں۔

میں نے اس کی ساری باتیں غور سے سنیں اور پھر اسے اپنے سامنے بٹھا کر بڑی نرمی اور آہستگی سے سمجھایا۔

"دیکھیں عظیم صاحب آپ دونوں نے یہ فیصلہ بڑی دیر بعد کیا ہے کہ مجھے پرکھنے اور اپنی مرضی کے مطابق پا لینے کے بعد اچانک تم یہ کہہ دو گے کہ یہ سب کچھ تمہاری خاطر ہوا جبکہ مجھے تمام واقعات کی اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی...... تم کہتے ہو وہ میرے ساتھ پیار نہیں کرتا اور میں کہتی ہوں کہ جذباتی طور پر وہ میرے اتنے قریب آیا ہے کہ تم سوچ بھی نہ سکو اور اگر سوچ بھی لو تو بخدا یقین نہ کر سکو...... تم کہتے ہو وہ مجھے نظر انداز کرتا ہے اور میرا فلسفہ کہتا ہے کہ انسان نظر انداز ہی اس چیز کو کرتا ہے جس کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔ وہ Self Escapasim کا شکار ہو کر مجھ سے چھپتا پھرتا ہے اس لیے کہ مجھے چاہتا ہے...... ابھی کچھ روز ہوئے میں نے ایک فنکشن میں دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اتنا زیادہ Puzzle ہوا کہ لطف آ گیا...... وہ بار بار پانی پی رہا تھا غیر اہم لوگوں کو گلے لگا رہا تھا...... اور خاص طور پر Enjoy تو میں نے اس وقت کیا جب وہ ہاتھ میں پنسل لیے کاغذ پر بے معنی لکیریں کھینچنے لگا بخدا اگر بے ترتیبی سے کھینچی ہوئی وہ تمام لکیریں میں کسی ماہر نفسیات کو دکھا ڈالو تو میرے حق میں کتنے ہی دلچسپ نتائج نکلیں گے۔

"دوسری مرتبہ میں نے ایک اور محفل میں اسے دیکھا۔ اپنی مسز کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ دائیں کرسی پر ولی عہد بہادر کو بٹھا رکھا تھا اور جب مجھے دیکھا تو مارے بے بسی کے اپنی پیلی پتلی شیر خوار کو اٹھا کر جلدی سے اپنی گود میں بھر لیا۔ تب میں جی بھر کر اس کی نفسیات سے محفوظ ہوئی تھی۔ بعد میں وہ جتنی دیر وہاں رہا اس کی گردن بار بار اس جانب تیزی سے مڑتی رہی جہاں سے میں گزری تھی۔

اور پھر یہ باتیں تو بہت معمولی ہیں عظیم...... میں قسمیہ کہتی ہوں اس کے دل و دماغ پر میری چاہت کی گرفت بہت مضبوط ہے وہ مجھے محض دل بہلاوا سمجھتا تو تمام عمر میرے ساتھ کھیلتا رہتا...... وہ میرے لیے دل کی گہرائیوں سے Disturbed ہے میری ذات سے اس کا خوف بتاتا ہے کہ وہ مجبور ہے اور اگر مزید ذرہ بھر بھی میرے قریب آیا تو بچ نہ

[illegible] کہتے [illegible] وہ [illegible] نہیں کرتا اور میں کہتی
[illegible] تم اور وہ مل کر میرے بارے میں اتنی باتیں
[illegible] جتنے تمہارے سروں پر بال ہیں یہ اور
[illegible] آپ دونوں کے سروں پر بال بہت کم
''

وہ ذرا سا ہنسا پھر کہنے لگا۔

''نشاط یقین کرو اگر اس نے تم میں ذرہ بھر بھی دلچسپی کا اظہار کیا ہوتا تو میں تمہیں اپنی بہن بنا لیتا اور دونوں کے ملاپ کے لیے تمہارے دروازے پر ٹینٹ لگا کر بیٹھتا۔''

اور میں نے کہا۔

''آپ ٹینٹ ہی تو لگانے آئے تھے عظیم جس میں مجھے زبردستی لے جانے کی کوشش بھی کی یہ اور بات ہے کہ جب مجھے اچھی طرح سمجھ لیا تو آناً فاناً عشق کا اظہار کر ڈالا۔'' وہ گھبرا گیا پھر کہنے لگا۔

''لیکن آپ مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتیں میں جو کہتا ہوں خدا کی قسم سچ کہتا ہوں۔''

''اعتبار......'' میں طنزیہ ہنسی۔

''میرے اعتبار کا جو حشر خرم جیسے شریف اور سادہ آدمی نے کیا تو کیا اب آپ پر اعتبار کروں گی۔ وہ جو میری زندگی کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اعتماد تھا اس نے اس شام ملنے کے بعد دوسرے ہی لمحے مجھے گیند کی طرح تمہاری طرف پھینک دیا تھا۔

جس کی دوستی پر مجھے فخر تھا اور پھر تم......تم تو پتہ نہیں کیا ہو کچھ ہو بھی یا نہیں......یا شاید خرم نے مجھے Base Coin سمجھ کر رات کے اندھیرے میں تمہاری مٹھی میں دے دینا چاہا تھا پھر تم دونوں نے دیکھ لیا کہ میں روشنیوں کے نور میں بھی اتنی ہی کھری تھی جتنی کہ اندھیرے میں وہاں حقائق کی روشنی میں آ کر تم دونوں کی نیتیں ضرور کھوٹی نکلیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......'' آپ نے مجھے [illegible] اور خرم کو بھی......خود آپ نے خرم کو قریب کرنے کی کوشش کی ورنہ وہ تو اب بھی آپ سے دور ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''مگر یہ تمہیں کیسے یقین ہے کہ اس نے مجھے نہیں میں نے اسے اپنے قریب کیا......اس موم کی ڈلی کو......کیا تم مجھے نہیں جانتے کیا تمہیں اپنی پہلی چار ملاقاتوں کا حشر یاد نہیں میں خرم سے بھی اسی طرح جھگڑی تھی۔ اگر تم نے میرے قریب آنے کی لیے محنت کی ہے اور پھر بھی ناکام ہوئے ہو تو خرم نے تو اس راہ پر آنے کے لیے مزدوری کی ہے...... اگر وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہ کرتا تو میرا بہت اچھا دوست ہوتا...... میں بدظن ہو گئی اور یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے تمہارے حوالے کر کے مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے ...... مجھے اندر سے زخمی کرنا چاہتا ہے...... ورنہ......''

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' عظیم منہ کھولے میرے سامنے بیٹھا تھا۔

''لیکن خرم نے مجھے بتایا وہ سب کچھ میری خاطر کر رہا ہے۔ جی چاہتا ہے جا کر اس کا گریبان پکڑ لوں......اس نے میرے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میں اس سے لڑنا چاہتا ہوں۔'' اور میں ہنس پڑی۔

''تم تو خیر کیا خرم سے لڑو گے کہ تم دونوں کو روا اندر سے ملی ہوئی ہے ایک دوسرے کی ہدایت پر ہی یہ سب کچھ کر رہے ہو...... ہاں میں خرم کے ساتھ کیسے جھگڑا کروں ...... کیا کہوں اسے جا کر کہ......''

''رہنے دیجیے مس نشاط...... میں کیسے سمجھاؤں آپ کو......وہ سب کچھ میری خاطر کرتا رہا۔''

''چلیے مان لیا......'' میں نے اسے ڈھیل دی۔
''تو آپ نے اسے اپنی محبت کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کی اجازت دے دی۔ دوستی کا یہ رنگ تو میں نے آج ہی دیکھا ہے۔'' وہ سٹپٹا گیا۔
''مجھے آپ دونوں پر اعتبار تھا۔''
''بہت خوب......'' میں نے اس کے ڈرامے کو نظر انداز کر کے کہا۔
''تو آپ کا کیا خیال تھا...... آپ نے جو اسے میرے تنہا کمرے میں بھیج دیا تھا تو وہ کوئی پیغمبر یا ولی تھا جو صرف تمہارے Cause کو Preach کرتا رہا...... مجھے تمہارے عشق کا اعتبار دلاتا رہا...... اس نے تو تمہارا ذکر تک نہیں کیا...... اس نے تو......''
''خدا کے لیے بند کرو یہ باتیں۔'' عظیم تقریباً چیخنے لگا۔
''اور سنو عظیم......'' میں نے بات جاری رکھی۔
''تم دونوں مجھے دوہرے فریب میں گھیر کر پاگل بھی نہیں بنا سکتے...... ہم چاند کی فتح کے دور میں بیٹھے ہیں مجھے اور آپ کو اپنی اہمیت معلوم ہے...... میں اتنی ارزاں بھی نہیں ہوں کہ وقت کی تازہ منڈی میں میری کوئی قیمت ہی نہ لگے اور میں پرانی منڈیوں کے باسی ڈھیروں پر پھینکی جاؤں...... وقت تمہیں سب کچھ بتا دے گا...... اگر میں اپنی ذات سے بغاوت نہ کر سکی اور خرم کے خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکی تو ساری عمر یوں بھی تو گزاری جا سکتی ہے کہ دنیا کے ہر مرد کو ٹھکراتی چلی جاؤں...... ہر مرد...... جو ذہن میں شدید طور پر Corrupt ہوتا ہے اور دل و دماغ میں Red Light Area اٹھائے پھرتا ہے۔''
''کیا کہہ رہی ہیں آپ......'' عظیم اب بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''اور ہاں اسے کہو اگر میں چاہتی کہ اس کے قریب رہوں تو یہ بات بھی میرے لیے مشکل نہیں تھی۔ مجھے اپنے اندر کے خدا اپنی ول پاور پر پورا فخر اور بھروسہ ہے۔ میں اسی طاقت کے سہارے اس کے قریب پہنچ سکتی تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی تلپٹ کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا...... میں ایسا کبھی نہیں کروں گی...... وہ میری کمزوری ضرور ہے لیکن مجھے عزیز بھی بے حد عزیز ہے...... اگر میری زندگی میں یہ پرابلم آتا بھی تو میں پریشان نہ ہوتی اس لیے کہ میں نے آج تک کسی مسئلے کو اتنی اہمیت نہیں دی...... یقین کرو عظیم...... بخدا میں تو اپنے پرابلم کو اپنے سامنے ٹیبل پر رکھ کر ان پر نظریں گاڑ کر انہیں ہوا میں Dissolve کر دیا کرتی ہوں۔ منطقی اعتبار سے ان کا اتنا کامیاب آپریشن کرتی ہوں کہ ان کا وجود باقی نہیں رہتا۔''
عظیم گم صم بیٹھا تھا اور میں کہہ رہی تھی۔
''بات یہ ہے عظیم کہ ان تمام واقعات کے دوران تم دونوں کے شدت سے عقلمند ہونے کا مان رہا ہے حالانکہ اصل میں ایسا نہیں تھا...... بات صرف اتنی سی ہے کہ خرم کو میں ملی...... اس نے مجھے عام لڑکیوں سے ہٹ کر پایا تمہیں اطلاع دی...... تمہارے ساتھ بار بار میری باتیں کیں۔ تم ذرا سا متوجہ ہوئے تب اس نے تمہیں اپنے پاس بلوایا۔ اور اب تم دونں کا یہ پروگرام تھا کہ خرم ایک محدود حد تک میرے ساتھ کھیلنے کے بعد مجھے تمہاری طرف پھینک دے گا اور اس طرح میری مجبوری کا وہ ڈرامہ ختم ہو جائے گا جس میں تم میجر رول ادا کر رہے تھے لیکن واقعات الٹ ثابت ہوئے میں وہ ثابت نہ ہوئی جو تم دونوں نے سمجھا تھا۔ تب تم میری جانب متوجہ ہو گئے خاصی سنجیدگی کے ساتھ...... اور واقعی خرم بھی مجھے تمہاری خاطر اگنور

کرنے لگا...... دراصل تم دنوں کا خیال تھا کہ مجھے کال گرل سمجھو گے یا بطور سوئٹ ڈش استعمال کرو گے۔ جب گھر کی باسی' بے ذائقہ روٹیاں کھا کر آؤ گے ابکائیاں آنے لگیں گی تو میرے پیار سے منہ کا ذائقہ بدل لو گے۔

لیکن تمہیں یاد تو ہوگا عظیم تم جب بھی اس خیال کے تحت میرے پاس آئے میں نے تمہارے دل و دماغ پر اتنے مکے برسائے کہ تمہاری چیخیں نکل گئیں اور پھر گھر جا کر تم نے مجھے جو خط لکھا اس میں تم اپنے قدموں تلے صحیح زمین لے چکے تھے...... سنبھل چکے تھے۔''

''میں تو آج بھی آپ کے بارے میں غلط نہیں سوچتا بلکہ......''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اب تم وہ نہیں جو ابتدائی ملاقاتوں میں تھے' میں تمہاری Respect کرتی ہوں دراصل تم اتنے غیر مہذب نہیں تھے جتنا میں نے تمہیں سمجھ لیا تھا۔ ایک اجنبی لڑکی کو اس حد تک آزمانا فطرت کا تقاضہ بھی ہوسکتا ہے۔''

میں تھک کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ بھی اٹھا اور اس کے بعد وہ کبھی نہیں آیا خرم جاتے وقت وہ بالکل اپنا اپنا سا لگے مجھے' جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں جیسے وہ میرا بہت قریبی عزیز ہو بھائی جیسا......اور پھر خاص طور پر اس وقت تو مجھے اور بھی اچھا لگا جب میں بے قراری سے مسلسل تمہارا ذکر کیے چلی جا رہی تھی تو وہ پوری سچائی اور کنوارپن کے ساتھ منہ پر رومال رکھے شرما رہا تھا۔ بہر حال خرم وہ مجھے آج بھی عزیز ہے اور اس لیے بھی کہ بڑا چونکا ہوا دماغ رکھتا ہے۔

اور آؤ خرم عزیز آخری بات تم بھی سن لو...... عظیم چلا گیا تو میں بستر پر پڑ گئی...... اتنی باتوں کا بوجھ بھلا میں کیسے سہار سکتی تھی۔ بخار کی شدت نے مجھے نیم جاں کر دیا...... تم اچانک بدل گئے...... یہ میں کیسے اعتبار کر لیتی تم نے مجھے پاگل کر دیا خرم لیکن آخر کیوں تم نے یہ سب کیا کہوں؟ میرے حوصلوں کا اتنی دور تک کیوں تعاقب کرنا چاہتے ہو کہ منہ کے بل گر پڑوں...... یقین کرو پچھلے پانچ دن پھر بخار کی آگ میں جلتی رہی۔

اور آج جب کئی دنوں کے شدید ذہنی اور روحانی بوجھ کے بعد بستر سے اٹھی ہوں تو لڑکھڑا گئی ہوں......اپنے آپ کو عجیب پاگل پاگل سی لگ رہی ہوں...... یوں جیسے ویت نام کی طویل جنگ جیتنے کے بعد وہاں کے لوگ فارغ ہوئے ہوں گے...... تھکے ہارے...... بیزار......لیکن میں کہاں فارغ ہوئی ہوں میں تو شکست خوردہ ہوں اور آج بھی اپنے ذہن اور ضمیر کے نقشوں پر بڑے دور سے جھکی بیٹھی ہوں...... جھنجھلا جھنجھلا کر ہر وہ راہ' ہر وہ لائن اور ہر وہ نقطہ ڈھونڈ رہی ہوں جہاں سے اپنے جذبات کی فوجوں کو پسپا کر دوں...... اپنے لطیف اور نرم احساسات اور جذبات کی ساری قوتوں پر ایک ماہر جرنیل کی طرح چھا جاؤں......دل و دماغ کے سارے نقشے پاؤں تلے اجاڑ دوں......لیکن کیا کروں خرم ہار جو گئی ہوں...... میں گزشتہ دس دنوں میں جو میرے لیے دس برسوں کے برابر تھے ہر محاذ پر پوری قوت سے لڑی ہوں اور آج مکمل طور پر Exhaust ہوئی بیٹھی ہوں...... ایک جی چاہتا ہے کہیں تم ہاتھ لگ جاؤ تو بخدا تم سے دست بدست لڑ پڑوں...... تمہیں شکست دے ڈالوں...... پر کیسے کروں گی یہ......تم جو فاتح ہو اور میں جو عورت ہوں...... کمزور...... نحیف' ناتواں اور پھر عورت جو جذباتی محاذ پر شکست کھا جائے تو باقی کچھ بھی نہیں بچتی۔

☐☐......❀......☐☐

دوشیزہ گلستان

ترتیب: ارم حمید

فرمان الٰہی

کتنی ہی بستیاں (ایسی) ہیں جنہیں ہم نے تباہ کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت پہنچا یا دن دہاڑے (ایسے وقت آیا) جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔

اور جس وقت ان پر ہمارا عذاب آ گیا تو اُس وقت ان کے منہ سے اس کے سوا کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم (اور خطاوار) تھے۔
(الاعراف:5-4)

تین عنایات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر تین عنایات ایسی کی ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتیں تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا۔

پہلی یہ کہ گندم، اناج میں کیڑے پیدا کر دیے، ورنہ انسان اسے سونے چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتا اور لوگ بھوکے مر جاتے۔

دوسری یہ کہ موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کر دی، ورنہ کوئی انسان اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

تیسری عنایت یہ کہ مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر دیا ورنہ ان کی زندگی کبھی خوشگوار نہ ہوتی۔

''......تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

مرسلہ: راحت عمیر۔ خوشاب

شیطان کی کوٹھری

مرزا غالب رمضان کے مہینے میں دہلی کے ایک محلہ قاسم جان کی ایک کوٹھری میں بیٹھے پچیسی کھیل رہے تھے۔ میرٹھ سے ان کے شاگرد مفتی شیفتہ بھی دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ مرزا صاحب سے ملنے قاسم جان آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ رمضان کے متبرک مہینے میں مرزا پچیسی کھیل رہے ہیں تو انہوں نے اعتراض کیا۔ ''مرزا صاحب! ہم نے سنا ہے کہ رمضان میں شیطان بند کر دیا جاتا ہے۔''

اس پر مرزا غالب نے جواب دیا۔ ''مفتی صاحب! آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ شیطان جہاں قید کیا جاتا ہے وہ کوٹھری یہی ہے۔''

مرسلہ: نصرت آراء۔ جیکب آباد

FUTURE

(سال 1980ء)

☆ ''یار! یہ لائٹ کب جاتی ہے؟''

✿ ''پتا نہیں۔'' ''شاید سال میں ایک بار۔''

(سال 1990ء)

☆ ''یار! یہ لائٹ کیوں جاتی ہے؟''

✿ ''شاید ٹرانسفارمر بدلنے ہیں۔''

(سال 2011ء)

☆ ''یار! یہ لائٹ کب آئے گی؟''

✥ "جب ہمارے علاقے کی جائے گی، تب تمہارے علاقے کی آئے گی۔"

(سال 2014ء)

☆ "یار! یہ لائٹ آئے گی آج؟"

✥ "نہیں! آج لاہور میں ہے، کراچی کی باری کل آئے گی۔"

(سال 2020ء)

☆ "سنا ہے کہ پرانے وقتوں میں لائٹ ہوا کرتی تھی۔"

✥ "سو جا! لائٹ وائٹ کچھ نہیں ہوتی، سب تیرا وہم ہے۔"

مرسلہ: حمنہ دانش۔ کراچی

اہلِ دانش کی باتیں

☆ غافل کی دنیا طلبی جاہل کے ترک دنیا سے بہتر ہے۔ (یحییٰ بن معاذ رازیؒ)

☆ توبہ کے بعد ایک گناہ بدتر ہے بہ نسبت ستر گناہوں کے جو توبہ سے پہلے کیے گئے ہوں۔ (رازیؒ)

☆ عالم جہل کو جہالت سمجھتا ہے اور جاہل علم کو۔ (حضرت امام شافعیؒ)

☆ تم غلام ہو اس شخص کے سامنے جس سے تم محبت کرتے ہو اس لیے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ (خلیل جبران)

☆ خاموشی اظہار نفرت کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ تمہاری شادمانی دراصل تمہارا غم ہے جسے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ پڑھا لکھا بے وقوف اپنی حماقت کو خوش نما الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے لیکن پھر بھی وہ بے وقوف ہی رہتا ہے۔ (فرینکلن)

☆ ہر مذہب اچھائی کی تعلیم دیتا ہے۔ خرابی تو ہمارے اپنے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ (فرینکلن)

ارسال کردہ۔ شمائلہ نوید، کراچی۔

غزل

گم ستاروں کی لڑی ہے
رات ویران پڑی ہے
آگ جب دن کو دکھائی
راکھ سورج سے جھڑی ہے
غیب ہے دل سے زیادہ
دید آنکھوں سے بڑی ہے
گر نہ جائے کہیں آواز
خامشی ساتھ کھڑی ہے
لفظ گونگوں نے بنایا
آنکھ اندھوں نے گھڑی ہے
رائی کا دانہ یہ دنیا
کوہ ساری پہ اڑی ہے
وقت کے پاؤں میں کب سے
پھانس کی طرح گڑی ہے

شاعر۔ احمد جاوید

انتخاب۔ روزی خان، حیدر آباد۔

آنسو

آنسو کیا ہے؟ یہ صرف ایک چھوٹا سا قطرہ ہوتا ہے یہ اس وقت بہتے ہیں جب اپنوں کے لگائے ہوئے زخم اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ وقت کا مرہم بھی ان پر کارگر ثابت نہیں ہوتا تو ان زخموں کی ٹیس آنسو کی صورت اختیار کر کے بہہ نکلتی ہے لیکن نادان لوگ درد دل سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ان کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہوتے ہیں وہ ان کو صرف پانی کے نمکین قطرے خیال کرتے ہیں کاش، ان کو کوئی

بتائے کہ ان کی اہمیت کیا ہے۔

مرسلہ: عمر حیات۔ پشاور

عورت کب روتی ہے؟

سادہ لوح مرد یہ سمجھتا ہے کہ عورت اُس وقت روتی ہے جب وہ مایوس یا رنجیدہ ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ عورت اُس وقت بھی روتی ہے جب وہ حد سے زیادہ خوش ہوتی ہے۔ اُس وقت بھی روتی ہے جب اسے غصہ آتا ہے۔ بعض اوقات رونے کی وجہ اُسے خود بھی معلوم نہیں ہوتی لیکن وہ یہ توقع رکھتی ہے کہ مرد کو اس کی وجہ ضرور معلوم ہونی چاہیے۔

کرتی ہوں بے دریغ انہیں خرچ اس لیے
لائی تھی اپنے ساتھ یہ آنسو جہیز میں

نشاط بانو، جہلم

پرستار

ادب کی شیدائی ایک امریکی خاتون برطانیہ کی سیر کے لیے گئی تو وہ خصوصی فرمائش کر کے ولیم شیکسپیئر کی جائے پیدائش ''اسٹریٹ فورڈ آن ایوان'' بھی دیکھنے گئی۔ اس مقام کو دیکھ کر وہ فرطِ عقیدت سے آبدیدہ ہوگئی اور بولی۔ ''آج میری برسوں پرانی آرزو پوری ہوگئی۔''

واپسی کے لیے ٹرین پکڑنے کی غرض سے جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، تب بھی اس کی عقیدت کی کیفیت کافی حد تک برقرار تھی۔ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ فرطِ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں اپنی ساتھی سے مخاطب ہوئی۔ ''اور ذرا سوچو...... آج ہم اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں، جہاں سے ولیم شیکسپیئر بھی شہر جانے کے لیے ٹرین پکڑتا ہوگا۔''

آمنہ بی بی، لاہور

سیلف کنٹرول

ایک شوہر اپنی شوگر کی مریضہ بیوی سے بولا۔ ''سیلف کنٹرول تو کوئی تم سے سیکھے۔''

بیوی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

شوہر: ''جسم میں اتنی شوگر ہے مگر مجال ہے زبان پر ذرا بھی آتی ہو۔''

صائمہ علی۔ اٹک

بہترین مشغلہ

پڑوسی کے بچوں کی بھوک اور فاقے سے انجان رہنا اور اُس کی بیوی اور بیٹی کی حرکتوں سے واقف رہنا ہمارے معاشرے کا بہترین مشغلہ ہے۔

ہما نعمان۔ کراچی

اُف یہ معصومیت

جو حضرات یہ مانتے ہیں کہ خوشیاں پیسوں سے نہیں خریدی جاسکتیں وہ برائے مہربانی اپنے پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیں، شکریہ۔

طیب شاہ۔ سکھر

سوا سیر

ایک چھوٹی سڑک پر دو کاریں آمنے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ دونوں میں سے کسی کا بھی ڈرائیور پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ڈرائیور نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا پیچھے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں، اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر دوسرے ڈرائیور نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا۔ ''اگر معمے والا صفحہ نہیں پڑھ رہے ہو تو وہ مجھے دے دو تا کہ میں اتنی دیر میں معمہ حل کرلوں۔''

شاہد مغل، کامونکے

رشتے

کچھ رشتے استوار کرنے میں انسان کتنی جدوجہد کرتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملا کر مالا تیار کرتا

ہے لیکن توڑنے والا ایک پل میں سب کچھ توڑ دیتا ہے۔ چاہے وہ دل ہو یا کوئی موتیوں کی مالا......؟

وہ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتا کہ یہ شخص کتنی مسافتوں کے بعد اس مقام تک پہنچا ہوگا اور اس نے اس عرصے میں کیا کچھ قربان کیا ہوگا؟

شانزے خان، پشین

معافی

بہت سے لوگوں نے میری زندگی کو بہت سی آزمائشوں سے دوچار کیا لیکن اُن کے گزر جانے کے بعد میں نے انہیں معاف کردیا۔ آزمائشیں تو امتحان تھیں آئیں اور گزر گئیں۔ مگر سزا اور جزا امر ہے۔ وہ نہیں ٹلتیں اور یہ سوچ کر کہ کسی کو میری وجہ سے نہ ختم ہونے والے عذاب سے گزرنا پڑے گا میری روح کانپ جاتی ہے کیونکہ معافی مجھے بھی بہت سے لوگوں سے چاہیے۔ معاف کردیں تاکہ معاف کیے جاسکیں۔

فرحین، افشاں۔ سرگودھا

ایک نظم

پھول ستاروں سے
جب ہر منظر خالی ہوگا
چاند اکیلا کیا چمکے گا
دھرتی
اپنا آنچل پھیلائے
کس کی راہ تکے گی
کون ہمارے خوابوں کو
مہکائے گا
کون ہمارے سارے دکھ
جھولی میں بھر کر
لے جائے گا

شاعر: احمد رئیس

غزل

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں، لہو میں کتنی لالی تھی
پر یوں نہ ہوا دھارے میں اَن دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت، کچھ بے پرکی پتواریں تھیں
پر یوں نہ ہوا کہ روگ کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے
ویران کی ٹوہ کو پا نہ سکے اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو، اب جو چاہو دوش دھرو
اب تم ہی بتاؤ، کیا کرنا ہے، اب کیسے پار اترنا ہے؟

شاعر۔ فیض احمد فیض

انتخاب۔ صبا مہک، کراچی

غزل

پہلے تو کسی کو رلایا نہیں کرتے
ہاں، خود سے خفا ہو تو منایا نہیں کرتے
اک بار گرا دیں جسے ہم اپنی نظر سے
اس شخص کو پھر دل میں بٹھایا نہیں کرتے
بولے جو محبت سے تو سوچیں گے کبھی نا
نفرت سے مگر ہاتھ ملایا نہیں کرتے
اس شخص سے مل کر مجھے احساس ہوا ہے
جو پیڑ بڑے ہوتے ہیں، سایہ نہیں کرتے
رکھتے ہیں انہیں ہم سدا سینے سے لگا کر
دکھ اپنا کسی کو بھی سنایا نہیں کرتے
یہ کھیل محبت کا ہے پھر سوچ لو ارشد
کھو دیتے ہیں سب کچھ یہاں، پایا نہیں کرتے

کلام شاعر۔ ارشد ملک

حسن انتخاب۔ عاصمہ لطیف، فیصل آباد۔

راج نیتی

دنیا میں صرف وہ قوم راج کرتی ہے۔
جو دلیل سے قائل ہو جاتی ہے۔
جو عذر کو قبول کر لیتی ہو۔
جو اختلافِ رائے کو محفل کا حُسن گردانتی ہو۔
جو تحقیق کی مداح ہو۔

جو تجربے کو ہمدم وہم نشین رکھتی ہو۔
جو سر پہ عزّتِ نفس کا کلّہ باندھتی ہو۔
جو کوشش کے جوتے پاؤں سے لپٹائے رکھتی ہو۔
جو قانون کو زیور کی طرح عزیز رکھتی ہو۔
جو مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتی ہو۔
جو ہر دفاع کو سوچنے اور ہر ہاتھ کو مثبت کام کرنے کی آزادی دیتی ہو۔
جو جید لوگوں کو حکمران رکھتی ہو۔

افشین شاہ۔حیدر آباد

قیمت

گاہک: ''اس ٹائی کی کیا قیمت ہے؟''
دکاندار: ''چالیس روپے۔''
گاہک: ''ارے بھائی اتنے میں تو جوتے کا جوڑا آجاتا ہے۔''
دکاندار: ''مگر جناب آپ جوتے گلے میں تو نہیں باندھ سکتے۔''

وہاب۔کھاریاں

جاسوسی

بیوی نے چپکے سے شوہر کا سیل فون اٹھایا پاس ورڈ لگا کر فون بک چیک کرنا شروع کی تو دیکھا۔ لڑکیوں کے نمبر مختلف ناموں سے محفوظ ہیں۔ جیسے پڑوسن کی بچی، نئی بچی، پرانی بچی، سامنے والی بچی، کالج والی بچی، پاگل کی بچی اور اس کے آگے بیوی کا نمبر محفوظ تھا۔

نجم شیراز۔شاہدرہ

تلاش

مجھے زندگی پر قدم قدم پر، تیری رضا کی تلاش ہے
تیرے عشق میں اے میرے اللہ مجھے انتہا کی تلاش ہے
میں گناہوں میں ہوں ڈوبا ہوا، میں زمین پر ہوں گرا ہوا
جو ماہوں سے نجات دے مجھے اس دعا کی تلاش ہے
میں نے جو کیا وہ برا کیا، میں نے خود کو خود ہی تباہ کیا
جو تجھے پسند ہوا اے میرے اللہ، مجھے اس ادا کی تلاش ہے
(آمین ثم آمین)

رضوانہ سعید۔اسلام آباد

لاجواب

زینب نے شبانہ سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیا سوچ کر ان صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے وہ تو تمہارے مقابلے میں بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے منہ میں دانت تک نہیں اور وہ گنجے ہیں۔''
''یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں۔'' شبانہ نے بے پروائی سے کہا۔
''وہ تو پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی تھے۔''

آئمہ بیگ۔کشمور

مقدمہ

سوچتا ہوں کچھ دوستوں پر مقدمہ ہی کر دوں
اس بہانے ہر تاریخ پر ان سے ملاقات تو ہوگی

تابش علی۔سیالکوٹ

مثالی انسان

مثالی انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ مروت اور احسان کا سلوک روا رکھے، اپنے پاس سے کچھ دینے میں راحت اور دوسروں سے کچھ لینے میں عار محسوس کرے فطرات میں خوامخواہ نہ اُلجھے مگر وقت پڑنے پر جان کی بازی لگادے۔

میمونہ حسن۔شاہدرہ

سچی کہانیاں ملنے میں اگر دشواری ہے تو ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

کراچی ایجنٹ	0300-2680248	
لاہور ایجنٹ	042-37249813	0300-4009578
راولپنڈی	051-5765665	0345-5058891
ملتان	061-4586533	0300-6301461
حیدرآباد	022-2780128	0321-3060477
پشاور	091-2212515	0344-9290185
فیصل آباد	0300-6698022	041-8503629
نواب شاہ	0244-362138	0344-3445464
الفتح نیوز ایجنسی، سکھر	0300-9313528	071-5613548

نمائندہ خصوصی

جاوید راہی	0300-9479844	اوکاڑہ
ارشد اقبال چوہان	0300-9657926	فیصل آباد/جڑانوالہ
عبدالغفار عابد	0300-4319264	چیچہ وطنی/ساہیوال
مور شاہد	0301-2868143	قمبر/شہداد کوٹ
مجید احمد جائی	0301-7472712	ملتان

سخن زار

میری سمت آ کبھی لوٹ کر

میری سمت آ کبھی لوٹ کر
کہ میں اب تلک ہوں منتظر
بچھڑ کے تجھ سے میرے سامنے
کوئی راستہ ہی نہیں رہا
کوئی واسطہ ہی نہیں رہا
وہ جو پھول تھے سرِ شاخِ برگ انہیں کیا ہوا؟
تیرے ہجر میں کھلی ساعتیں
تیرے وصل کی وہ راحتیں
کدھر گئیں؟
انہی تتلیوں کا پتہ ہے کچھ، جو پھول چوم کے اڑ گئیں
میرا سانحہ کبھی سوچ تُو
تیرے غم سے کوئی فائدہ
دل بے ثمر نہ اٹھا سکا
کہ وفا کا ایسا شجر ہوں میں
جسے آج تک کوئی راہ رو، نہ ہٹا سکا، نہ جلا سکا
میرے چارہ گر میرے ہم نفس
وہ جو ساعتیں تھی وصال کی، کہاں گئیں
وہ جو راحتیں تھیں کمال کی، وہ کہاں گئیں
میرے پیار کا تجھے واسطہ
کسی شام آ کے مجھے تھام لے
بڑے پیار سے میرا نام لے
کبھی پانیوں کے سکوت پر
میرے ساتھ چل کہیں دور تک
(کسی شاخ ہی سے لپٹ کبھی)
کوئی پل تو مجھ پر نثار کر
مجھے اپنے دل میں اتار کر
میرے وصلِ جاں مجھے پیار کر
مجھے یاد آ...... مجھے یاد آ
میری سمت آ کبھی لوٹ کر

صفیہ سلطانہ مغل

غزل

گرچہ اُٹھائے جیون میں نقصان بہت
کر نہیں پائے لوگوں کی پہچان بہت
اپنے دل کو اپنی حفاظت میں رکھنا
پیار میں بھرنا پڑتا ہے تاوان بہت
جو ہوتے ہیں ہمت والے اُن کے لیے
مشکل رستہ ہوتا ہے آسان بہت
جس میں ہم سب بیٹھ کے باتیں کرتے تھے
یاد آتا ہے اُس گھر کا دالان بہت
کچھ انجان بھی اپنوں جیسے لگتے ہیں
کچھ اپنے بھی ہوتے ہیں انجان بہت
سعدیہ جس کو چھوڑ آئی ہوں برسوں سے
اُس گھر میں تھا یادوں کا سامان بہت

سعدیہ سیٹھی

سخن زار

غزل

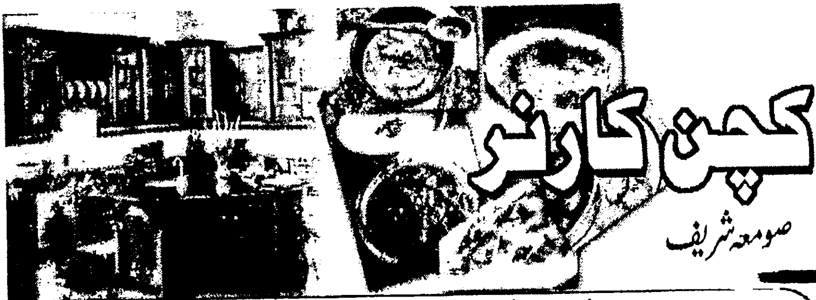
ہوا بجھا گئی ' روشن کوئی دیا ہی نہیں
محبتوں کے مسافر ' تجھے پتا ہی نہیں
ہوا تھی تیز چراغِ نفس جلا ہی نہیں
مریض غم کسی تدبیر سے جیا ہی نہیں
مخالفت کے ہزاروں اُبل پڑے طوفاں
مرا سفینہ کنارے کبھی لگا ہی نہیں
یہ اور بات کہ آباد ہوگئیں آنکھیں
کبھی مگر دل برباد تو بسا ہی نہیں
ہمارے سامنے بیچی گئی چمن کی بہار
ہم احتساب کریں اس کا حوصلہ ہی نہیں
جو جلوتوں میں مسخر دلوں کو کرتی تھی
عروس وقت کی آنکھوں میں وہ حیا ہی نہیں
امیر شہر اگر کرتا اپنا فرض ادا
غریب شہر کبھی بھیک مانگتا ہی نہیں
وہ دل رُبا نہ اُلٹتا اگر بساطِ وفا
میں دل کی جیتی ہوئی بازی ہارتا ہی نہیں
ابھی تو دستِ زلیخا کے نقش باقی ہیں
کہ پھٹ گیا تھا جو دامن ابھی سیا ہی نہیں
قلم ہی چھین لیا ہاتھ سے ستم گر نے
تو مجھ سے کیسی شکایت کہ کچھ لکھا ہی نہیں
مزاجِ وقت ' جفا ہے مگر نہ کھاؤ شکست
اٹھاؤ تیغ ' کہ اِس کے سوا بقا ہی نہیں
مرے عظیم وطن تیری عظمتوں کے نثار
کوئی غریب دریدہ قبا رہا ہی نہیں
گلِ سخن سے معطر کروں جو محفل کو
شمیم تیری طرح میں غزل سرا ہی نہیں

شمیم حسنین

غزل

سائے کے پیچھے بھاگنے کا فائدہ بھی کیا
راتوں کو اٹھ کے جاگنے کا فائدہ بھی کیا
ہستی کو آپ کی جو سمجھے نہ معتبر
نزدیک اس کو لانے کا فائدہ بھی کیا
جو موتیوں کی قدر سے واقف نہ ہو کبھی
اس کی خاطر رونے کا فائدہ بھی کیا
منہ پھیر لے جو دیکھ کے مشکل میں آپ کو
اس کو آزمانے کا فائدہ بھی کیا
جب راز داں غم کا مداوا نہ کرسکے
تو راز دل سنانے کا فائدہ بھی کیا
اس کا تو ٹوٹ کے مجھے چاہنا عزیز تھا
اب غیروں کے جیسے ملنے کا فائدہ بھی کیا
جو راستے میں اجنبی بن کے ملے کبھی
اس سے قرار مانگنے کا فائدہ بھی کیا
عکس جس کا ثبت ہو دل کی زمین پر
اس کو بھول جانے کا فائدہ بھی کیا

شگفتہ شفیق



کچن کارنر

صومعہ شریف

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

ملتانی قورمہ

اجزاء:۔

گوشت (چکن، مٹن، بیف)	: ایک گوشت کلو
سرکہ	: دوکپ
لہسن	: دوکپ (چائے کے)
پیاز	: ایک پاؤ
دھنیا پاؤڈر	: دوچائے کے چمچ
ہلدی	: ایک چائے کا چمچ
ادرک	: دوچائے کے چمچ
گرم مسالا	: ایک چائے کا چمچ
تیل یا گھی	: تین یا چار کپ
ٹماٹر (پسا ہوا)	: ایک کپ
لال مرچ پاؤڈر	: دوچائے کے چمچ
زیرہ پاؤڈر	: ایک چائے کا چمچ
نمک	: حسب ذائقہ

ترکیب: لہسن، پیاز اور گوشت سرکہ میں ڈال کر ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ پھر اس میں سے سرکہ نکال دیں اور گوشت میں ادرک، دھنیا، مرچ، ہلدی، نمک اور ایک کپ پانی ڈالیں اور دھیمی آنچ پر پکائیں پھر ٹماٹو پیوری ڈالیں اور مزید پکائیں جب بھُن جائے تو گرم مسالا چھڑک کر چولہا بند کردیں، گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

مٹن مسالے ریشے دار

اجزاء:۔

مٹن	: آدھا کلو
ادرک	: ایک کھانے کا چمچ
لہسن	: ایک کھانے کا چمچ
نمک	: حسب ذائقہ
پیاز	: چار عدد
لال مرچ	: ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا	: ایک چائے کا چمچ
دہی	: آدھی پیالی
تیل	: ایک پیالی
ہرا دھنیا	: ایک گٹھی
ہری مرچ	: دوعدد

ترکیب: مٹن کو دھو کر خوب اچھی طرح صاف کرلیں اور پانی ڈال کر ابال لیں۔ جب اچھی طرح ابل جائے تو گوشت کے ریشے بنالیں بالکل اس طرح کہ باریک باریک سویاں لگیں۔ پھر ایک دیگچی میں تیل گرم کریں

اور دو عدد پیاز ڈال دیں جب پیاز پیازی رنگ کی ہو جائے یعنی نہ تو سرخ ہوئی ہو نہ اپنی اصل رنگت تبدیل کرے۔ اب جلدی سے اس میں گوشت کے ابلے ہوئے ریشے شامل کر دیں۔ پھر اس کے اندر ادرک، لہسن، گرم مسالا، نمک ڈال کر بھون لیں، تھوڑی دیر کے بعد اس میں دہی شامل کر دیں اور خوب بھونتے رہیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو آنچ دھیمی کر دیں۔ ایک چھوٹے سے فرائی پین میں باقی کی پیاز کو سرخی مائل براؤن کر کے نکال لیں۔ تیل خشک ہونے پر چورا کر لیں اور پھر اس کو ایک ڈش میں نکال کر اوپر سے پیاز کا چورا، گرم مسالہ اور لیموں کا رس چھڑک دیں۔ روٹی اور نان کے ساتھ تناول فرمائیں۔

سوئٹ اینڈ سار بیف ودِ اسپیگٹیز

اجزاء:۔

اسپیگٹیز	:	دو پیکٹ
بیف	:	آدھا کلو (چوکور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنوالیں)
انڈے	:	دو عدد
ہری پیاز	:	تین عدد
کارن فلور	:	دو چائے کے چمچ
لہسن	:	تین جوئے
انناس	:	ایک کلو کا ایک ڈبہ
لال اور سبز شملہ مرچ	:	ایک ایک عدد
نمک	:	ایک چائے کا چمچ

ترکیب: بیف کے ٹکڑوں کو دھو کر نمک لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر انڈے میں ڈبو کر اور کارن فلور میں مکس کر کے ڈیپ فرائی کریں (تازہ گوشت گل جائے گا ورنہ دھیمی آنچ پر گلا کر ڈیپ فرائی کریں)۔ شملہ مرچ اور ہری پیاز کو بھی چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ ایک فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے پیاز، لہسن اور ہری مرچیں فرائی کریں پھر انناس کے ٹکڑے بھی اس میں شامل کر کے تھوڑا سا بھون لیں۔ کھٹی میٹھی چٹنی کے اجزاء ایک پیالے میں گھول کر شملہ مرچوں والے پین میں ڈال کر پکائیں اور آمیزہ گاڑھا ہونے پر اس میں فرائی گوشت بھی شامل کر دیں اور مزید پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم دیں۔

کھٹی میٹھی چٹنی کے اجزاء یہ ہیں:۔

ٹماٹو کیچپ	:	ایک کپ
سرکہ	:	آدھا کپ
کارن فلور	:	دو کھانے کے چمچ
چینی	:	آدھا کپ
سویا ساس	:	دو کھانے کے چمچ
نمک	:	آدھا چائے کا چمچ

(ان سب اجزاء کو ملا کر پکا کر گاڑھا کر لیں اور کھٹی میٹھی (سوئیٹ اینڈ سار) چٹنی کے طور پر استعمال کریں)۔

اسپیگٹیز کی تیاری:۔

ایک بڑی دیگچی میں پانی اُبال لیں پھر اُس میں اسپیگٹیز توڑ کر ڈالیں اور چٹکی بھر نمک مع دو چائے کے چمچ تیل بھی ڈال دیں تاکہ اسپیگٹیز چپکیں نہیں اور چمکدار بھی رہیں۔ جیسے ہی اسپیگٹیز ہو جائیں ان کا گرم پانی پھینک دیں۔ اب ایک سرونگ پلیٹ، پلیٹر میں پہلے اسپیگٹیز کو پھیلا کر رکھیں پھر اس پر سوئیٹ اینڈ سار یا کھٹا میٹھا بیف ڈالیں اور تھوڑی سی کھٹی میٹھی چٹنی بھی ڈال کر گرم گرم سرو کریں۔

پائن ایپل رائس

اجزاء

اُبلے ہوئے چاول	:	آدھا کلو
کٹا ہوا لہسن	:	پون چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی ادرک	:	پون چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی ہری پیاز	:	ایک کپ

نمک : حسبِ ذائقہ
پسی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
کُٹی ہوئی لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس : دو کھانے کے چمچے
سرکہ : ایک چائے کا چمچہ
کٹا ہوا پائن ایپل : ایک کپ
پائن ایپل سیرپ : آدھا کپ
تیل : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: چاولوں میں سرکہ ڈال کر اُبال لیں، گلنے کے بعد اچھی طرح ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ ایک ساس پین میں تیل گرم کریں۔ کٹا ہوا لہسن، ادرک ڈالیں اور ہلکا سا تلنے کے بعد ہری پیاز، چاول، نمک اور کالی مرچیں ڈال کر ملائیں پھر سویا ساس، پائن ایپل جوس اور پائن ایپل کے سلائس ڈال کر اچھی طرح ملانے کے بعد ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

سویوں کے لڈو

اجزاء
کھویا : تین سو گرام
شکر : ڈھائی سو گرام
سویاں : سو گرام
کاجو : سو گرام (توڑ لیں)
الائچی : دو سے تین عدد (پسی ہوئی)
گھی : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: ہلکی آنچ پر کڑاہی میں گھی گرم کریں۔ سویوں کو مناسب انداز میں توڑ لیں اور گھی میں ڈال کر لال کریں۔ بعد میں اسے کسی چیز سے نکال کر الگ کر لیں، اسی گھی میں کھویا ڈال کر اچھی طرح بھون لیں پھر اس میں کاجو شامل کر لیں۔ آخر میں چینی ملا کر اچھی طرح ہلائیں۔ اب اس مکسچر میں الگ رکھی ہوئی سویاں اور الائچی پاؤڈر بھی شامل کر لیں۔ کچھ دیر بعد آنچ سے اُتار لیں۔ جب یہ آمیزہ اس حد تک ٹھنڈا ہو جائے کہ ہاتھ لگانا ممکن نہ ہو تو اس مکسچر کے لڈو بنا لیں اور ٹرے میں رکھتی جائیں آخر میں اوپر سے باریک کٹے ہوئے بادام اور کھوپرا چھڑک دیں۔ مزیدار سویوں کے لڈو تیار ہیں۔

کھجور کا حلوہ

اجزاء
کھجور : آدھا کلو
کھویا : ایک پاؤ
بادام : پچاس گرام
پستہ : پچاس گرام
سوجی : آدھی پیالی
چینی : آدھا پیالی
شہد : تین کھانے کے چمچے
کیوڑہ : دو کھانے کے چمچے
گھی : آدھی پیالی اور تین کھانے کے چمچے

ترکیب: کھجور کی گٹھلی نکال کر اس کا پیسٹ بنا لیں۔ ایک کڑھائی میں آدھی پیالی گھی کو گرم کر کے اس میں کھجور کا پیسٹ شامل کریں اور کچھ دیر پکائیں پھر چولہا بند کر دیں۔ ایک فرائنگ پین میں تین کھانے کے چمچے گھی ڈال کر اس میں سوجی شامل کر کے رنگ تبدیل ہونے اور خوشبو آنے تک بھونیں۔ کھجور والی کڑھائی میں بھُنی ہوئی سوجی اور کیوڑہ اور چینی شامل کر کے اسے بھونیں۔ چند منٹ تک مسلسل بھوننے کے بعد شہد شامل کر کے مزید ۔ دیں۔ اس میں آدھی پیالی پانی شامل کر کے پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو بادام اور پستے کوٹ کر حلوے میں شامل کر کے چلائیں۔ کھویا ڈال کر مزید آدھی پیالی پانی ڈال کر پکائیں۔ جب حلوہ کڑاہی کو چھوڑنے لگے تو اُتار لیں، کھوئے اور بادام پستے سے سجا کر گرما گرم پیش کریں۔

□□......❁......□□

شوبز خبر نامہ

شوبز سے جڑی مزے دار خبریں......

ثمینہ روزی

چاند

ڈراموں کا انسانی زندگیوں پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے اس بات کا اندازہ علیزے شاہ کے ڈرامے میرا دل میرا دشمن سے ہوا جس کے بعد علیزے شاہ اور نعمان سمیع بھی ایک دوسرے سے حقیقی زندگی میں دور ہوگئے۔ یہ جوڑی شوبز انڈسٹری میں ایک ساتھ آئی تھی مگر اب دونوں کی پرواز الگ الگ ہوگئی ہے۔

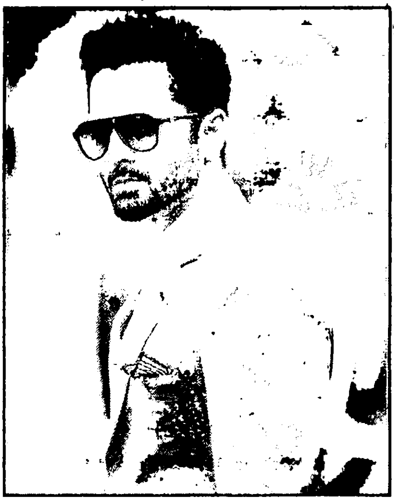


میرا دل میرا دشمن امید کے برخلاف کافی بور ڈرامہ ثابت ہوا اور علیزے شاہ کی اداکاری نے اس بوریت میں 4 چاند لگادیے۔ پتہ نہیں یہ بات کاسٹ کرنے والوں کو کب سمجھ آئے گی کہ ضروری نہیں کہ چاند چہرے ہر دفعہ ہی کوئی نیا چاند چڑھا سکیں۔

بس بھئی بس

دانش تیمور کو ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اب کچھ دنوں کے لیے ٹی وی سے دور ہو جائیں اس کی بڑی وجہ ان کی اداکاری میں یکسانیت ہے۔ جواب دیکھنے والوں کو شدید بور کررہی ہے۔ وہ ہر ڈرامے

میں 'اینگری ینگ مین' کے روپ میں آجاتے ہیں جو لڑکیاں اغواء کررہا ہے یا انہیں دھمکا رہا ہے۔ آج کل ان کا ایک ڈرامہ جیو ٹی وی پر دکھایا جارہا ہے 'مہر پوش' کے نام سے اس میں بھی وہ صرف خاتون کے پیچھے دیوانے نظر آتے ہیں۔ دانش تیمور آپ کو مشورہ ہے کہ دنیا میں عورت' عشق اور پاگل پن کے علاوہ



بھی بہت کچھ ہے۔ ڈرامے سائن کرتے وقت اسکرپٹ پر نظر ضرور ڈال لیا کریں۔ ورنہ آپ اداکاری میں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں آپ کا گیم شو ہے یعنی زمین پر......

بولڈ اینڈ......

حبا بخاری بہت ذہین اداکارہ ہیں بیک وقت کئی ڈراموں میں نظر بھی آتی ہیں مگر حبا آپ اب رونے دھونے والے رول کرنا چھوڑ دیں' دیوانگی اور تڑپ جیسے ڈراموں میں آپ کو روتا دیکھ کر اب دل اوب گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ چیونٹی بھی پاؤں کے نیچے آئے تو کاٹتی ہے تو پھر ایک انسان اس قدر مظلوم' مجبور اور مسکین کیسے ہوسکتا ہے اور ڈرامہ تڑپ میں تو آپ نے حد ہی کردی سخت گیر پولیس والے بہن



ہوکر بھی اس کی اجازت کے بنا بلکہ جھوٹ بول کر پبلشر کے دفتر آتی جاتی رہیں اور بالآخر اغوا بھی ہوگئیں۔ ایک ڈرا سہا شخص اتنا بولڈ اور جھوٹا بیک وقت کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ ضرور بتایئے گا۔

مبارک باد

جاوید شیخ کی صاحبزادی اور اداکارہ مومل شیخ خیر سے بیٹی کی ماں بن گئیں اس سے پہلے ان کا



ایک بیٹا تھا اور اب 20 اگست کو علیبہ نادر نواز دنیا میں آگئیں ماں بیٹی دونوں خیریت سے ہیں اور بہت خوش بھی......

Copy Kat

ماڈل آمنہ الیاس اور کاپی کیٹ پروڈکشن کے داور محمود رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے سادہ سی تقریب میں اس جوڑے نے ایک دوسرے کو قبول



کیا یہ الگ بات ہے کہ دونوں ہی اپنے تعلق کے حوالے سے باتوں کی تردید کرتے رہے مگر عامر لیاقت کے گیم شو میں بطور مہمان مدعو آمنہ الیاس اس تعلق اور پھر جلد رشتے میں بندھنے کی جانب اشارہ کر چکی تھیں۔ جلد ہم آمنہ الیاس کو ثنا مراد (ان کہی) کے روپ میں دیکھیں گے۔ 1982ء میں حسینہ معین کے لکھے اس شاہکار ڈرامے نے تہلکہ مچا دیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کہی' تنہائیاں اور دھوپ کنارے جیسے ڈرامے پھر کبھی نہ بن سکے۔ نہ شاید بن سکیں۔

ٹی وی سے تنگ ہیں اگر......

ناپا کے زیر اہتمام پیش کیا جانے والا ڈرامہ جس میں کم عمری کی شادی اور اس سے جڑے نقصانات کی نشاندہی کی گئی ہے کو لوگوں نے بہت سراہا۔ سلمان شاہد کا لکھا ہوا یہ ڈرامہ 12 سالہ سکینہ کے گرد گھومتا ہے جس کی بوڑھے پیسے والے آدمی سے زبردستی شادی کردی گئی اور وہ پھر گھر سے بھاگنے پر مجبور ہوگئی۔ اسکرپٹ بے حد جاندار ہے اور اداکاروں کی اداکاری بھی لاجواب' ٹی وی پر پیش کئے جانے والے فضول ڈراموں سے اکتائے ہوئے لوگوں کے لیے ناپا سے پیش کیا جانے والا یہ ڈرامہ خوشی کی خبر ہے۔

□□......❀......□□

